"تا خلافت کی بنا ٗ دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر"

قیام خلافت کا نقیب

ہفت روزہ — لاہور

ندائے خلافت

جلد 16 — 8 تا 14 اگست 2007ء — 23 تا 29 رجب المرجب 1428ھ — شمارہ 30

بانی: اقتدار احمد مرحوم
مدیر مسئول: حافظ عاکف سعید
مدیر اشاعت خصوصی: سید قاسم محمود
نائب مدیر: محبوب الحق عاجز

مجلس ادارت
سید قاسم محمود۔ ایوب بیگ مرزا
سردار اعوان۔ محمد یونس جنجوعہ
نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعدؔ طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:
67-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔54000
فون: 6366638 - 6316638 فیکس: 6271241
E-Mail:markaz@tanzeem.org
مقام اشاعت: 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔54700
فون: 5869501-03

قیمت خصوصی شمارہ 60 روپے

سالانہ زرِ تعاون
اندرونِ ملک...... 250 روپے
بیرونِ پاکستان
انڈیا ------------ (2000 روپے)
یورپ، ایشیا، افریقہ وغیرہ (2500 روپے)
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ (3000 روپے)
ڈرافٹ، منی آرڈر یا پے آرڈر
"مکتبہ خدام القرآن" کے عنوان سے ارسال کریں
چیک قبول نہیں کیے جاتے

ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے
سے پورے طور پر متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ
ایوب بیگ مرزا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استحکامِ پاکستان!

ایک انسان کی عمر جب ساٹھ (60) سال ہو جاتی ہے تو وہ جسمانی لحاظ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اُس کی ذہنی صلاحیت اور کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے سرکار بھی اپنے ملازم کو اس عمر میں گھر بھیج دیتی ہے، لیکن ایک ریاست کو وجود میں آئے جب 60 سال ہوتے ہیں تو یہ وقت اُس کے عین شباب کا ہوتا ہے، یہ ریاست کی نوجوانی کا زمانہ ہے۔ چین میں ماؤزے تُنگ کے انقلاب کو بھی ساٹھ سال ہوا چاہتے ہیں۔ آج اُس کی عسکری اور اقتصادی طاقت سے وقت کی سپریم قوت امریکہ خوفزدہ ہے۔ بھارت اور پاکستان 60 سال قبل اکٹھے آزاد ہوئے تھے۔ بھارت جی 15 سے آگے بڑھ کر جی 8 میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن پاکستان کا معاملہ بالکل مختلف رہا، جیسے کوئی کلی بن کھلے مرجھا گئی ہو۔ سرد راتوں کی چاندنی اور غریب کی جوانی کی طرح بے وقعت بے توقیر۔ حالانکہ پاکستان کا آغاز بہت اچھا تھا، اگرچہ بھارت نے بددیانتی کرتے ہوئے اثاثہ جات میں حصہ نہیں دیا تھا۔ انگریز کا سلوک بھی سوتیلانہ تھا۔ مسلمانوں کی معاشی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ سرکاری ملازمین کو تنخواہ دینے کے لیے خزانہ میں کچھ نہ تھا۔ مہاجرین کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ انسانی تاریخ کی سب سے عظیم ہجرت ہوئی تھی، اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اَن گنت وسائل کی ضرورت تھی۔ شاید ایسے ہی حالات کی توقع کرتے ہوئے آزادی سے پہلے ہی اکثر اقتصادی بزرجمہروں نے یہ کہہ دیا تھا کہ پاکستان اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا اور پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی جھولی میں گر جائے گا۔ لیکن 1948ء میں پاکستان کی حکومت نے پہلا بجٹ پیش کر کے جو ایک متوازن بجٹ تھا، دنیا کو حیران کر دیا۔ اسی سال سٹیٹ بنک آف پاکستان قائم ہو گیا اور پاکستان نے معاشی بہتری کی طرف کچھوے کی چال میں رینگنا شروع کر دیا۔ سیاسی لحاظ سے پیش قدمی کرتے ہوئے پہلے ہی سال اُسے اقوام متحدہ کی باقاعدہ رکنیت حاصل ہو گئی۔ ساری دنیا میں صرف افغانستان نے مخالفت کی۔

ریڈکلف ایوارڈ میں انتہائی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارت کو زمینی طور پر کشمیر سے جوڑ دیا گیا، جس سے کشمیر میں جنگ چھڑ گئی۔ قبائلی علاقوں سے مسلمانوں نے کشمیر کا رخ کیا اور بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ قائداعظم نے بھی افواج پاکستان کو کشمیر جانے کا حکم دیا، لیکن انگریز کمانڈر انچیف ڈگلس گریسی نے حکم کی خلاف ورزی کی۔ بھارت اقوام متحدہ کی طرف بھاگا اور رائے شماری کا وعدہ کر کے اپنی جان چھڑائی۔ جنگ بندی ہو گئی۔ اُس وقت کے مسلمان فوجی ماہرین نے جنگ بندی کی شدید مخالفت کی۔ اُس غلطی کی سزا ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ بہرحال میدان جنگ میں بھارت کو شکست ہوئی۔ برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں فتح کے باوجود اپنے جسد پر لگے ہوئے زخم چاٹ رہا تھا۔ علاقے میں کیمونزم کا غلغلہ تھا اور اس کا مرکز سوویت یونین تھا، جو پاکستان کے سر پر کھڑا غرا رہا تھا۔ کیمونزم ملحد اور بے خدا نظام تھا، نظریاتی اعتبار سے پاکستان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ سوویت یونین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا۔ لیاقت علی خان نے امریکہ اور یورپ کے عیسائیوں سے تعلقات بنانے کو ترجیح دی۔ ابھی پاکستان کو قائم ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ برطانیہ کے حرامی بچے نے اسرائیل کے نام سے مشرق وسطیٰ میں جنم لیا اور فلسطینیوں کے گھر بار برباد کر دیئے گئے۔ اس وقت جنوب مشرقی ایشیا کی صورتِ حال یہ تھی کہ بھارت کو پاکستان دشمنی میں سوویت یونین کی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی۔ چین بھی بے خدا نظام کی زد میں آ چکا تھا۔ افغانستان مسلمان ملک ہوتے ہوئے بھارت کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ یعنی عسکری

لحاظ سے یہ نوزائیدہ ریاست پاکستان دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اقتصادی لحاظ سے شہریوں کے لیے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں یہودیوں نے بعض شرائط کے ساتھ پاکستان کے لیے اپنے تجوریوں کے منہ کھول دینے کی پیشکش کی، لیکن پاکستان کی مسلمان قیادت کا اُس وقت ضمیر زندہ تھا، لہٰذا یہودیوں کو یہ صاف جواب دیا گیا "Our souls are not for sale" (ہماری روحیں برائے فروخت نہیں ہیں)۔ اگر موجودہ قیادت اور لبرل دانشور اُس وقت ہوتے تو اس طرح کی تاویل کر سکتے تھے کہ اسلام نے اضطراری کیفیت میں حرام کھانے کی بھی اجازت دی ہے اور یہودی تو اہل کتاب ہیں، ان کی مدد وصول کرنے میں کیا حرج ہے۔ نظریاتی لحاظ سے بھی ہمارا رخ درست تھا اور ہم صحیح سمت میں سفر کر رہے تھے۔ پاکستان بننے کے چار سال بعد پارلیمنٹ نے قرارداد مقاصد منظور کر کے قومی سطح پر یکسو ہونے کا دوٹوک اعلان کر دیا۔ اُس وقت تک یہ حال تھا کہ پاکستان بھارت سے معاشی لحاظ سے بہتر تھا۔ پاکستان کا ایک سو روپیہ بھارت کے ایک سو چوالیس روپے کے مساوی تھا۔ عوامی سطح پر بھی پاکستانی بھارتیوں سے اوسط آمدنی کے لحاظ سے بہتر پوزیشن میں تھے۔

اس کے بعد نہ جانے پاکستان کو کس کی نظر کھا گئی، قرارداد مقاصد پر عملدرآمد یا اُس کی طرف ادنیٰ سی پیش رفت بھی نہ ہو سکی اور وہ فائلوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی۔ اچھے دنوں میں بھی بڑی برائی کو ختم نہ کیا جا سکا۔ یعنی جاگیردارانہ نظام پوری آب و تاب سے قائم رہا۔ ہم اسے بلا جھجک اور بلا خوف تردید معمارانِ پاکستان کا بہت بڑا اور ناقابل معافی جرم سمجھتے ہیں۔ ان جاگیرداروں میں سے اکثر ناخواندہ تھے، لہٰذا انہوں نے ذاتی مفادات کے حصول اور دولت کی لوٹ کھسوٹ کے لیے سول اسٹیبلشمنٹ کو ساتھ ملایا۔ پھر یہ کہ ان لوگوں کی کوئی سیاسی Commitment نہیں ہوتی تھی۔ مسلم لیگ ایک تحریک ضرور تھی، لیکن وہ باقاعدہ جماعت کبھی بھی نہ بن سکی تھی، لہٰذا کارکنوں کی سیاسی تربیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ سیاست کا مطلب صرف حصول اقتدار سمجھ لیا گیا اور اقتدار کو حصول دولت کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ استحکام پاکستان کے حوالہ سے یہی ذہنیت زہر قاتل ثابت ہوئی اور جاگیرداری نظام نے قومی جسد میں جو مرض پیدا کیا تھا وہ کینسر بن گیا اور اسی بنا پر ہم آج مرض الموت میں مبتلا ہیں۔ اقتدار کا مطلب جب عیش و عشرت، رعب و دبدبہ، حکومتی وسائل کی لوٹ مار بن گیا تو جو چھیننے کی قوت رکھتے تھے، جن کے پاس بندوق تھی، انہوں نے اُسے سیاست دانوں کے سینے پر رکھ دیا۔ سول انتظامیہ سمجھ دار تھی اُس نے اُسے ''جی آیاں نوں'' کہا اور اقتدار میں شرکت کر لی۔ عذلیہ کے پاس عذر تھا، ہم بندوق والوں کو کیسے روک سکتے تھے۔ حالانکہ وہ اُن کے راستے میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر سکتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے نظریۂ ضرورت کا سہارا لے کر عدل کی لٹیا ڈبو دی۔ پریس پر ایسی ایسی قدغنیں لگ گئی کہ آزاد دنیا میں اُس کی مثال نہیں ملتی۔ نہ صرف پریس بند ہوئے بلکہ صحافیوں کے خلاف بغاوت اور دہشت گردی کے مقدمات دائر ہوئے۔ گویا جمہوریت کے چاروں ستونوں کو چت کر کے بندوق والے جمہوریت کی چھاتی پر سوار ہو کر فاتحانہ انداز میں قہقہے لگاتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 1971ء قائداعظم کا پاکستان دولخت ہو گیا۔ بقول شخصے ہم نے قائداعظم کا احسان اتار پھینکا۔

آج پاکستان کا جو حال ہے اسے دیکھ کر سچی بات ہے استحکام پاکستان نمبر نکالتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ اپنا ضمیر ہی چین نہیں لینے دیتا، کون سا پاکستان اور کیسا استحکام۔ وہ پاکستان جس کی فوج مسجد میں محصور لوگوں کو گولیوں سے بھون رہی ہے، جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ پاکستان جس میں جرائم پیشہ لوگ حکومت میں اعلیٰ ترین عہدے حاصل کرتے ہیں۔ وہ پاکستان جس کی مساجد اور امام باڑوں میں نمازیوں کو بموں سے ہلاک کیا جا رہا ہے۔ وہ پاکستان جس میں فحش اور غلیظ گانے تو اونچی آواز میں سُنے جا سکتے ہیں، خطبہ جمعہ کی آواز مسجد سے باہر آ رہی ہو تو خطیب کے خلاف مقدمہ دائر ہو جاتا ہے۔ وہ پاکستان جو دنیا میں بدعنوانی اور رشوت کے حوالہ سے ٹاپ ٹین میں رہا ہے۔ اگر ہم 60 سال میں اپنی سیاہ کرتوتوں کی فہرست تیار کریں تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آ جائے۔ بہرحال ہمیں یہ اقرار کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ 14 اگست کے بعد عوامی نقطۂ نظر سے غلامی کی طرز میں فرق واقع ہوا ہے، حقیقت میں کوئی فرق نہیں۔

آخر میں ہم اس سوال کا جواب دینا ضروری سمجھیں گے کہ ایک آزاد، خوددار اور مستحکم پاکستان کیسے وجود میں آ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر جمہوری طریقے سے وجود میں آیا تھا اور کیا خوب کسی نے کہا ہے کہ اسلام پاکستان کا باپ ہے اور جمہوریت پاکستان کی ماں ہے۔ لیکن اس وقت ہم خود ساختہ یتیم ہیں۔ اسلام کو ہم نے اقتدار کی سیڑھی بنایا اور جمہوریت کی بے حرمتی ہم خود کرتے رہے۔ ایک مستحکم پاکستان صرف اس طرح وجود میں آ سکتا ہے کہ ہم پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام رائج کریں اور جمہوریت میں جو چیزیں اسلام کے خلاف ہیں اُنہیں ختم کر کے عوام کے جمہوری حقوق بحال کریں اور صحیح معنوں میں پاکستان کو اسلامی فلاحی جمہوری ریاست بنائیں، جو عالمی خلافت کا نقطۂ آغاز بن سکے۔

بقیہ: استحکام پاکستان نمبر

اُسی وقت محترم حافظ عاکف سعید صاحب نے اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ ایک الگ خصوصی شمارہ مرتب کیا جائے، جو اب ''استحکام پاکستان نمبر'' کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس خصوصی اشاعت میں حصولِ آزادی سے لے کر اب تک آئین سازی، سیاسی حکومتوں، پے در پے آنے والی فوجی حکومتوں، معاشی پالیسی، خارجہ پالیسی، غرض زندگی کے ہر شعبے میں پاکستان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی تاریخ اختصار مگر جامعیت کے ساتھ سما گئی ہے۔ ہماری ساٹھ سالہ قومی و اجتماعی تاریخ تنقید کے لیے ایک کھلی کتاب ہے۔ مختلف شعبوں اور شخصیتوں کی کارگردگی پر مختلف رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن پاکستان میں اس کی اصل رُوح یعنی نفاذِ اسلام کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اکا دُکا مثالوں کے سوا، اس ملک میں سب کچھ ہُوا، لیکن اسلامی اصول و احکام کے نفاذ کے لیے صدق دلی سے کبھی کوشش نہیں کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک و قوم آج اسلام کی عین ضد ہو کر رہ گئے ہیں۔ موجودہ شمارے کی ایک ایک سطر پر جناب حافظ عاکف سعید نے تنقید اور مرزا ایوب بیگ صاحب نے اصلاح کی نظر ڈالتے وقت، ہر شعبۂ حیات میں اسلام کے نافذ العمل ہونے یا نہ ہونے کے معاملے پر خصوصی توجہ کی ہے۔ اس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔ اُن کے اسلامی جذبے کی شمولیت نے حقائق و معلومات کے جسم میں ایک ایسی روح پھونک دی ہے، جس کے زیر اثر قیامِ خلافت کے نقیب ''ندائے خلافت'' کے منشوری شعر پر نگاہ ٹھہر جاتی ہے:

تا خلافت کی بناء، دنیا میں ہو پھر اُستوار لا کہیں سے ڈھونڈ کر، اسلاف کا قلب و جگر

گویا اب تو آئندہ خصوصی اشاعت کا عنوان ''خلافت نمبر'' ہی ہو سکتا ہے۔ دُعا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ آئے، اور عصرِ حاضر کے اس اہم ترین موضوع پر کام کرے۔

سید قاسم محمود

اس شمارے میں

اداریہ — استحکام پاکستان! 3

دیباچہ — استحکام پاکستان نمبر 5

پہلا باب — **پاکستان: ایک نظر میں** 7

دوسرا باب — **پاکستان قائم ہوتا ہے** 11

اقوام متحدہ کی رکنیت (12) صوبوں کے ابتدائی حالات (13) فسادات اور قتل عام (14)

تیسرا باب — **پاکستان کا پہلا سال** (اقتصادی حالت) 17

چوتھا باب — **مختصر تاریخ: سیاسی حالات** 27

ابتدائی مشکلات (27) قائداعظم کی وفات: ایک غلط فہمی (28) قرارداد مقاصد (29) لیاقت علی خان کے قتل کا معما (30) خواجہ ناظم الدین بطور وزیراعظم (31) محمد علی بوگرا بطور وزیراعظم، چودھری محمد علی کا دور وزارت (32) حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، فیروز خان نون، صدر ایوب خان کا دور اور اقدامات (33) جنرل یحییٰ خان کا دور صدارت (36) عوامی لیگ کے چھ نکات (37) سقوط ڈھاکہ اور اس کے اسباب (38) ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت، جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت، جونیجو کی حکومت اور برطرفی (39) غلام اسحٰق خان کا عہد صدارت، میاں نواز شریف کی دوسری حکومت، جنرل پرویز مشرف کا عہد حکومت (40)

پانچواں باب — **مختصر تاریخ: دستور سازی** 42

قرارداد مقاصد (42) بنیادی اُصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (43) علماء کے بائیس نکات (44) 1956ء کے آئین کی منظوری 1962ء کا آئین (46) دوسرا مارشل لاء (48) 1973 کا آئین، آئین کی ترمیمات (49)

چھٹا باب — **مختصر تاریخ اسمبلی کی برطرفیاں** 52

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی (52) نظریہ ضرورت کی ابتدا (53) 1958ء کا مارشل لاء (54) یحییٰ خان کا مارشل لاء، ضیاء الحق کا مارشل لاء (55)

بے نظیر بھٹو کے دور اوّل کی برطرفی (56) میاں محمد نواز شریف کی پہلی برطرفی (58) وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی دوسری برطرفی، نواز شریف کی دوسری برطرفی (60) صدر محمد رفیق تارڑ کی سبکدوشی (62)

ساتواں باب — **پاکستان میں نفاذ اسلام کے لئے اقدامات** 63

آٹھواں باب — **پاکستان اور عالم اسلام** 67

تقسیم سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کے عالم اسلام سے روابط (67) پاکستان اور مسئلہ فلسطین، عالم اسلام سے روابط اور اقدامات (68) پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات (69) پاکستان اور ترکی، پاک ایران تعلقات، انڈونیشیا کے ساتھ تعلقات، پاک لیبیا تعلقات (70) مصر کے ساتھ تعلقات، بنگلہ دیش سے تعلقات، وسط ایشیا کی ریاستیں اور پاکستان، متحدہ عرب امارات سے تعلقات، فلسطینی ریاست کا تسلیم کرنا (71)

نواں باب — **پاکستان کا دفاع اور خارجہ تعلقات** 72

پاکستان اور امریکہ (72) سینٹو اور سیٹو کے معاہدے، 1965ء کی جنگ اور امریکہ، سابق سوویت یونین اور پاکستان (73) پاکستان اور چین (74) 1965ء کی جنگ اور چین، پاکستان اور افغانستان (75) ڈیورنڈ لائن (76) طالبان کا ظہور، پاکستان ایران تعلقات (78) پاک بھارت تعلقات (79)

دسواں باب — **پاکستان کی جوہری توانائی** 83

گیارھواں باب — **خود احتسابی: زندہ قوموں کا شعار** 85

بارھواں باب — **یہ 1947ء والا پاکستان نہیں!** 90

تیرھواں باب — **استحکام پاکستان** 93

عدم استحکام کے اسباب (93) استحکام پاکستان کی ٹھوس بنیاد (94) نظریۂ پاکستان سے ہمارا انحراف اور اس کے نتائج (97) ملک کا انجام (98)

استحکام پاکستان نمبر

زیرِ نظر شمارہ ''ندائے خلافت'' کا دسواں خصوصی نمبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن خصوصی اشاعتوں کو تحقیقی و تاریخی دستاویزات کی حیثیت سے عوام و خواص میں جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے، وہ ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنے اہم کاموں کی توفیق عطا کی جس کا ہمیں ابتدا میں اندازہ بھی نہ تھا۔ آج اِن خاص نمبروں پر جو تقریباً سال بہ سال شائع ہوتے رہے ہیں، ایک نظر ڈالی جائے تو لگتا ہے، جیسے مستقبل میں کسی بڑے کام کی تیاری ہو رہی ہے۔ وہ بڑا کام کیا ہو سکتا ہے! آیئے، پہلے سابق خصوصی اشاعتوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

1۔ سقوطِ مشرقی پاکستان نمبر: مملکتِ خداداد پاکستان کے دولخت ہونے کے پس پردہ حقائق پر، ایک غیر جانب دار مفصل رپورٹ۔ (دسمبر 1996ء)

2۔ فلسطین نمبر: امتِ مسلمہ کے سب سے بڑے مذہبی اور سیاسی مسئلے پر دستاویزی شمارہ، جس کے دو ایڈیشن طبع ہوئے۔ یہ شمارہ دہلی (انڈیا) کے ایک ناشر نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ (جون 2002ء)

3۔ اقبال نمبر: 2002ء کا سال سرکاری طور پر مفکرِ اسلام علامہ اقبال کے لیے مخصوص تھا۔ اِس سال کے دوران میں بے شمار کتب مختلف زبانوں میں وجود میں آئیں، لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ''ندائے خلافت'' کے اِس شمارے کو نصیب ہوئی جس کا عنوان تھا: ''پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت''۔ یہ خصوصی شمارہ ''قرآن اکیڈمی'' کی جانب سے اور بعد ازاں ''اقبال اکادمی پاکستان'' کی جانب سے بھی کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہُوا۔ (نومبر 2002ء)

4۔ عراق نمبر: یہ خصوصی شمارہ عراق پر بیس روزہ امریکی جارحانہ عسکریت کے دوران لکھا بھی گیا اور طبع بھی ہُوا، اور یوں ہم نے تمام اسلامیانِ عالم کے ساتھ مل کر، عراقی بھائیوں کے شانہ بہ شانہ بذریعۂ قلم، جہاد میں شرکت کی۔ ''عراق نمبر'' بھی دہلی کے ایک اشاعتی ادارے ''فرید بک ڈپو'' نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ (اپریل 2003ء)

5۔ نظریۂ پاکستان نمبر: جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اس میں معروف سیاسی اصطلاح ''نظریۂ پاکستان'' سے متعلق مروجہ فکری مباحث کی تشریح و توضیح کے بعد واضح کیا گیا کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے والے پاکستان میں اسلام کے اصول و احکام کے عملی نفاذ کے ہوا، جو کچھ ہے، موہوم تصورات ہیں۔ (اگست 2003ء)

6۔ مسئلہ کشمیر نمبر: جب امریکا نے جنوبی ایشیا میں اپنی بالادستی اور اسلامیانِ عالم کو اپنے زیرِ دست رکھنے کی دُور رس پالیسی کے تحت پاکستانی فوج کے سپہ سالار جنرل پرویز مشرف کو بھارت کے ساتھ نام نہاد مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو، اقوامِ متحدہ کی ثالثی کے بجائے، امریکی ''روڈ میپ'' کے مطابق حل کرنے پر مجبور کیا تو اُس موقع پر محترم حافظ عاکف سعید اسیر تنظیم اسلامی نے راقم کو ''مشرف واجپائی مذاکرات'' سے پہلے پہلے ''مسئلہ کشمیر نمبر'' مرتب کر کے منظرِ عام پر لانے کا حکم دیا۔ ''مسئلہ کشمیر نمبر'' میں بھی، سابقہ خصوصی اشاعتوں کی طرح، پُر جوش، جذباتی اور بلند بانگ جنگجو الفاظ کی بجائے ٹھوس حقائق و معلومات اور دستاویزات کو ترجیح دی ہے، تاکہ یہ خصوصی شمارہ بھی سابقہ شماروں کی طرح ایک حوالہ جاتی ریکارڈ کی طرح قارئین کرام کے ذاتی کتب خانوں میں بار بار دیکھنے اور پڑھنے کے لیے محفوظ رہے۔ (اگست 2004ء)

8۔ تحریک پاکستان نمبر: 1857ء میں برصغیر پاک و ہند سے مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا، اور اس ملک پر فرنگی قابض ہو گئے۔ اندریں حالات مسلمانانِ ہند کے دلوں میں برطانوی سامراج کے تسلط سے آزادی اور اپنی متاعِ گم گشتہ کی تلاش کا جذبہ فطری تھا۔ اِسی جذبہ نے نوے سالہ دورِ غلامی کے بعد آزادی کی شمع روشن کی، اور مسلمانوں کو ایک آزاد و خود مختار خطۂ زمین پاکستان حاصل ہوا۔ تحریک پاکستان نمبر میں اسی نوے سالہ دور کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ (مارچ 2005ء)

9۔ خواتین نمبر: یہ خصوصی نمبر دراصل تمام تر حلقۂ خواتین تنظیم اسلامی کی مساعی اور کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ اِس خصوصی اشاعت کا خیال بھی اُنہی کی طرف سے آیا تھا اور اسے از اوّل تا آخر مرتب کرنے کی تمام تر ذمہ داری بھی اُنہی کے حصے میں آئی، جسے انہوں نے نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اس خاص نمبر کے ذریعے اسلام کے معاشرتی نظام کے ایک اہم شعبے کو جامع انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی جس کا تعلق اسلام میں عورت کے مقام، اُس کے حقوق اور ستر و حجاب پر مشتمل معاشرتی اقدار سے ہے۔ یہ شمارہ بھی ''ندائے خلافت'' کے خاص نمبروں میں ایک مفید علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ (مئی 2006ء)

10۔ استحکامِ پاکستان نمبر: زیرِ نظر خصوصی نمبر دراصل ''نظریۂ پاکستان نمبر'' اور ''تحریکِ پاکستان نمبر'' کے ساتھ مل کر قومی اہمیت کے فکری مباحث و مسائل کو ایک ''مثلثی یونٹ'' بناتا ہے۔ اِس یونٹ کے سابقہ دو شماروں کی طرح مثلث کے اِس بڑے ضلع کے لیے واقعات و حقائق کو یکجا کرتے وقت راقم نے یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رکھی ہے کہ چونکہ یہ موضوع ابتدائی جماعتوں سے لے کر پوسٹ گریجویٹ جماعتوں تک، مطالعۂ پاکستان کے نصاب میں بھی شامل ہے، لہٰذا عام قارئین کے ساتھ ساتھ طلبہ کے مفاد کا بھی خیال رکھا جائے۔ ''تحریکِ پاکستان نمبر'' کی تعارفی سطور میں راقم نے لکھا تھا: ''تحریک پاکستان محض غیر ملکی استبداد سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک نہ تھی، بلکہ حقیقت میں اسلام کے احیا کی خاطر ایک ایسی جُداگانہ مملکت کے حصول کی تحریک بھی تھی، جہاں اسلام کے نظریۂ خلافت کو عملی شکل دی جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ آزادی کے نتیجے میں ایک مسلم مملکت تو حاصل ہوئی، لیکن کیا یہاں اسلام کا نظام نافذ ہو سکا؟ اگر نہیں، تو کیوں؟

اِن ضروری، بنیادی اور اہم سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے (باقی صفحہ 4 پر)

پاکستان ایک نظر میں

محل وقوع:

پاکستان 24 درجے شمالی اور 37 درجے شمالی عرض بلد کے مابین اور 61 درجے مشرقی اور 75 درجے مشرقی طول بلد کے مابین واقع ہے۔اس کے مشرق میں بھارت، شمال مشرق میں چین، مغرب میں افغانستان اور جنوب مغرب میں ایران ہیں۔افغانستان کی ایک تنگ پٹی واخان پاکستان کو تاجکستان سے جدا کرتی ہے۔جب کہ جنوب میں بحیرہ عرب ہے۔یہ شمالاً جنوباً 1600 کلومیٹر اور شرقاً غرباً 800 کلومیٹر لمبا ہے۔

ہمسایہ ایٹمی طاقتیں:

عوامی جمہوریہ چین اور بھارت

پاکستان کی ایٹمی حیثیت:

پاکستان دنیا کی ساتویں، عالم اسلام کی پہلی اور ایشیا کی تیسری بڑی ایٹمی طاقت ہے۔ایٹمی دھماکے 28 اور 30 مئی 1998ء کو کیے گئے۔

ہمسایہ ممالک:

عوامی جمہوریہ چین، بھارت، افغانستان اور ایران

مذہب:

اسلام ملک کا سرکاری مذہب ہے۔یہاں مسلمانوں کی آبادی 96.7 فیصد اور اقلیتوں کا تناسب 3.3 فیصد ہے۔

بلند ترین مقام:

کے ٹو بلند ترین مقام ہے جس کی سطح سمندر سے بلندی 28250 فٹ ہے۔

پست ترین مقام:

کراچی پست ترین مقام ہے جس کی سطح سمندر سے 22 فٹ ہے۔

دارالحکومت:

اسلام آباد دنیا کے جدید دارالحکومتوں میں سے ایک ہے۔

دیگر بڑے شہر:

کراچی، لاہور، فیصل آباد، راولپنڈی، حیدر آباد، ملتان، گوجرانوالہ، پشاور، سیالکوٹ، کوئٹہ، سرگودھا، بہاولپور، گجرات، جہلم، واہ اور سکھر۔

خصوصی دلچسپی کے مقامات:

درۂ خیبر، ہنزہ، چترال، وادی کاغان، موہنجوڈرو، ہڑپہ، بھنبھور، گلگت، پتریاٹہ، بھوربن، مری۔

زبانیں:

اردو ملک کی سرکاری زبان ہے۔1973ء کے آئین میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے بارے میں ایک شق شامل ہے تاہم یہ 2007ء تک دفتری زبان قرار نہیں دی جا سکی۔

علاقائی زبانیں:

سندھی، پشتو، پنجابی، بلوچی، براہوی، بلتی، شینا، سرائیکی اور ہندکو وغیرہ

اہم فصلیں:

گندم، چاول، گنا، کپاس، چنے، دالیں، تمباکو، مکئی، تیل نکالنے والے بیج اور چائے۔

جنگلات کا رقبہ:

کل رقبے کا 4.8 فیصد۔

اہم معدنیات:

قدرتی گیس، کرومائٹ، چونے کا پتھر، نمک، جپسم، یورینیم، پٹرولیم، تانبا وغیرہ۔

اہم صنعتیں:

چینی، سگریٹ، کپڑا (ہر قسم کا) بناسپتی گھی، سیمنٹ، بلیڈ، کھاد، کاغذ، کھیلوں کا سامان، بائیسکل، چمڑا اور اس کی مصنوعات، پلاسٹک کا سامان، آلات جراحی، سٹین لیس سٹیل، ہوائی جہاز، بحری جہاز، چینی کے برتن، دھات کے برتن، بجلی کا سامان، بجلی کے پنکھے اور الیکٹرانک کا ہر قسم کا

مشترکہ سرحدوں کی لمبائی

	لمبائی کلومیٹروں میں	میلوں میں
پاک افغان سرحد (ڈیورنڈ لائن) ''مغرب میں''	2252	1400
پاک چین سرحد (شمال مشرق) شمالی علاقوں کے ساتھ	595	370
پاک ایران سرحد (جنوب مغرب)	805	500
پاک بھارت سرحد (جانب مشرق)	1610	1000
کل میزان	5262	3270

سامان اور فولاد وغیرہ۔

آب وہوا:

اس کی آب وہوا برِاعظمی ہے۔ برف پوش پہاڑوں کے قریب واقع علاقوں میں موسم سرد، ساحلی علاقوں میں سمندر کی خنک ہواؤں کے اثرات، میدانی علاقوں میں خشک اور سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں سخت گرم، جیکب آباد ملک کا گرم ترین مقام اور شمالی علاقہ جات سرد ترین مقامات ہیں۔

دریا:

دریائے سندھ ملک کا طویل ترین دریا ہے۔ اس کی لمبائی 1800 میل ہے، جبکہ معاون دریاؤں میں ستلج، راوی، چناب اور جہلم شامل ہیں۔ اٹک کے بالکل شمال میں دریائے کابل کا نیلا پانی دریائے سندھ کے پانی میں آ ملتا ہے اور یہیں سے وہ اپنے معاون دریاؤں کے ساتھ پاکستان بھر میں بہتا ہے۔

پہاڑ:

کے ٹو دنیا کی دوسری سب سے اونچی چوٹی ہے اسے سر کرنے کی پہلی کوشش 1903ء میں کی گئی لیکن 1954ء سے پہلے کوئی بھی کوہ پیما اس کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کی بلندی 28250 فٹ ہے۔

پہاڑی سلسلے:

کوہ ہندوکش، کوہ سلیمان، کوہ ہمالیہ اور کوہ قراقرم۔

دنیا کا بلند ترین میدان جنگ:

سیاچن گلیشیر دنیا کا بلند ترین میدان جنگ ہے۔ یہاں 1984ء سے وقفے وقفے کے ساتھ پاکستان اور بھارت کے مابین جھڑپیں ہوتی رہی ہیں۔ اس پر بھارت نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔

پودے:

ریگستانوں، سیراب زمینوں اور ساحل سمندر سے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں تک پھولوں کی چھ ہزار مختلف اقسام موجود ہیں۔ کیکر، چیل، پھلاہی، دیودار اور صنوبر کے درخت پائے جاتے ہیں۔

بندرگاہیں:

کراچی، بن قاسم، گوادر، پسنی، جیونی اور ماڑہ۔

خشک بندرگاہیں:

لاہور، پشاور، سیالکوٹ، فیصل آباد، حیدرآباد، کراچی اور ملتان۔

اہم صحرا

تھر کا شمار دنیا کے بڑے بڑے صحراؤں میں ہوتا ہے۔ چولستان اور تھل دیگر بڑے صحرا ہیں۔

جھیلیں:

منچھر (سندھ)، کینجھر (سندھ)، سپنا (کوئٹہ)، سیف الملوک (وادی کاغان) اور ست پارہ (سکردو) وغیرہ۔

بڑے بڑے ڈیم

تربیلا اور منگلا کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ڈیموں میں ہوتا ہے۔

بین الاقوامی ہوائی اڈے:

اسلام آباد، کراچی، لاہور، ملتان، زیرتعمیر سیالکوٹ۔

ساحل سندھ

ساحل سندھ	330 کلومیٹر
ساحل مکران یا بلوچستان	770 کلومیٹر
کل میزان	1100 کلومیٹر

سمندری حدود

200 بحری میل۔

طرز حکومت

1973ء کے آئین کے مطابق طرز حکومت وفاقی پارلیمانی ہے۔ صدر سربراہ مملکت اور وزیراعظم سربراہ حکومت ہیں۔

پارلیمنٹ:

دو ایوانی یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ۔

عدلیہ:

سپریم کورٹ ملک کی سب سے بڑی عدالت ہے۔ صوبوں میں ہائی کورٹس ہیں۔ شرعی مقدمات کے فیصلوں کے لیے سپریم کورٹ ہی کی تحت شرعی عدالت کام کر رہی ہے۔ یہاں وفاقی محتسب اور وفاقی ٹیکس محتسب کے ادارے ہیں۔

پاکستان کا رقبہ

علاقہ	رقبہ کلومیٹروں میں	رقبے کا تناسب
پاکستان	796 095	100.0
پنجاب	205 344	25.8
سندھ	140 914	17.7
سرحد	74 521	9.4
بلوچستان	347 190	43.6
وفاق کے تحت قبائلی علاقے	27220	3.4
اسلام آباد	906	0.1

کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- ازروئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- نیکی، تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے؟

تو مرکزی انجمن خدام القرآن کے جاری کردہ مندرجہ ذیل خط وکتابت کورسز سے فائدہ اٹھائیے:

(1) قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی کورس

(2) عربی گرامر کورس (I، II، III)

(3) ترجمہ قرآن کریم کورس

مزید تفصیلات اور پراسپکٹس (مع جوابی لفافہ) کے لئے رابطہ:

شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون 3-5869501

مرکزی حکومتیں

گورنر جنرل:

1۔ قائداعظم محمد علی جناح
(15 اگست 1947ء تا 11 ستمبر 1948ء)

2۔ خواجہ ناظم الدین
(14 ستمبر 1948ء تا 17 اکتوبر 1951ء)

3۔ ملک غلام محمد
(19 اکتوبر 1951ء تا 5 اکتوبر 1956ء)

4۔ میجر جنرل اسکندر مرزا
(6 اکتوبر 1955ء تا 22 مارچ 1955ء)

23 مارچ 1956ء میں پاکستان کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس اقدام سے گورنر جنرل کا عہدہ ختم ہوگیا اور اس کی جگہ صدر کے عہدے نے لے لی۔

صدور:

1۔ میجر جنرل سکندر مرزا
(23 مارچ 1956ء تا 27 اکتوبر 1958ء)

2۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
(27 اکتوبر 1958ء تا 25 مارچ 1969ء)

3۔ جنرل آغا محمد یحییٰ خان
(25 مارچ 1969ء تا 20 دسمبر 1971ء)

4۔ ذوالفقار علی بھٹو
(20 دسمبر 1971ء تا 13 اگست 1973ء)

5۔ چوہدری فضل الٰہی
(14 اگست 1973ء تا 16 ستمبر 1978ء)

6۔ جنرل محمد ضیاء الحق
(16 ستمبر 1978ء تا 17 اگست 1988ء)

7۔ غلام اسحاق خان
(17 اگست 1988ء تا 18 جولائی 1993ء)

8۔ فاروق احمد خان لغاری
(14 نومبر 1993ء تا 2 دسمبر 1997ء)

9۔ جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ
(یکم جنوری 1998ء تا 20 جون 2001ء)

10۔ جنرل پرویز مشرف
20 جون 2001ء تا حال۔

وزرائے اعظم:

1۔ لیاقت علی خان
(14 اگست 1947ء تا 16 اکتوبر 1951ء)

2۔ خواجہ ناظم الدین
(19 اکتوبر 1951ء تا 17 اپریل 1953ء)

3۔ محمد علی بوگرہ
(17 اپریل 1953ء تا 11 اگست 1955ء)

4۔ چوہدری محمد علی
(11 اگست 1955ء تا 12 ستمبر 1956ء)

5۔ حسین شہید سہروردی
(12 ستمبر 1956ء تا 18 اکتوبر 1957ء)

6۔ آئی آئی چندریگر
(18 اکتوبر 1957ء تا 16 دسمبر 1957ء)

7۔ ملک فیروز خان نون
(16 دسمبر 1957ء تا 7 اکتوبر 1958ء)

8۔ جنرل محمد ایوب خان
(27 اکتوبر 1958ء تا 27 اکتوبر 1958ء (ایک دن)

9۔ ذوالفقار علی بھٹو
(14 اگست 1973ء تا 5 جولائی 1977ء)

10۔ محمد خان جونیجو
(23 مارچ 1985ء تا 29 مئی 1988ء)

11۔ بے نظیر بھٹو
(2 دسمبر 1988ء تا 6 اگست 1990ء)

12۔ غلام مصطفیٰ جتوئی (قائم مقام)
(6 اگست 1990ء تا 5 نومبر 1990ء)

13۔ میاں محمد نواز شریف
(6 نومبر 1990ء تا 18 اپریل 1993ء)

14۔ بلخ شیر مزاری
(18 اپریل 1993ء تا 26 مئی 1993ء)

15۔ میاں محمد نواز شریف
(26 مئی 1993ء تا 18 جولائی 1993ء)

16۔ معین الدین قریشی (قائم مقام)
(18 جولائی 1993ء تا 18 اکتوبر 1993ء)

17۔ بے نظیر بھٹو
(19 اکتوبر 1993ء تا 5 نومبر 1996ء)

18۔ ملک معراج خالد (قائم مقام)
(5 نومبر 1996ء تا 17 فروری 1997ء)

19۔ میاں محمد نواز شریف
(17 فروری 1997ء تا 12 اکتوبر 1999ء)

نائب صدر:

نورالامین (20 دسمبر 1971ء تا 14 اگست 1973ء)

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر:

1۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
(7 اکتوبر 1958ء تا 8 جون 1962ء)

2۔ جنرل آغا محمد یحییٰ خان
(25 مارچ 1969ء تا 20 دسمبر 1971ء)

3۔ ذوالفقار علی بھٹو (سویلین)
(20 دسمبر 1971ء تا 21 اپریل 1972ء)

4۔ جنرل محمد ضیاء الحق
(5 جولائی 1977ء تا 30 دسمبر 1985ء)

چیف ایگزیکٹو:

یہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں قائم ہونے والا پہلا عہدہ ہے۔ یہ عہدہ جنرل پرویز مشرف نے اس وقت سنبھالا جب 12 اکتوبر 1999ء کو مسلح افواج نے میاں محمد نواز شریف کو بطور وزیراعظم برطرف کردیا تھا۔

بقیہ: پاکستان کی جوہری توانائی

کے ذریعے ہو رہا ہے اور پاکستان وہ ملک ہے جہاں یہ بدترین دہشت گرد گروپ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی قیادت میں کام کر رہا ہے۔ چنانچہ صدر پرویز مشرف نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ''غیر فعال'' قرار دے کر اُن کے گھر میں نظر بند کردیا۔ اس کے باجود امریکا اور برطانیہ کے تھنک ٹینک آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔ لیبیا اور شمالی امریکا نے ایٹم بم بنانے کا ارادہ ترک کیا تو امریکی اخبارات کی جانب سے خبریں شائع ہوئیں کہ امریکا کے لیے سب سے خطرناک ملک اوّل نمبر پر پاکستان اور دوسرے نمبر پر ایران ہے۔

10 مئی 2007ء کو برطانوی تھنک ٹینک ''انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار سٹریٹیجک سٹڈیز'' کی ایک تازہ رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ تین سال پہلے پکڑا جانے والا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا مبینہ ایٹمی نیٹ ورک دوبارہ متحرک ہوسکتا ہے، کیونکہ اس وقت کئی حکومتوں اور ''دہشت گرد گروپوں کی طرف سے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ امریکا میں جاری کی گئی اِس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کے ایسے ساتھی جو قانون کی گرفت سے بچ گئے ہیں، وہ کچھ عرصہ تک زیرزمین رہنے کے بعد بلیک مارکیٹ کا کاروبار دوبارہ شروع کرسکتے ہیں۔ رپورٹ میں ایٹمی بلیک مارکیٹ میں منظم جرائم پیشہ گروپوں کی شمولیت پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ 2001ء سے 2005ء کے دوران ایٹمی سمگلنگ کے تقریباً 429 واقعات کا پتا چلایا گیا۔ ان میں سے 10 فیصد واقعات میں منظم جرائم پیشہ گروپ ملوث تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان، بھارت، شمالی کوریا، لیبیا، ایران، ارجنٹائن، برازیل، مصر، جنوبی افریقہ، شام اور اسرائیل نے غیرقانونی ذرائع سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کی۔ اِن میں سے بعض ممالک جن کے پاس فعال ایٹمی پروگرام ہے، اب بھی ایسی غیرقانونی خرید و فروخت کا کاروبار جاری رکھے ہوئے ہیں۔ امریکی دفتر خارجہ کے ایک سابق سینئر عہدے دار مارک پیٹرک نے الزام لگایا کہ ایسے ممالک میں ایران اور پاکستان پیش پیش ہیں۔

الغرض امریکا اور اُس کے حلیفوں، بھارت اور اسرائیل کے دل سے ایک اسلامی ملک کے ایٹم بم بردار ہونے کا غم و غصہ وقفے وقفے سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں تعینات امریکی کمانڈر ابوزید نے 16 مئی 2007ء کو ایک بیان میں کہا ہے کہ آئندہ وقتوں میں امریکا کے لیے سب سے بڑی مصیبت پاکستان اور سعودی عرب بنیں گے۔

مکتبہ خدام القرآن

کی کتب وکیسٹس اور DVDs / CDs کی خریداری اور دیگر معلومات کے لئے

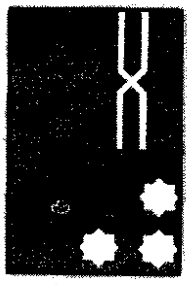

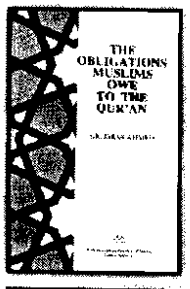

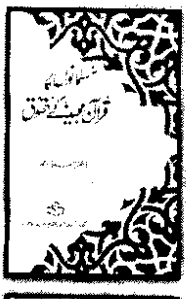

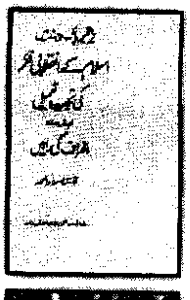

مقامی دفاتر/ سیل پوائنٹس	ایڈریس	فون نمبرز
لاہور	مرکز تنظیم اسلامی A-67' علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو، لاہور	6366638 - 6316638
	ورائٹی بک سٹور لبرٹی مارکیٹ' گلبرگ لاہور	5758355
	الحفیظ 83' شاہراہ قائداعظم' لاہور	6360755 - 6303236
	فیروز سنز' پرائیویٹ لمیٹڈ 60 شاہراہ قائداعظم' لاہور	111626262
	فیروز سنز' پرائیویٹ لمیٹڈ 17 ایچ بلاک' ڈی ایچ اے' لاہور	5742803-5
	فیروز سنز' پرائیویٹ لمیٹڈ z بلاک' ڈی ایچ اے' لاہور	5735662-3
	فیروز سنز' پرائیویٹ لمیٹڈ' قذافی سٹیڈیم لاہور	5712250
	مکتبہ تعمیر انسانیت' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور	7237500 - 7310530
	نیوایڈاولڈ بک شاپ 20۔بی گلبرگ سنٹر مین بلیوارڈ لاہور	5763739
	نیوایڈاولڈ بک شاپ 5-174۔ایچ بلاک' بالمقابل بنک آف پنجاب D.H.A لاہور	5734589 - 5892710
	راحت میڈیکوز نزد راحت بیکرز لاہور کینٹ	6685738
	اسلامک بک سٹور شاپ نمبر 12-11، سیمنٹ ڈیفنس شاپنگ مال، بالمقابل عادل ہسپتال، D.H.A لاہور	6602796 - 6612322
	طاہر کیسٹ اینڈ سی ڈی ہاؤس، پہلی منزل، کاشف سنٹر، چوک نسبت روڈ، لاہور	7350721- 03004350307
کراچی	قرآن اکیڈمی DM-55 درخشاں' خیابان راحت فیز 6' ڈیفنس' کراچی	5340022 - 23
	تنظیم اسلامی، حق اسکوائر پہلی منزل۔یونیورسٹی روڈ' گلشن اقبال' کراچی	4993464 - 5
سکھر	تنظیم اسلامی B-3 ، پروفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی، شکارپور روڈ' سکھر	0715-631074
کوئٹہ	انجمن خدام القرآن، 370-2/12-2 بالائی منزل بالمقابل کوالٹی سویٹس، منان چوک' شاہراہ اقبال، کوئٹہ	2842969
ملتان	قرآن اکیڈمی 25 آفیسرز کالونی' ملتان	6520451
سیالکوٹ	ملک تنویر الحق' ماڈرن بک ڈپو' سیالکوٹ کینٹ	261184
	تنظیم اسلامی 120۔مارکیٹ روڈ ماڈل ٹاؤن سیالکوٹ	557464 -03006128479
اسلام آباد	تنظیم اسلامی' 31/1 فیض آباد ہاؤسنگ سکیم' نزد فلائی اوور برج 8/4-I' اسلام آباد	4434438
پشاور	A-16' ناصر مینشن' شعبہ بازار' ریلوے روڈ نمبر 2' پشاور	214495
نوشہرہ	تنظیم اسلامی آفس نمبر 4 سیکنڈ فلور کنٹونمنٹ پلازہ نزد جنرل بس سٹینڈ، نوشہرہ	610250
دیر	تنظیم اسلامی نزد، گرڈ اسٹیشن، ڈبر تیمرگرہ، ضلع دیر	03009050597
فیصل آباد	انجمن خدام القرآن، قرآن اکیڈمی روڈ سعید کالونی نمبر 2، فیصل آباد	8520869

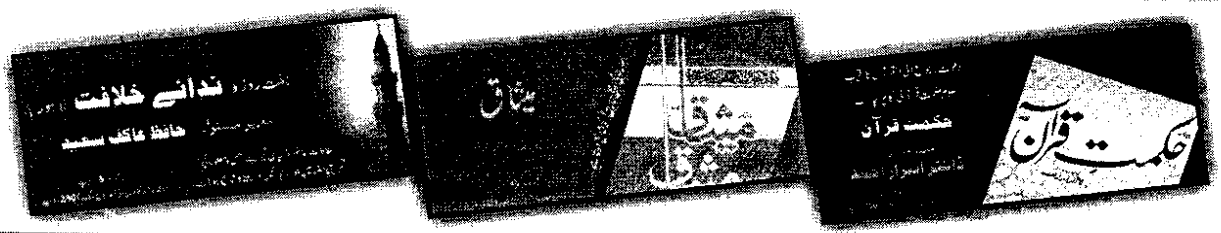

پاکستان قائم ہوتا ہے

پاکستان کے دشمن کی تو بات ہی کیا ہے' بعض غیر جانبدار مبصر بھی بڑے وثوق سے پیش گوئی کیا کرتے تھے کہ پاکستان میں نظم ونسق کا شیرازہ چند ماہ کے اندر بکھر جائے گا' لیکن پاکستان کے کارکنوں نے اپنی اہلیت' کارکردگی' ثابت قدمی' حوصلہ مندی اور فرض شناسی سے اُن کی اس توقع کو غلط ثابت کر دیا۔ ساری کی ساری قوم پاکستان کو کامیاب بنانے کے پُرخلوص جذبے سے سرشار تھی

15 اگست 1947ء رمضان المبارک کے آخری جمعہ کا بابرکت اور مقدس دن تھا۔ اس مبارک دن قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کا منصب سنبھالا اور کابینہ نے حلف اٹھایا۔ ستارہ و ہلال والا قومی پرچم لہرایا گیا۔ دنیا بھر میں آبادی کے لحاظ سے پانچواں اور سب سے بڑا اسلامی ملک معرضِ وجود میں آ گیا۔

پاکستان کی پہلی کابینہ جس نے 15 اگست کو حلف اٹھایا' حسبِ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی:

لیاقت علی خان' وزیراعظم۔ وہ دو محکموں کے سربراہ بھی تھے۔ امورِ خارجہ وتعلقاتِ دولت مشترکہ اور دفاع۔

آئی آئی چندریگر: تجارت' صنعت وحرفت اور تعمیرات۔

غلام محمد۔ خزانہ

سردار عبدالرب نشتر۔ مواصلات

راجہ غضنفر علی خان۔ خوراک' زراعت اور صحت

جوگندر ناتھ منڈل۔ قانون اور محنت

فضل الرحمٰن۔ امورِ داخلہ' اطلاعات' تعلیم

لیاقت علی خان کا وزیراعظم ہونا' نہ صرف ایک فطری امر تھا' بلکہ صحیح اور موزوں بھی تھا۔ وہ کئی سال سے مسلسل آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی رہے تھے۔ انڈیا کی مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ پھر وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں وزیر خزانہ اور مسلم لیگ بلاک کے لیڈر بھی رہے تھے۔ چندریگر' نشتر' غضنفر علی خان اور جوگندر ناتھ منڈل وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں بھی ان کے ساتھی تھے۔ غلام محمد حکومت ہند کے محکمۂ خزانہ میں نمایاں خدمات انجام دے چکے تھے اور ریاست حیدر آباد میں وزیر خزانہ بھی رہے تھے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ عظیم صنعتی شرکت ''ٹاٹا'' میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ فضل الرحمٰن بنگال میں وزیر رہ چکے تھے۔

چند ماہ کے بعد محمد ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ مقرر کر دیا گیا۔ وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے نیویارک گئے ہوئے تھے۔ کابینہ کے اجلاس میں اُن کی نشست وزیراعظم کے بعد آتی تھی۔ محکمہ دفاع وزیراعظم کی تحویل ہی میں رہا۔ ظفر اللہ خان وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی رہ چکے تھے اور اس کے بعد برٹش انڈیا میں فیڈرل کورٹ کے جج مقرر ہوئے تھے۔

ستمبر 1947ء میں جب مہاجرین کے مسئلے نے بے پایاں وسعت اختیار کر لی تو وزارتِ بحالیات مہاجرین

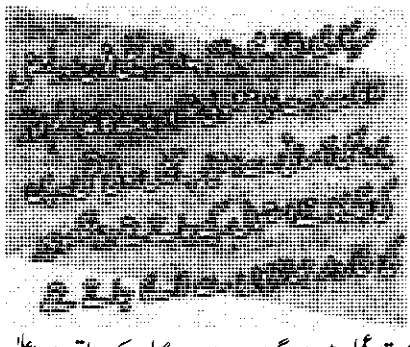

کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ وزارت بنگال کے سابق وزیراعلیٰ سید حسین سہروردی کو پیش کی گئی' لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ پہلے یہ کام فضل الرحمٰن کو سپرد کیا گیا اور بعد میں غضنفر علی خان کو۔ مئی 1948ء میں جب چندریگر سفیر بن کر کابل چلے گئے تو مشرقی بنگال سے خواجہ شہاب الدین بطور وزیر داخلہ کابینہ میں شامل کئے گئے اور فضل الرحمٰن وزارتِ تجارت کے سربراہ مقرر ہو گئے۔ جولائی 1948ء میں غضنفر علی خان ایران میں سفیر بنا دیئے گئے اور ان کی جگہ پیرزادہ عبدالستار نے لے لی۔ ریاستوں اور قبائلی علاقوں کی نئی وزارت جولائی 1948ء میں قائم کی گئی۔ اس کی نگرانی براہِ راست خود قائداعظم کیا کرتے تھے۔ جنوری 1949ء میں امور کشمیر کی ایک جداگانہ وزارت بنائی گئی اور مشتاق احمد گورمانی اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ وہ اس وقت ریاست بہاولپور کے وزیراعلیٰ تھے۔

قیام پاکستان سے ایک ماہ قبل جولائی 1947ء میں سرکاری ملازمین کے انتخاب کے لیے ایک ''سلیکشن بورڈ'' قائم کیا گیا' جس کے ذریعے وزارتوں کے لیے افسروں مثلاً سیکرٹریوں' جوائنٹ سیکرٹریوں اور ڈپٹی سیکرٹریوں کا انتخاب اور محکموں اور دوسرے دفتروں کے سربراہوں کو نامزد کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب کراچی کو حکومت کا صدر مقام قرار دیا گیا تو ایک ''تنظیم نو کمیٹی'' کی تشکیل ہوئی' جسے ہر وزارت اور اس کے محکموں میں اہل کاروں کی تعداد اور مرتبے کے بارے میں سفارشات پیش کرنے اور عملے میں زیادتی اور کمی کا تعین کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ انڈیا کے طول وعرض سے مختلف النوع تجربہ رکھنے والے سرکاری ملازمین کی کثیر تعداد نے پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان حالات میں اگر فنی محکموں مثلاً ریلوے میں ہر اسامی کے لیے ضروری تعداد میں تجربہ کار افراد مل جاتے تو یہ معجزہ ہی ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ بعض شعبوں میں عملہ فاضل تھا اور بعض میں ضرورت سے کم۔ سب سے زیادہ ضرورت آزمودہ کار منتظمین کی تھی۔ بعض شعبوں میں یہ خلا انگریز افسروں کے تقرر سے پورا کیا گیا۔ حکومت پاکستان کے پانچ سیکرٹری انڈین سول سروس کے سبکدوش انگریز افسر تھے۔ انہوں نے سرگرمی اور خلوص کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے۔

تین صوبوں کے گورنر بھی انگریز تھے۔ سر فریڈرک بورن مشرقی بنگال کا گورنر تھا۔ سر فرانسس موڈی پنجاب کا اور سر جارج کنگھم صوبہ سرحد کا۔ صرف سندھ کے گورنر غلام حسین ہدایت اللہ پاکستانی تھے۔ سول انتظامیہ کی نسبت

افواج میں انگریز افسروں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ تینوں کمانڈر انچیف انگریز تھے۔ جنرل سر فرینک میسوری پاکستان کی بری فوج کا پہلا کمانڈر انچیف تھا۔ چند ماہ کے بعد اس کی جگہ جنرل سر ڈگلس گریسی کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ایئر وائس مارشل پیری کین پاکستانی فضائیہ کا کمانڈر انچیف تھا اور ایئر (بعد میں وائس) ایڈمرل جیفورڈ پاکستانی بحریہ کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ فنی خدمات کے لیے انگریز سپاہیوں کو بھی ملازم رکھا گیا۔

ابتدائی دور میں مشکلات زیادہ تر عملہ' عمارات' دفتری ریکارڈ اور سازوسامان اور مواصلات میں کمی کے باعث پیدا ہوئیں۔ بہ عجلت تمام ٹین سے تعمیر شدہ عارضی عمارتوں سے دفتری ضروریات پوری کی گئیں۔ پانچ یا چھ افسر (اور ان میں بہت اونچے مرتبے کے افسر بھی ہوتے تھے) اکثر ایک ہی چھوٹے سے کمرے میں کام کرتے تھے۔ رہائشی مشکلات بھی اسی طرح بہت زیادہ تھیں' اور ان

ضروریات کاغذ قلم اور پن بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ پن کی جگہ کانٹے استعمال کیے جاتے تھے جو ننگھو پیر کی خاردار جھاڑیوں سے لائے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں ساری متعلقہ فائلیں اور ریکارڈ کی نقول دہلی سے کراچی نہیں لائی جا سکتی تھی۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے مقامات سے تمام عملہ بھی کراچی نہیں پہنچا تھا۔ کسی بھی دفتر میں عملے کے ارکان ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے' اور سب کو نئے ماحول اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنی تھی۔ مرکزی حکومت کے اندر اور صوبائی حکومتوں کے ساتھ مواصلاتی رابطے بھی پوری طرح کام نہیں کر رہے تھے۔

لیکن ان گوناگوں مشکلات کے باوجود کام لگاتار ہوتا رہا۔ آغاز میں بالکل بے سروسامانی سے انتظامیہ کو جو چیلنج درپیش تھا' ہمت اور اخلاص نے بڑھ کر اس کا شاندار مقابلہ کیا۔ اس چیلنج کی بدولت تمام مشکلات پر قابو پانے کے لیے بے پایاں جوش اور کوہ شکن عزم ابھر آیا۔ اسی نے

> **سکھوں اور ہندوؤں نے دیکھا کہ اب پنجاب میں مسلم اکثریت یعنی مسلم لیگ کی وزارت بننے کا امکان ہے۔ انہوں نے فوراً لوٹ اور دنگے شروع کر دیے۔ سکھوں کا نعرہ یہ تھا کہ جمنا سے چناب تک سکھ حکومت قائم کریں گے**

کی وجہ سے بڑی دقت محسوس ہوئی۔ حکومت ہند کے قواعد و ضوابط کے تحت سول انتظامیہ کے افسر سرکاری رہائش کے حقدار نہ تھے' اور رہنے سہنے کے لیے انہیں خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا' لیکن کئی مقامات پر بالخصوص نئی دہلی میں حکومت نے مختلف زمروں کے افسروں کے لیے مکانات تعمیر کرائے تھے' اور یہ بہت اہم سہولت معمولی کرایے پر بہم پہنچائی جاتی تھی۔ کراچی میں اتنے زیادہ لوگوں کے امنڈ آنے سے اکثر سرکاری ملازمین کو رہائش گاہ ملنا بڑا دشوار تھا' اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ سرکاری اختیار کے تحت مکانات لیے جائیں اور جہاں کہیں ممکن ہو' مکانات کے حصے کر کے رہائش کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بہم پہنچائی جائیں۔ ان حالات میں افسروں اور عام شہریوں دونوں کو معتدبہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سٹینو گرافروں اور ٹائپسٹوں کی ضرورت دستیابی سے بدرجہا زیادہ تھی۔ حکومت ہند کے دفتری سازوسامان اور فرنیچر وغیرہ میں پاکستان کا حصہ 15 اگست تک پورے کا پورا نہ ملا۔ اور جو کچھ ملا' وہ بھی سارا فسادات اور مواصلات میں تعطل کے باعث کراچی منتقل نہ کیا جا سکا۔ مقامی طور پر جو کچھ مل سکا' خرید لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بے حد کمی تھی۔ ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون اور بعض اوقات بہت ہی معمولی

ہنرمندی اور معیار کار کو چمکایا۔ نئے نئے طریقوں سے مسائل کی گتھیاں سلجھائی گئیں۔ اگرچہ بعض افسر ایسے بھی تھے جو ایک خاص ڈگر پر چلنے کے خوگر تھے' اور اُن کے ذہن ایک مقررہ معمول کے مطابق کام کرنے سے زنگ آلود ہو چکے تھے۔ وہ بے چارے حیران و پریشان تھے' لیکن دوسروں کے لیے یہ چیلنج مہمیز ثابت ہوا۔ کام کرنے کے فرسودہ طریقے ترک کر دیئے گئے۔ جتنا بھی عملہ تھا' اسے بہترین طریق سے کام میں لایا گیا۔ اعداد و شمار کے گوشواروں کا ازسرنو جائزہ لیا گیا' اور یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان میں سے اکثر بے مقصد تھے۔ فیصلہ کرنے یا مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے انہیں کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بعض صورتوں میں گزشتہ فائلوں کی عدم دستیابی بھی زحمت کے پردے میں رحمت ثابت ہوئی' اس لیے کہ نظائر اور مثالوں کے بار سے نجات مل گئی اور نئے حالات کی روشنی میں فیصلے کیے گئے۔ فیصلے اس کثرت سے کرنے پڑتے تھے کہ لمبے چوڑے طریق کار پر عمل در آمد کی فرصت نہیں تھی۔ مسائل کا انبار تھا' جو ایک سے ایک بڑھ کر توجہ کا مستحق تھا۔ مجبوراً طریقہ ہائے کار سادہ اور تیز رفتار کرنے پڑے۔ جدوجہد کی اس شدت میں بے شک غلطیاں بھی ہوئیں' لیکن نظر واپسیں دیکھنے پر بھی وہ عام پُرسکون زمانے

کے مقابلے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔

پاکستان کے دشمن کی تو بات ہی کیا ہے' بعض غیر جانبدار مبصر بھی بڑے وثوق سے پیش گوئی کیا کرتے تھے کہ پاکستان میں نظم و نسق کا شیرازہ چند ماہ کے اندر بکھر جائے گا' لیکن پاکستان کے کارکنوں نے اپنی اہلیت' کارکردگی' ثابت قدمی' حوصلہ مندی اور فرض شناسی سے اُن کی اس توقع کو غلط ثابت کر دیا۔ ساری کی ساری قوم پاکستان کو کامیاب بنانے کے پُرخلوص جذبے سے سرشار تھی' اور سرکاری ملازمین میں بھی یہی قوی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ خوشی خوشی دن رات کام کرتے تھے اور ہر قسم کی تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ کسی کو اپنے ذاتی مفاد کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ اگر دھن تھی تو یہی کہ قوم کی کیسے خدمت کی جائے' تاکہ پاکستان جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر مضبوط و مستحکم ہو جائے۔ ساری سول انتظامیہ پورے ملک میں ایک منظم جماعت کی طرح کام کر رہی تھی۔ تمام چھوٹے بڑے سرکاری ملازمین نے اپنے علم و تجربے اور جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کو پاکستان کی خدمت و بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔

چودھری محمد علی' سابق وزیراعظم نے کیا خوب لکھا ہے: ''جن لوگوں کو قیام پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا' اُن کی یہ خوش بختی آنے والے نسلوں کو میسر نہیں آ سکتی' کیونکہ انہیں ایک فقید المثال تجربے میں حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی تھی''۔

اقوام متحدہ کی رکنیت

معرضِ وجود میں آنے کے فوراً بعد پاکستان نے اقوام متحدہ میں داخلے کے لیے درخواست پیش کی۔ سلامتی کونسل نے پاکستان کی درخواست سے خصوصی سلوک کیا اور یہ سفارش کی کہ پاکستان کو رکنیت فوراً دے دینی چاہئے تاکہ پاکستان جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں شریک ہو سکے۔ چنانچہ ستمبر 1987ء میں پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ سوائے افغانستان کے دنیا کے تمام ملکوں نے رکن بنانے کے حق میں ووٹ دیا۔ پاکستان دوسرے بین الاقوامی اداروں اور ایجنسیوں کا بھی رکن بن گیا۔ مثلاً عالمی ادارۂ خوراک و زراعت' عالمی ادارۂ محنت' عالمی ادارۂ صحت' عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ۔ اپنے قیام کے پہلے سال کے دوران میں ہی پاکستان نے کئی اہم بین الاقوامی کانفرنسوں میں حصہ لیا۔ جاپان کے ساتھ صلح نامے پر مشاورت کے ساتھ کینبرا میں جو کانفرنس ہوئی' اس میں حصہ لینے کے لیے پاکستان سے ایک وفد بھیجا

گیا۔ جنیوا میں عالمی ادارۂ خوراک و زراعت کی کانفرنس میں پاکستان بھی شریک ہوا۔ ہوانا میں تجارت اور روزگار کے متعلق جو اہم کانفرنس ہوئی' کانفرنس کے نمائندوں نے اس میں بھی حصہ لیا۔ اسی طرح عالمی ادارۂ محنت کے علاقائی اجلاس اور ایشیا و مشرقِ بعید کے اقتصادی کمیشن کے اجلاس میں پاکستان شریک ہوا۔ برطانوی دولت مشترکہ کے ممالک اور دوسرے ملکوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کے قیام کی طرف بھی فوراً توجہ مبذول کی گئی۔ برطانیہ اور انڈیا سے ہائی کمشنروں کا تبادلہ کیا گیا۔ اس کے بعد بہت جلد کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور سیلون کے ساتھ بھی۔ امریکا' مصر' ایران' برما' افغانستان' ترکی' روس' چین اور دوسرے ممالک میں سفارت خانے قائم کئے گئے۔ یہ ساری کارروائی قیام پاکستان کے پہلے سال کی ہے۔

صوبوں کے ابتدائی حالات

مشرقی بنگال

صوبہ مشرقی بنگال کے لیے ڈھاکہ میں ایک نئی صوبائی حکومت کی تنظیم کرنی تھی۔ تقسیم کے وقت حسین شہید سہروردی بنگال کے وزیراعلیٰ تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے بطور وزیراعلیٰ مشرقی بنگال اُن کی جگہ سنبھالی۔ کلکتہ جہاں سہروردی کو خاص اثر و رسوخ حاصل تھا' اب ہندوستان کا حصہ تھا۔ خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ کے رہنے والے تھے اور مشرقی بنگال کی صوبائی اسمبلی میں اُن کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سہروردی نے قائداعظم سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان دونوں میں سے ایک کو مرکزی کابینہ میں لے لیا جائے اور دوسرے کو بلا مقابلہ مشرقی بنگال کا وزیراعلیٰ بننے دیا جائے۔ لیکن قائداعظم نے یہ فیصلہ کیا کہ اسمبلی کے ارکان کو اپنا لیڈر چننے کا جمہوری حق استعمال کرنے دیا جائے۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین لیڈر منتخب ہو گئے' اور وہ مشرقی بنگال کے وزیراعلیٰ بن گئے۔ 13 اگست 1947ء کو سہروردی نے گاندھی جی کی یہ دعوت قبول کر لی کہ وہ ان کے ساتھ مل کر کلکتہ میں فرقہ وارانہ مناقشت کے شعلوں کو ٹھنڈا کریں۔ اُن کی مشترکہ مساعی بارآور ہوئیں اور پنجاب میں جو ستم ڈھائے گئے' کلکتہ اور بنگال اُن سے بچ گئے۔

مشرقی بنگال کو بہت سے مشکل مسائل درپیش تھے۔ اسے ایک نئی انتظامیہ کی داغ بیل ڈالنی تھی۔ 1905ء میں پہلی تقسیم بنگال کے دوران میں جب ڈھاکہ کو مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے کا دارالحکومت بنایا گیا تھا' تو وہاں صوبائی حکومت کے لیے کئی عمارتیں بشمول گورنر ہاؤس تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ عمارتیں اب کام آئیں' لیکن پھر بھی مزید تعمیرات کی ضرورت تھی۔ سرکاری اہلکاروں کی کمی اس سے بھی کہیں زیادہ مشکلات کا باعث بنی۔ بیشتر افسر ہندو تھے اور انہوں نے مغربی بنگال چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے افسروں کی شدید کمی کے باعث 50 فی صد سے زائد دیوانی اور فوجداری عدالتیں بند پڑی تھیں۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں بنگال میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسرے صوبوں سے جو مسلمان افسر پاکستان آئے تھے' اُن کی معتدبہ تعداد کو مشرقی بنگال ریلوے کا انتظام سنبھالنے کے لیے بھیجا گیا۔ زبان اور طرزِ معاشرت کے اختلافات بعض غلط فہمیوں کا موجب بنے' جن کی کوکھ سے بعد میں کئی سیاسی تنازعات نے جنم لیا' لیکن اُس زمانے میں انتظامیہ کو قائم کرنے اور چلانے کے کام کو باقی سب باتوں پر فوقیت حاصل تھی' اور جہاں کہیں سے بھی قابل افراد میسر آ سکے' ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مشرقی بنگال کی تجارت اور بنک کاری میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی' ان کی کافی تعداد چھوڑ کر چلی گئی' جس سے صوبے کی اقتصادی حالت پر برا اثر پڑا' کچھ عرصے کے لیے مغربی بنگال سے اشیائے ضرورت کی درآمد تقریباً بند ہو گئی۔

مغربی پنجاب

مغربی پنجاب میں افتخار حسین ممدوٹ' جو صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے' وزیراعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ مغربی پنجاب کو یہ فائدہ تو ہوا کہ لاہور' جو غیر منقسم پنجاب کا دارالحکومت تھا' اس کے پاس رہا' لیکن مشرقی پنجاب' دہلی اور ہمسایہ ریاستوں سے لاکھوں مسلم مہاجرین کی آمد اور مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کے عام کوچ کے باعث اتنے بڑے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے کہ پوری طرح منظم اور مستحکم قوم کے لیے بھی ان سے پوری طرح عہدہ برا ہونا ممکن نہ تھا۔ ان سے بھی زیادہ سنگین معاملہ کشمیر کے تنازعے کا تھا جو تقسیم کے فوراً بعد پھوٹ پڑا۔ مہاجرین کا سیلاب اور تنازعہ کشمیر پاکستان کی ولادت کے فوراً بعد اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئے۔ (ان کی تفصیل آئندہ ابواب میں آئے گی۔)

صوبہ سرحد

شمال مغربی سرحدی صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریسی وزارت 15 اگست کو بھی برسر اقتدار تھی۔ قائداعظم ماضی کے سیاسی اختلافات سے قطع نظر پاکستان کے لیے سب شہریوں کے وفادارانہ تعاون کے خواہاں تھے۔ مرکزی حکومت کی اس پالیسی کے تحت ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے وزراء اپنے عہدوں پر فائز رہ سکتے تھے' لیکن انہوں نے پاکستان کے پرچم کو سلامی دینے سے انکار کر دیا اور پاکستان کے خلاف اپنی پہلی روش کو نہ چھوڑا۔ اس لیے 22 اگست کو گورنر نے قائداعظم کے حکم پر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کر دیا اور خان عبدالقیوم خان وزیراعلیٰ بن گئے۔

صوبہ سندھ

سندھ میں پہلے سے ہی مسلم لیگی وزارت قائم تھی۔ کراچی کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ دشواری محسوس ہوئی۔ یہ شہر اب پاکستان کا دارالحکومت تھا' لیکن ہنوز صوبہ سندھ کا حصہ تھا۔ لازم تھا کہ مرکزی حکومت کو اپنے دارالخلافہ پر پورا اختیار حاصل ہو۔ مئی 1948ء میں گرما گرم بحث کے بعد آئین ساز اسمبلی کے مشورے کے ساتھ یہ قرارداد منظور کی گئی:

> ''کراچی سے متعلق انتظامی اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوں اور یہ حکومت پاکستان کے فرمان سے یا اُس کی جانب سے عمل میں لائے جائیں گے اور قانون سازی کا اختیار مرکزی آئین ساز اسمبلی کو ہوگا۔ اس حکم کا اطلاق کراچی کے قرب و جوار کے ایسے علاقوں پر بھی ہو گا جو مرکزی حکومت کی رائے میں پاکستان کے دارالحکومت کے لیے درکار ہوں گے''۔

سندھ مسلم لیگ کے لیڈر کراچی کی علیحدگی کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں قائداعظم سے رجوع کیا۔ قائداعظم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے فیصلے کو خوش دلی اور خوش اسلوبی سے قبول کر لیں' کیونکہ یہ ''پاکستان کا بلند ترین اور اعلیٰ ترین ادارہ ہے'' اس طرح یہ مخالفانہ تحریک ختم ہو گئی۔ قائداعظم کو بذاتِ خود پورا یقین تھا کہ اسمبلی کا فیصلہ پاکستان اور سندھ کے بہترین مفاد میں ہے۔ 23 جولائی 1948ء کے حکم پاکستان (وفاقی دارالحکومت کے قیام) کے تحت دارالحکومت کراچی کے 567 مربع میل علاقے کی حد بندی کر دی گئی اور اسے مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک حکومت سندھ نے کراچی میں ہی اپنے صدر دفاتر رکھے' لیکن بعد میں وہ حیدرآباد منتقل ہو گئی۔

صوبہ بلوچستان

بلوچستان اب تک پوری طرح ایک باقاعدہ صوبہ نہیں تھا۔ اس میں کوئی منتخب اسمبلی یا وزیر نہیں تھے۔ اس کا انتظام گورنر جنرل کے ہاتھ میں تھا جو ''اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح مناسب سمجھے' اپنے نامزد چیف کمشنر کی

وساطت سے اقدامات کرتا تھا''۔ قائداعظم بلوچستان کے مسائل اور ترقی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ کئی لحاظ سے پاکستان کا سب سے پسماندہ حصہ تھا' لیکن اس میں ترقی و تعمیر کے وسیع امکانات تھے۔ قائداعظم نے بلوچستان کو اپنی خاص ذمہ داری اور توجہ کا مستحق قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے گورنر جنرل کی ایک مشاورتی کونسل قائم کی' جس کا مقصد یہ تھا کہ ''وہ عوام کو اپنے صوبے کے انتظام اور کاروبارِ حکومت میں شرکت کرنے اور پورا حصہ لینے کے قابل بنائے''۔

شمالی علاقہ جات (فاٹا)

صوبہ سرحد' پنجاب اور بلوچستان سے ملحق قبائلی علاقے ہیں۔ غیر منقسم حکومت ہند کے ان علاقوں میں آباد قبائل کے ساتھ جو تعلقات تھے' اگرچہ بین الاقوامی قانون کی رو سے ان کی کوئی قطعی تعریف نہیں کی جاسکتی' لیکن ان کا دارومدار بحیثیت مجموعی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ معاہدوں پر تھا۔ ان معاہدوں کے تحت قبائل نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ وہ ہمسایہ علاقوں کے امن وامان میں خلل نہیں ڈالیں گے اور خوش اطواری سے رہیں گے۔ اس کے معاوضے میں انہیں تعلیم اور تعمیر و ترقی کے لیے مالی امداد اور وظائف ملتے تھے۔ ''قانون آزادیٔ ہند'' کی دفعہ سات میں درج تھا کہ یہ سب معاہدے 15 اگست 1947ء کو ختم ہو جائیں گے' لیکن بعض معاملات میں موجودہ انتظامات جوں کے توں رہیں گے' تا آنکہ ان کو منسوخ نہیں کیا جاتا یا ان کی بجائے نیا معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ قبائلی علاقے اور جرگے کسی لحاظ سے باقاعدہ حکومتوں کے مترادف نہیں تھے۔ حکومت برطانیہ نے ان کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے' وہ بین الاقوامی معاہدوں کی نوعیت کے نہیں تھے اور ان کا تمام تر انحصار باہمی خیر خواہی پر تھا۔ پاکستان کو قبائل کی خیر خواہی حاصل کرنے اور سابقہ انتظامات کو برقرار رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

حکومت پاکستان نے ایک نہایت دانشمندانہ اور جرأت مندانہ فیصلہ بھی کیا جو بہت دوررس اہمیت کا حامل تھا۔ قبائل کی سخت ناراضی کے باوجود انگریزوں نے قبائلی علاقے کے عین قلب میں متعدد قلعے اور فوجی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ان قلعہ بندیوں اور سلسلۂ مواصلات پر آزادی پسند قبائل وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے۔ وہ ایک غیر مسلم طاقت کے تسلط کو ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں کو آگے بڑھنے کی پالیسی پر گاہے گاہے عمل درآمد کرنے کے باعث کئی سرحدی جنگیں لڑنی پڑی تھیں۔ ان مہموں کا مقصد ڈیورنڈ لائن (برطانوی ہند اور افغانستان کے مابین بین الاقوامی سرحد) تک انگریزوں کے مکمل اثر و اقتدار کی توسیع تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس پالیسی کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی فوج کو عملاً جنگی تربیت دینے کا موقع ملتا تھا' لیکن اس سے قبائل کے ساتھ مستقل آویزش پیدا ہوگئی تھی۔

ایک آزاد مسلم مملکت کی حیثیت سے پاکستان کا قبائلی علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ رویہ بنیادی طور پر انگریزوں سے مختلف تھا۔ پاکستان ان کے داخلی معاملات میں مداخلت کا ہرگز خواہاں نہیں تھا' بلکہ اقتصادی تعمیر اور تعلیمی ترقی کی سکیموں کے لیے مدد دینے کا صدق دل سے خواہاں تھا' جس حد تک قبائل بطیب خاطر چاہیں۔ چنانچہ رزمک اور وزیرستان کے دوسرے مقامات سے فوجیں واپس بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے کا قبائل پر ازخود خوشگوار اثر ہوا۔ انہوں نے اس اعتماد کا جواب دوستی اور احترام سے دیا۔

15 اگست کو ''یومِ آزادی'' پنجاب میں بڑے عجیب طریقے سے منایا گیا۔ سہ پہر کو سکھوں کے ایک ہجوم نے برہنہ مسلمان عورتوں کا امرتسر کے گلی کوچوں میں جلوس نکالا۔ ان کی عصمت دری کی' اور پھر عورتوں کو کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بعض کو زندہ جلا دیا

فسادات اور قتل عام

1946ء میں صوبہ بہار کے مسلمانوں کا قتل عام ایک وسیع علاقے میں اپنے مخالفوں کے استیصال کی پہلی منظم کوشش تھی' لیکن تباہ کاری کی اس بدمستی میں کوئی طویل المیعاد منصوبہ پیش نظر نہیں تھا اور اس کی شدت بہت جلد ختم ہوگئی' لیکن پنجاب میں سکھوں نے قتل عام کا جو منصوبہ بنایا' وہ نہ صرف بدرجہا زیادہ وسیع تر تھا' بلکہ ایک لحاظ سے تمام سابقہ فسادات سے مختلف بھی تھا۔ سکھوں کے سامنے ایک واضح سیاسی مقصد تھا اور اس کے حصول کے لیے بے لگام تشدد اور دہشت گردی کو استعمال کیا گیا۔

سکھوں نے یہ دیکھ کر کہ ہندوستان کی آزادی قریب ہے اور مسلم لیگ پاکستان قائم کرنے کے لیے' جس میں وہ پورا پنجاب چاہتی ہے' تقسیم کا مطالبہ کر رہی ہے' جنگ وفساد کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ جنوری 1947ء سے یہ تیاریاں بالکل واضح ہوگئیں' لیکن چونکہ ہندو اور سکھ پنجاب کی حکومت میں غلبے کے ساتھ شامل تھے اور انگریز ہمیشہ ان کے طرفدار رہے' اس لیے ہندوؤں اور سکھوں کی فساد خیز سرگرمیاں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ سکھوں نے شرومنی اکالی دل اور اکال سینا دو پرائیویٹ فوجوں کی تنظیم کی۔ انہوں نے نہنگ سکھوں کی جمعیتیں مرتب کیں۔ پنجاب کے دیہات' قصبات اور شہروں میں وسیع پیمانے پر اشتعال انگیز پروپیگنڈا کیا۔ نہایت اہتمام کے ساتھ روپیہ فراہم کیا۔ مختلف مقامات پر تلواریں' کرپانیں' بھالے اور بم بنانے کے کارخانے قائم کئے۔ سکھ ریاستوں سے اور دوسرے مقامات سے آتشیں اسلحہ مہیا کیا۔ سکھوں کے ساتھ ساتھ راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) بھی بڑے جوش وخروش سے کام کر رہی تھی۔

ہندو جنگجو تنظیم

دسمبر 1942ء تک راشٹریہ سیوک سنگھ کے قاتلوں اور لٹیروں کی تعداد پنجاب میں دس ہزار تھی' لیکن جنوری 1947ء میں یہ بڑھ کر 47 ہزار ہوگئی اور ان کی جمعیت میں اضافے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہندو سیٹھ اور ساہوکار ان کے سرپرست اور مددگار تھے۔ اُن کے لیڈر ڈاکٹر سرگوگل چندنارنگ تھے۔

جس وقت 2 مارچ 1947ء کو خضر حیات ٹوانہ کی مخلوط وزارت نے استعفیٰ دیا اور سکھوں اور ہندوؤں نے دیکھا کہ اب پنجاب میں مسلم اکثریت یعنی مسلم لیگ کی وزارت بننے کا امکان ہے' انہوں نے فوراً بلوے اور ہنگامے شروع کر دیئے۔ یہ بلوے اور ہنگامے مغربی پنجاب میں زیادہ ہوئے اور جاری رہے۔ سکھوں کا نعرہ یہ تھا کہ جمنا سے چناب تک سکھ حکومت قائم کریں گے۔ مسلم لیگ کی حکومت قائم ہونے کی بجائے پنجاب میں دفعہ 92 کے تحت گورنر کی حکومت قائم ہوئی' مگر سکھوں اور ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں کے خلاف قتل وغارت گری کی جو مہم شروع کر دی تھی' وہ پھر بھی جاری رہی۔ وہ ایک بڑے منصوبے کے تحت تھی۔ انگریز گورنر نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی اور نہ اس میں کوئی کمی آئی۔

ریاستوں کے سکھ اور ہندو حکمرانوں نے اس ہولناک المیے میں نہایت ذلیل کردار ادا کیا۔ پنجاب کی ریاستوں پٹیالہ' کپورتھلہ وغیرہ میں اور الور اور بھرت پور میں ایک ہی داستان دہرائی گئی۔ ریاستی فوجوں نے ہندو اور سکھ جتھوں کے ساتھ مل کر مسلم آبادیوں کو بڑے منظم طریقے

سے تہ تیغ کیا۔ وسطی پنجاب میں' جوان فسادات کا مرکز و منبع تھا' جولائی کے اواخر میں ہی سکھ جتھوں کے منظم حملے شروع ہو گئے تھے اور ان کی رفتار اور شدت میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا' حتیٰ کہ 15 اگست تک اس سارے علاقے میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

اس بہیمانہ قتل عام کا ہدف صرف دیہی علاقے نہیں تھے' شہروں میں اس سے بھی بدتر اور روح فرسا واقعات ہو رہے تھے۔

15 اگست کو ''یومِ آزادی'' پنجاب میں بڑے عجیب طریقے سے منایا گیا۔ سہ پہر کو سکھوں کے ایک ہجوم نے برہنہ مسلمان عورتوں کا امرتسر کے گلی کوچوں میں جلوس نکالا۔ ان کی عصمت دری کی' اور پھر عورتوں کو کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بعض کو زندہ جلا دیا۔

''لندن ٹائمز'' نے اپنی 18 اگست کی اشاعت میں لکھا:

''گزشتہ پچاس برس کے شہری فسادات میں جتنے افراد ہلاک ہوئے' ان سے کہیں زیادہ انڈیا کے لوگ پچھلے ایک ماہ کے مختصر عرصے میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں۔ لاکھوں افراد بے گھر کر دیئے گئے ہیں۔ یورپ میں جنگ عظیم میں جو تبادلۂ آبادی ہوا تھا' اس سے کئی گنا بڑا تبادلۂ آبادی جبراً دو ایسی حکومتوں میں ٹھونسا جا رہا ہے جو نہ اسے چاہتی ہیں اور نہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی سکت رکھتی ہیں''۔

جونہی مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کا لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے مقامات میں تانتا بندھا اور انہوں نے اپنا دکھڑا رویا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف فوراً جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ ان بے گھر' زخموں سے نڈھال اور دست و پابریدہ انسانوں کو دیکھ کر لوگوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو گئے کہ قائداعظم اور دوسرے لیڈروں نے لوگوں سے تحمل سے کام لینے اور انتقامی کارروائی سے احتراز کرنے کی جو اپیلیں کیں' وہ وقتی طور پر کارگر نہ ہوئیں۔ یہ اندھے طیش کا جبلی ردعمل تھا' لیکن مشرقی پنجاب کے برعکس تشدد کے ان اِکا دُکا فوری مظاہروں میں نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ ہی باقاعدہ تنظیم۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا ہے' جرائم پیشہ عناصر کو لوٹ مار اور املاک کو تباہ کرنے کا موقع مل گیا اور وہ بھی اس ہنگامے میں کود پڑے۔ ان جوابی حملوں کا ہدف زیادہ تر سکھ تھے' لیکن ہندوؤں کو بھی نقصان پہنچا۔ جلد ہی مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کا دھارا شروع ہو گیا۔

18 ستمبر کو یہ اطلاع ملی کہ صرف جالندھر ڈویژن میں 18 لاکھ مہاجرین ترک وطن کے لیے انتظامات کے منتظر ہیں۔ ریلوے' گاڑیوں اور پیدل قافلوں پر سکھوں کے حملے ان کے انخلاء میں سدراہ بنے ہوئے تھے اور ماسٹر تارا سنگھ یہ اعلان کر رہا تھا: ''یہ جنگ ہے جنگ''

16 اگست 1947ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان دہلی گئے تا کہ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستان کی حکومت کے ساتھ فسادات پر بات چیت کی جا سکے۔ کمانڈر انچیف آکنلیک نے مشترکہ دفاع کونسل کے سامنے صورتِ حال کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی' وہ سخت دہشت انگیز تھی۔ دونوں ملکوں میں تارکین وطن کی نقل و حرکت ابھی ابتدائی مرحلوں میں تھی' لیکن روزانہ اطلاعات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ انتقالِ آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں وزیراعظم پنڈت نہرو اور لیاقت علی خان پنجاب میں خط تقسیم کے دونوں جانب دورہ کریں اور امن و امان بحال کرنے کے لیے پوری کوشش کریں۔

29 اگست کو مشترکہ دفاع کونسل کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا' جس میں ماؤنٹ بیٹن اور قائداعظم بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں پنجاب باؤنڈری فورس توڑ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کہ ہر ملک کی حکومت کو اپنے اپنے علاقے میں امن و امان کی ذمہ داری سنبھال لینی چاہئے۔ یکم ستمبر کو پنجاب باؤنڈری فورس کو ختم کر دیا گیا۔ لاہور میں اجلاس کے بعد پنڈت نہرو اور لیاقت علی خان نے متاثرہ علاقوں کا چار روزہ مشترکہ دورہ کیا۔ انہوں نے دونوں طرف کے کئی مقامات کا دورہ کیا' مثلاً امرتسر' بٹالہ' ہوشیار پور' لاہور اور شیخوپورہ۔ مہاجر کیمپ لاتعداد مرد' عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کیمپوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خوراک' پانی' صحت و صفائی اور طبی امداد کا انتظام از حد ناکافی تھا' یا سرے سے تھا ہی نہیں۔ برسات کا موسم تھا لیکن کیمپ آسمان کی کھلی چھت کے نیچے تھے۔ ان میں دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے کہیں کہیں درخت تھے۔ جو کیمپ عمارتوں میں بنائے گئے تھے' ان میں گنجائش سے کئی گنا زیادہ لوگ ٹھونس دیئے گئے تھے۔

اس دورے کے بعد دونوں وزرائے اعظم نے 3 ستمبر کو لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے اپنی اپنی حکومتوں کی جانب سے اس عزم کا اعادہ کیا کہ امن و امان فوراً بحال کرنا چاہئے۔ ہر قسم کی قانون شکنی کو کچل دینا چاہئے اور اس کے مرتکب عناصر کو سخت سزا دینی چاہئے' لیکن دوسرے ہی دن 4 ستمبر کو ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں قیامت صغریٰ بپا ہو گئی۔ اگرچہ دہلی صدیوں تک مسلم حکمرانی کے دور میں دارالخلافہ رہا تھا' لیکن اس کی آبادی میں مسلمان ہمیشہ سے اقلیت میں تھے۔ دہلی اور اس کے مضافات مثلاً قرول باغ اور سبزی منڈی میں مسلمانوں کے مکانوں پر نشان لگائے گئے' اور پھر سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھیوں نے ان پر باقاعدہ منصوبے کے تحت حملہ کیا۔

4 ستمبر تک بھارت کے دارالحکومت میں صورتِ حال اس قدر سنگین ہو گئی کہ ماؤنٹ بیٹن سے' جو اس وقت شملے میں تھا' ہندوستان کی کابینہ نے فی الفور دہلی واپس آنے اور معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی درخواست کی۔ وہ 6 ستمبر کو دہلی پہنچا اور فوراً سرگرم عمل ہو گیا۔ گاندھی جی بھی 9 ستمبر کو دہلی پہنچ گئے' اور انہوں نے فرقہ وارانہ مصالحت اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ یہی کچھ پنڈت نہرو نے کیا' لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' میں لکھا ہے:

''سردار پٹیل کا رویہ جواہر لال نہرو اور میرے طرزِ فکر سے مختلف تھا۔ اس سے مقامی انتظامیہ متاثر ہو رہی تھی اور یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ افسر دو دھڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ افسروں کا بڑا دھڑا وزیر داخلہ سردار پٹیل کی طرف دیکھتا تھا' اور ان کی دانست میں جس طرح وہ خوش ہو سکتا تھا' وہ اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ایک چھوٹا دھڑا جواہر لال اور میری طرف مائل تھا اور جواہر لال کے احکام پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ تھا اور اس طرح دہلی کی انتظامیہ براہ راست اس کے ماتحت تھی۔ جب قتل و غارت اور آتش زنی کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہو گیا تو گاندھی جی نے پٹیل کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ اس قتل و غارت کو روکنے کے لیے وہ کیا کر رہا ہے۔ سردار پٹیل نے گاندھی جی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو اطلاعات انہیں موصول ہو رہی ہیں' ان میں بڑی مبالغہ آرائی ہے' بلکہ سردار پٹیل یہاں تک کہہ گزرا کہ مسلمانوں کے لئے شکایت یا خوف کی کوئی وجہ ہی نہیں''۔

مسلمانوں کے لئے دہلی میں پرانا قلعہ' مقبرہ ہمایوں اور دوسرے مقامات پر مہاجر کیمپ قائم کر دیئے گئے۔ لارڈ ریسے نے پرانے قلعے کا دورہ کیا۔ وہاں پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے والے مسلمان افسر اور ان کے اہل و عیال بھی پناہ گزین تھے۔ ہندوستان کی حکومت پاکستان

کے سرکاری ملازمین کے انخلاء میں روڑے اٹکا رہی تھی۔

18 ستمبر کو یہ اطلاع ملی کہ صرف جالندھر ڈویژن میں 18 لکھ مہاجرین ترک وطن کے لیے انتظامات کے منتظر ہیں۔ ریلوے' گاڑیوں اور پیدل قافلوں پر سکھوں کے حملے ان کے انخلاء میں سد راہ بنے ہوئے تھے اور ماسٹر تارا سنگھ یہ اعلان کر رہا تھا: ''یہ جنگ ہے جنگ''۔

11 ستمبر 1947ء کو لارڈ رسے (وائسرائے کا سیکرٹری) کراچی آیا۔ اس کا مقصد قائداعظم کو دہلی کے فسادات سے آگاہ کرنا اور حکومت ہند کی نیک نیتی کا یقین دلانا تھا۔ رسے نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے:

''قائداعظم نہایت پُر وقار اور بہت اداس نظر آتے تھے۔ ان کی باتوں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ناامید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''اب لڑنے مرنے کے سوا چارہ نہیں''۔ ہم ان کے مطالعے کے کمرے میں چلے گئے اور وہ کہنے لگے: ''کوئی بھی شخص کس طرح یقین کر سکتا ہے کہ حکومت ہند امن وامان کی بحالی اور اقلیتوں کی حفاظت کے لیے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ کوشش کر رہی ہے۔ اس کے برعکس گزشتہ تین ہفتوں کے واقعات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے پیدا ہوتے ہی وہ اس کا گلا گھونٹ دینے کے درپے ہیں''۔

فی الحقیقت صورتِ حال انتہائی سنگین' انسانیت سوز اور سخت وحشت ناک تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہندوستانی پریس نے پاکستان کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی بھرپور مہم جاری کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ گاندھی جی بھی اس ہیجان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سر فرانسس ٹوکر نے اپنی ''یادداشتوں'' میں لکھا ہے کہ 26 ستمبر کو گاندھی نے اپنی پرارتھنا کی مجلس میں کہا کہ وہ ہر قسم کی جنگ بازی کا مخالف رہا ہے' لیکن پاکستان سے حق رسی کا اگر کوئی اور طریقہ نہیں ہے' اور اگر پاکستان اپنی مسلمہ غلطی کو نہ ماننے پر اصرار کرتا رہا اور اسے کم سے کم کر کے دکھاتا رہا تو پھر حکومت ہند کو اس کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی''۔

ستمبر کے اواخر میں پاکستان کے قیام کے صرف دو ماہ بعد ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ 28 ستمبر کو سپریم کمانڈر مارشل آکنلیک نے برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی اور چیف آف سٹاف کو لندن میں جو رپورٹ بھیجی' اس میں یہ سفارش کی:

''اگر ہندوستان اور پاکستان کی افواج میں کھلم کھلا جنگ کی نوبت آئی' جس کا کافی امکان ہے تو ان افواج میں ملازم تمام انگریز افسروں اور دوسرے اسٹاف کو یہ حکم دینا ناگزیر ہو جائے گا کہ وہ ان افواج کی کمان اور انتظام سے فی الفور کنارہ کش ہو جائیں۔ اس حکم پر مختصر نوٹس پر عمل درآمد کرنے کے لیے انتظامات کر لیے گئے ہیں اور متعلقہ کمانڈروں کو مطلع بھی کر دیا گیا ہے۔ دونوں حکومتوں کو بھی مشترکہ دفاع کونسل کی وساطت سے سرکاری طور پر اس موقف سے آگاہ کر دیا گیا ہے''۔

ان سخت پریشانی کے ایام میں' جب مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا' ہلاکت انسانیت کی ہولناکیاں جاری تھیں' اور جنگ سر پر منڈلا رہی تھی' حکومت پاکستان امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اور اپنے لوگوں کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین کرا رہی تھی کہ پاکستان کی عزت اور مفاد دونوں ہی امن اور اقلیتوں کے تحفظ کے متقاضی ہیں۔ فضا میں جذبات کے طوفان تھے اور الزامات اور جوابی الزامات کی بارش ہو رہی تھی۔ حکومتِ پاکستان کا اپنا ضمیر صاف اور مطمئن تھا۔ حکومت نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر سے مشورہ اور امداد طلب کی' تاکہ غیر جانبداری سے سارے منظر کا معائنہ کیا جا سکے' لیکن ایک نہ ایک بہانے سے حکومت ہندوستان اس تجویز سے متفق نہ ہوئی۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں حکومت پاکستان نے حکومت برطانیہ سے کہا کہ وہ دولت مشترکہ کے تمام رکن ممالک کینیڈا' آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ بلکہ ہندوستان کی حکومتوں کو مطلع کر دے کہ برصغیر پاک وہند کن حالات سے دوچار ہے' تاکہ ان سنگین مشکلات کو دور کرنے کے ذرائع اور تدابیر پر غور وخوض کیا جائے۔ دوستانہ مشورے اور امداد کے لئے یہ اپیل صدا بہ صحرا ثابت ہوئی' کیونکہ حکومت ہند اس کے برخلاف تھی۔

اکتوبر کے وسط تک پنجاب میں ظلم وتشدد کا زور کم ہونے لگا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جو لوگ تشدد کا ہدف تھے' ان کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ مشرقی اور مغربی پنجاب اور بعض ہمسایہ علاقوں کے مابین تقریباً مکمل تبادلہ ہو کے رہے گا۔ اس لیے اصل مسئلہ حتی الوسع جلد از جلد اور باقاعدہ انخلاء اور مہاجرین کی آبادکاری کا بندوبست تھا۔

میٹرک کا امتحان

اچھے نمبروں سے پاس کرنے والے ذہین نوجوانو!

آپ کے ذہنوں میں یقیناً مستقبل کے لیے کئی حسین خواب ہوں گے!!

لیکن بلاشبہ حسین ترین مستقبل وہ ہے جس کی نشاندہی ہمارے آقا اور مولیٰ محمد ﷺ نے فرمائی ہے کہ:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) (بخاریؒ عن عثمانؓ بن عفان) یعنی ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے''۔

لیکن قرآن کا یہ پڑھنا اور پڑھانا وقت کی اعلیٰ علمی وفکری سطح پر ہونا چاہیے!

اسی مقصد کی جانب ایک منظم کوشش کے لیے

قرآن کالج

اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن میں نیا نظم قائم کیا گیا ہے

جس میں ایف اے میں لازمی مضامین کے علاوہ صرف عربی' اقتصادیات یا سیاسیات اور ریاضی پڑھائے جائیں گے

اور مستحق طلبہ کو بھرپور رعایتیں دی جائیں گی۔ اس وقت ایف اے کے داخلے شروع ہیں!
تعلیم کو محض پیسہ کمانے والے نظام کو رد کر کے اس حسین ترین مستقبل کی طرف پیش قدمی کریں!
اور اللہ اور رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کریں۔ تفصیلات کے لیے رجوع کریں:

پاکستان کا پہلا سال

قیامِ پاکستان کے وقت ملک کی اقتصادی اور مالی حالت اور دستیاب وسائل

ایک جائزہ

پاکستان کا نظریہ سامنے آتے ہی یہ شبہات کیے جانے لگے تھے کہ آیا پاکستان اقتصادی اور مالی اعتبار سے بقا کی صلاحیت رکھتا ہے؟ اس موضوع پر ہندوؤں نے اس زور کا مخالفانہ پروپیگنڈا کیا کہ اور تو اور اس نظریے کے ہمدرد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ستمبر 1945ء میں سر ہومی مودی اور ڈاکٹر جان متھائی نے پاکستان کے اقتصادی اور مالی پہلوؤں پر یادداشت شائع کی۔ یہ دو سربرآوردہ قومی کارکنوں کی طرف سے ایک بے لاگ تحقیق تھی۔ ان میں ایک ممتاز پارسی تاجر تھا اور دوسرا سرکردہ ماہر اقتصادیات، جو حکومت ہند کا اقتصادی مشیر رہ چکا تھا اور بعد میں اس کا وزیرِ خزانہ بھی بنا۔ انھوں نے اپنی آراء کا خلاصہ دو قضیوں کی صورت میں بیان کیا۔

1۔ علیحدگی کے فیصلے کا اگر مختصر اعتبار سے دیکھا جائے کہ آیا موجودہ معیارِ زندگی قائم رکھا جا سکتا ہے اور قبل از جنگ کی سطح پر سرکاری اخراجات پورے کیے جا سکتے ہیں، ماسوائے دفاعی اخراجات کے' تو معلوم ہوتا ہے کہ تقسیمِ ملک اقتصادی لحاظ سے قابلِ عمل ہے۔

2۔ لیکن اگر مطمحِ نظر یہ ہو کہ مستقبل میں اقتصادی ترقی اس حد تک ہو جس سے نہ صرف عام معیارِ زندگی بھی معقول حد تک بہتر ہو جائے، بلکہ دفاعی اخراجات بھی ضروریاتِ زمانہ کے مطابق پورے ہو جائیں تو پھر سیاسی علیحدگی کی جو سکیم بھی پیشِ نظر ہو اس کی اولیں شرطیں یہ ہونی چاہیے کہ برصغیر کی حفاظت اور اس کے اقتصادی استحکام و ترقی کے معاملات میں دونوں مملکتوں کے مابین موثر اور مسلسل تعاون ہوگا۔ اگر ایسا تعاون نہ ہوا تو پھر پاکستان اور ہندوستان دونوں معرضِ خطر میں پڑ سکتے ہیں۔

تعاون میں دونوں ہی ملکوں کا فائدہ تھا، لیکن کانگریس کی پاکستان دشمنی نے اس کی بنیاد اکھاڑ دی تھی۔ پنجاب میں قتلِ عام، نقد بقایا جات اور فوجی ساز و سامان کے جھگڑے، کشمیر اور نہری پانی کے تنازعات اور دوسرے سب قضیے ایک جارحانہ ذہنیت کی پیداوار تھے کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ پاکستان کا پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ کانگریس کے لیڈر کچھ تو اس بات پر غصہ کے مارے اندھے ہو رہے تھے کہ قیامِ پاکستان سے ان کا سارے ہند پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کا خواب فی الحال شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن ان کی سوچ بچار کا اصلی محور یہ تھا کہ ہندوستان کے برعکس پاکستان اقتصادی اعتبار سے دیر تک زندہ رہنے کے قابل نہیں۔ لہٰذا ہندوستان اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر معاندانہ پالیسی سے پاکستان کے انہدام کو تیز تر کر سکتا ہے۔

ہندوستان نہ صرف علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے پانچ گنا بڑا ہے۔ بلکہ قدرتی ذرائع بالخصوص کوئلے اور لوہے سے مالا مال ہے اور اس کی صنعتی اساس بھی مضبوط ہے۔ برصغیر کا انگریزی نظامِ حکومت اس بنیاد پر قائم تھا کہ ہندوستان ایک اقتصادی وحدت ہے۔ ملک بھر میں تجارت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مواصلات کا نظام بھی ایک ہی تھا، کرنسی اور مالی سہولتوں کا ایک ہی متحدہ نظام تھا۔ علاوہ ازیں ریلوے اور تار برقی کے سلسلہ نے اقتصادی وحدت کو مضبوط کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ لیکن انگریزوں نے مختلف خطوں کی متوازن ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ درحقیقت انگریزی عہدِ حکومت میں تعمیر و ترقی کے لیے کسی منصوبہ بندی کا تصور ہی نہیں تھا۔ اس کی دلچسپی صرف دفاع اور امن و امان برقرار رکھنے سے تھی۔ معاشی شعبہ میں انگریزی حکومت کا بڑا کارنامہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی بندرگاہوں کی تعمیر و ترقی تھا۔ مواصلات کے سلسلے بھی انہی بندرگاہوں سے ملک کے کونے کونے تک پھیلتے جاتے تھے، لیکن یہ سب کچھ معاشی بہبود کے منصوبوں کے بجائے زیادہ تر دفاعی ضروریات کا مرہونِ منت تھا۔

یہ بڑی بندرگاہیں اور ان کے متصلہ یا دوسرے علاقوں میں قائم شدہ صنعتی مراکز سب کے سب ہندوستان میں واقع تھے۔ جو علاقے پاکستان میں شامل ہونے والے تھے ان میں بہت ہی کم صنعتیں تھیں۔ ان علاقوں کی زرعی پیداوار ہندوستان کے صنعتی مرکزوں تک لے جائی جاتی تھی۔ جہاں وہ یا تو صنعت میں کام آتی یا برآمد کر دی جاتی۔ جو کاروباری ادارے اور بنک برصغیر کی اس باہمی مربوط معیشت کو کنٹرول کرتے تھے، ان سب کے صدر دفاتر انہی مراکز میں تھے۔ برصغیر کی صنعت و تجارت ہندوؤں یا انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ سرمایہ دار، صنعت کار، صنعتی منتظم اور فنی ماہر بھی زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ اپنی قوت کے غرور میں کانگریس لیڈر پاکستان کی طرف دستِ تعاون بڑھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس ان کا خیال یہ تھا کہ دباؤ اور پاکستان کی ہیئت ترکیبی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اس کی معیشت کو تہ و بالا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سردار پٹیل کے اس خیال سے تقریباً تمام ہندو لیڈر متفق تھے کہ "ہندوستان اس قدر مضبوط ہوگا کہ باقی ماندہ حصے بھی بالآخر اس میں آملیں گے"۔

پاکستان اس لحاظ سے ایک منفرد ملک ہے کہ اس کے دو حصے تھے جو برابر کے اہم تھے اور ان کے درمیان ایک ہزار چوڑا غیر ملکی علاقہ حائل تھا۔ 1961ء کی مردم شماری کے مطابق مشرقی پاکستان کی آبادی 5 کروڑ 10 لاکھ اور مغربی پاکستان کی آبادی 4 کروڑ 30 لاکھ تھی اور کل آبادی 9 کروڑ 40 لاکھ۔ آزادی کے وقت کل آبادی 7 کروڑ 40 لاکھ تھی۔ مشرقی پاکستان کا رقبہ 143998 مربع کلومیٹر ہے اور مغربی

پاکستان کا رقبہ 796095 مربع کلومیٹر ہے۔ اس طرح مشرقی پاکستان اگر چہ رقبہ کے لحاظ سے مغربی پاکستان کے چھٹے حصے کے برابر تھا، لیکن اس کی آبادی مغربی پاکستان سے قدرے زیادہ تھی۔ دونوں خطوں کے قدرتی خصائص بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔

مشرقی پاکستان کی آب و ہوا گرم ملکوں کی سی ہے۔ اوسطاً 88 انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اس کی بیشتر زمین ہموار ہے۔ درحقیقت یہ ایک زیرِ تشکیل ڈیلٹا ہے۔ گنگا اور برہم پترا کے عظیم دریائی سلسلے جو خلیج بنگال میں جا گرتے ہیں، ہر سال لاکھوں ٹن کھاد پھیلا کر زمین کی زرخیزی بڑھاتے ہیں۔ ہزاروں ندیاں ہیں جو آمد و رفت کا ذریعہ ہیں۔ البتہ گاہے گاہے تند طوفان، موسلا دھار بارش اور خلاف معمول سیلاب وسیع علاقوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ زمین کی زرخیزی اور گرم مرطوب آب و ہوا نے سارے خطے کو سبزہ زار بنا دیا ہے۔ سب سے اہم فصلیں چاول اور پٹ سن ہیں۔ شمال اور مشرق کی جانب پہاڑی علاقوں میں چائے کاشت کی جاتی ہے۔ گرم ملکوں کے پھل مثلاً کیلا، اناس اور ناریل افراط سے ہوتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان (جواب بنگلہ دیش بن چکا ہے) دنیا بھر میں ایک گنجان ترین خطہ ہے۔ آبادی کی اوسط شرح 922 کس فی مربع میل ہے۔ بعض حصوں میں آبادی کی شرح ڈیڑھ ہزار کس فی مربع میل تک ہے۔

مغربی پاکستان منطقہ حارہ کے شمال میں واقع ہے، یہاں بارش کی اوسط سالانہ شرح 12 انچ ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اس کے وسیع علاقے صحرا یا بے آب و گیاہ پہاڑ ہیں جو زیادہ آبادی کی کفالت نہیں کر سکتے۔ اس میں آبادی کی اوسط شرح 138 کس فی مربع میل ہے۔ زراعت کا زیادہ تر انحصار نہری آب پاشی پر ہے۔ شمال میں اونچے پہاڑوں سے کئی دریا نکلتے ہیں جو بحیرہ عرب میں جا گرتے ہیں۔ جو علاقے ان دریاؤں کی نہروں سے سیراب ہوتے ہیں، ان میں زرعی خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ اگر کافی پانی میسر آ جائے تو زیرِ کاشت رقبہ کو دگنا کم کیا جا سکتا ہے۔ سیم اور تھور کی غارت گری سے زیرِ کاشت اراضی میں ہر سال 75 ہزار ایکڑ کی کمی ہو جاتی ہے اور وسیع علاقوں کی زرخیزی بھی کم ہو جاتی ہے۔ مغربی پاکستان کی بڑی فصلیں گندم اور کپاس ہیں۔ گنے، چاول، مکئی اور تمباکو کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ سنگتروں اور آموں کے باغات افراط سے ہیں۔

تقسیم کے وقت کلکتہ کے ہندوستان کو دیئے جانے سے مشرقی پاکستان کو عظیم نقصان پہنچا۔ غیر منقسم بنگال کے 90 فیصد صنعتی ادارے کلکتہ میں تھے یا اس کے قریبی علاقوں میں جو مغربی بنگال کا حصہ بن گئے۔ تقسیم کے وقت غیر منقسم بنگال کے صنعتی کارکنوں میں سے صرف 5 فیصد مشرقی پاکستان میں تھے۔ کارخانے، بنک، بیمہ کمپنیاں، تجارتی کوٹھیاں، مرکزِ مواصلات، بجلی گھر اور اعلیٰ درس گاہیں سب کے سب کلکتہ میں تھے، جو غیر منقسم بنگال کا دارالحکومت اور اس کی بڑی بندرگاہ تھا۔

غیر منقسم ہند کو دنیا بھر میں خام پٹ سن کی قریب قریب مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔ اس سنہری ریشہ کی 75 فیصد اور تمام تر اعلیٰ اقسام ان علاقوں میں پیدا ہوتی تھیں جو مشرقی پاکستان میں شامل ہوئے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہیں تھا اور گانٹھیں باندھنے والی مشینیں بھی چند ایک ہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی پٹ سن تقریباً تمام تر کلکتہ بھیج دی جاتی تھی، جہاں کی کثیر التعداد جیوٹ ملوں میں سے بوریاں یا پٹ سن کی دوسری مصنوعات تیار کی جاتیں یا گانٹھیں باندھنے کے بعد اسے بحری جہازوں کے ذریعے برآمد کر دیا جاتا تھا۔

پاکستان کا پہلا بجٹ فقط اس لحاظ سے وقیع نہیں تھا کہ وہ متوازن تھا بلکہ اس کی اصل اہمیت تھی کہ اس نے ثابت کر دیا کہ حکومت پاکستان کے پاس نہ صرف انتظامیہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی وسائل ہیں، بلکہ دفاع اور ترقی و تعمیر کے لیے [illegible]

پٹ سن ہی مشرقی پاکستان کی سب سے اہم زرآور فصل ہے اور کاشتکاروں کی خوشحالی کا انحصار، اس کی قیمت فروخت پر ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ بڑی حد تک کلکتہ کی منڈی کے اتار چڑھاؤ کے رحم و کرم پر ہوتے تھے جہاں سٹہ بازی اور برآمد کنندگان پٹ سن کے کاشتکاروں کی کمائی سے ہاتھ رنگتے تھے۔

تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان میں صرف ایک بندرگاہ چٹاگانگ میں تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی اور اس میں سالانہ پانچ لاکھ ٹن سامان کی درآمد برآمد کی گنجائش تھی۔ اس کی استعدادِ کار کی توسیع اور ذرائع مواصلات کا رخ اس کی طرف موڑنے کے لیے سالہا سال درکار تھے۔ اس دوران میں پٹ سن اور مشرقی پاکستان کی دوسری پیداوار کو باہر بھیجنے کے کے لیے کلکتہ کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ پٹ سن کی برآمد پر محصول وصول کیا جاتا تھا، جس سے حکومت ہند اور بنگال کی صوبائی حکومت کو معتدبہ آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ تقسیم کے وقت پاکستان کے نمائندوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کم از کم عبوری دور کے لیے محصولات اور مرکزی محاصل ایکسائز کی آمدنی ایک ہی جگہ جمع کی جائے اور پھر اسے دونوں مملکتوں میں منصفانہ بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ ہندوستانی نمائندے یہ بات نہ مانے اور مصر ہوئے کہ ہر ڈومینین اپنے علاقے سے حاصل ہونے والی آمدنی اپنی تحویل میں ہی رکھے۔ نہ ہی وہ خاص پٹ سن کے لیے سمجھوتے پر رضامند ہوئے۔ چنانچہ حکومتِ پاکستان مشرقی بنگال سے سرحد پار مغربی بنگال جانے والی پٹ سن پر برآمدی محصول عائد کرنے پر مجبور ہو گئی اور لامحالہ ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو ایک لمبی سرحد پر محصول کی چوکیاں بٹھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مشکلات خاص طور پر زیادہ تھیں کیونکہ سرحد کے آر پار سینکڑوں آبی راستوں سے سمگلنگ کے بہت مواقع میسر تھے۔

مغربی پاکستان میں سب سے اہم زرآور فصل کپاس ہے اور اسے کم و بیش وہی حیثیت حاصل ہے جو مشرقی پاکستان میں پٹ سن کو ہے۔ مغربی پاکستان کا حصہ بننے والے علاقوں میں غیر منقسم ہند کی 40 فیصد کپاس پیدا ہوتی تھی، اس میں امریکی قسم کی بہترین درمیانہ درجہ کے ریشے والی کپاس بھی شامل تھی۔ غیر منقسم ہند میں پارچہ بافی کی صنعت ہی سب سے بڑی صنعت تھی، لیکن تقسیم کے وقت پارچہ بافی کے 394 میں سے 380 کارخانے ہندوستان میں تھے اور صرف 14 پاکستان میں۔ مغربی پاکستان میں پیدا ہونے والی روئی کا بیشتر حصہ ریل کے ذریعہ احمد آباد اور بمبئی میں پارچہ بافی کے مراکز میں بھیج دیا جاتا تھا اور یہاں کی بجائے وہاں سے پاکستان کو کپڑا آتا تھا۔

الغرض تقسیم کے وقت پاکستان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات کی نوعیت کم و بیش یہ تھی کہ اوّل الذکر خام مال بہم پہنچاتا اور مؤخر الذکر مصنوعات۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے مابین تجارتی لین دین کے اسلوب میں تغیر ناگریز تھا۔ لیکن پنجاب میں فسادات اور مغربی پاکستان اور شمالی ہندوستان کے درمیان تقریباً کامل تبادلہ آبادی سے تجارت اور آمد و رفت کے عام ذرائع ختم ہو گئے اور ان کی سمت مجبوراً بدلنی پڑی۔ روئی اور دوسری خام اشیا جو ریل کے ذریعہ ہندوستان کے صنعتی مراکز میں بھیجی جاتی تھیں، انہیں بیرونی دنیا میں بھیجنے کے لیے کراچی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ مغربی پاکستان کے لیے تمام درآمدات و برآمدات کی نقل و حمل کراچی کے ذریعہ

ہونے لگی اور اسے روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین تجارت کے فروغ سے ایک طرف کراچی اور دوسری طرف چٹا گانگ کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی پسماندہ تھے۔ لیکن دونوں میں سے پاکستان زیادہ پسماندہ اور غریب تر تھا۔ آبادی کے بیش تر حصے کے روزگار کا انحصار زراعت پر تھا۔ جس کے طور طریقے بہت پرانے تھے۔ 50-1949ء میں کل قومی سالانہ آمدنی 18 ارب 60 کروڑ روپے تھی جس کا 60 فیصد سے زائد حصہ زراعت سے حاصل ہوتا تھا۔ فی کس سالانہ آمدنی صرف 237 روپے تھی۔ اکثر لوگ بڑی تنگی سے گزر اوقات کرتے تھے۔ خشک سالی یا سیلاب کے زمانے میں قحط کا ڈر رہتا تھا۔ تعلیم اور طبی امداد کی سہولتیں ناکافی تھیں۔ زیادہ تر آبادی (87 فیصد) دیہات میں رہتی تھی۔ بمشکل 16 فیصد خواندہ تھے

آزادی کے بعد ملک کو جو اوّلین مسائل درپیش تھے، وہ انتظامیہ کا قیام اور مہاجرین کی آبادکاری ۔ یہ مسائل کس طرح حل کیے گئے، ان کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی ایک فوری مسائل تھے، جنھیں حل کرنا ضروری تھا۔

تقسیم کے وقت مغربی پاکستان فاضل اناج پیدا کرتا تھا۔ پنجاب کی نو آبادیوں سے ہند کے کم پیداوار والے علاقوں حتیٰ کہ انتہائی جنوب میں واقع مدراس تک کو گندم بھیجی جاتی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اس کی بنیادی غذا چاول کی کمی تھی۔ 1947ء کی گرمیوں میں مشرقی پاکستان کے اضلاع چٹا گانگ اور نواکھالی میں بلا کے سیلاب آئے، جن سے پانچ سو مربع میل علاقہ کو نقصان پہنچا۔ چاول کی ''اوس'' فصل کے علاوہ سیلاب سے متاثر شدہ علاقہ میں ''آمان'' فصل کے نوخیز پودے بھی تباہ ہوگئے۔ سال کے خاتمے تک ایک لاکھ ٹن اناج کی ضرورت تھی۔ جس میں سے 4 ہزار ٹن فوری طور پر درکار تھے۔ 1943ء کے قحط بنگال کی یاد ابھی لوگوں کے ذہن میں تازہ تھی۔ صورتِ حال اس قدر سنگین تھی کہ مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین 25 اگست 1947ء کو آزادی کے گیارہ دن بعد، رسد کا پختہ انتظام کرنے کے لیے کراچی آئے۔ خوش قسمتی سے مغربی پاکستان میں چاول کی فاضل مقدار موجود تھی لیکن اس کے حصول اور نقل وحمل میں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ مغربی پاکستان میں ریلوے کی بعض شاخوں پر کوئلے کی کمی کے باعث گاڑیوں کی آمد و رفت معطل کرنی پڑی تھی۔ جہاز بھی بہت کم یاب تھے۔ تاہم مغربی پاکستان سے اناج بروقت بھیجنے کا انتظام ہو ہی گیا۔ جنوری 1948ء کے بعد مغربی پاکستان کو بھی گندم کی قلت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تارکینِ وطن کی بے اندازہ آمد و رفت کا نتیجہ تھی۔ بعض اضلاع میں گندم بہت کم یاب ہوگئی۔ دوسرے ملکوں سے بھی فاضل گندم میسر نہیں تھی۔ بلکہ عالمی ادارۂ خوراک و زراعت کے ڈائریکٹر جنرل نے اگست 1948 میں جنیوا میں مندوبین کو متنبہ کر دیا تھا کہ آنے والے سرما اور بہار کے موسم میں یورپ میں لاکھوں افراد کو زمانہ جنگ سے بھی بدتر غذائی قلت کا سامنا کرنا ہوگا۔ خوراک کے معاملے میں 1948ء کا سارا سال تشویش میں گزرا۔ مغربی پاکستان میں 35 لاکھ ایکڑ اراضی سیلابوں سے متاثر ہوئی اور فصلِ خریف کی 6 لاکھ ٹن پیداوار تباہ ہوگئی۔ عموماً 4 لاکھ ٹن سالانہ پیداوار فاضل ہوتی تھی، اب اس کی بجائے کمی تھی۔ بایں ہمہ مشرقی پاکستان کو اناج پہنچانا انتہائی ضروری تھا۔ کیونکہ، وہاں سیلابوں سے بہت نقصان ہوا تھا۔ خوراک کے استعمال میں کفالت کے لیے اپیل کی گئی اور ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کی روک تھام کے لیے قانون نافذ کر دیا گیا۔ یہ احساس روز افزوں ہوتا گیا کہ خوراک کی صورتِ حال نازک ہے، ملک کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس لیے اناج کی پیداوار بڑھانے اور سیلابوں کی روک تھام کے لیے حفاظتی اقدامات کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ آبادی کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلی کا بھی خوراک کے مسئلہ پر اثر پڑا۔ سبزی خور ہندوؤں کی جگہ مسلمانوں نے لی جس سے گوشت کی کھپت بہت زیادہ ہوگئی اور مویشیوں کی نسل گھٹنے لگی جن پر نہ صرف کاشتکاری ہی بلکہ دودھ، گھی وغیرہ کی رسد کا انحصار تھا۔ چنانچہ ہفتہ میں دو دن کے لیے گوشت کے ناغہ کا اعلان کر دیا گیا۔

مواصلات کا مسئلہ غیر معمولی طور پر اہم تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مسافت فضا میں 1200 میل اور سمندر کے ذریعہ 3000 میل تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین رابطہ قائم کرنا ایک فوری ضرورت تھی۔ ریڈیو پاکستان کے قیام اور مناسب طاقت کے ایک ٹرانسمیٹر کے حصول کا کام تقسیم کے ایام میں ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ فضائی اور بحری مواصلات کی ضرورت بھی کچھ کم نہ تھی۔ کراچی میں بین الاقوامی فضائی اڈہ تھا، جس نے پاکستان کا بیرونی دنیا سے رابطہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ڈھاکہ بین الاقوامی فضائی راستہ پر واقع نہیں تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اپنی فضائی سروس لازمی تھی۔ اس ضرورت کو ایک چھوٹی سی فضائی کمپنی اورینٹ ایئرویز نے پورا کیا۔ اس نے اپنا صدر دفتر کلکتہ سے کراچی میں منتقل کرلیا اور مرمت کی سہولتوں کا کچھ نہ کچھ انتظام کرلیا۔ 1948ء میں ایک اور نجی فضائی کمپنی پاک ایئر قائم ہوئی۔ اس کمپنی کا قیام وزیر خزانہ غلام محمد کی تحریک کا مرہون منت تھا۔ غلام محمد چند سال پہلے حیدر آباد کے وزیر خزانہ رہ چکے تھے، وہ بہت خواہاں تھے کہ نظام اپنے سونے جواہرات اور نقدی کے سارے وسیع خزانہ کو نہیں تو کم از کم اس کے ایک حصہ کو حفاظت کے لیے طیاروں کے ذریعے کراچی میں منتقل کر دے۔ وہ حیدر آباد گئے، لیکن نظام کو اس پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے نظام کو اپنی دولت اتنی عزیز تھی کہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور بھیجنے پر رضامند نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد میں نظام کا سارا خزانہ حکومت ہندوستان نے ہتھیا لیا۔ تاہم غلام محمد کو اتنی کامیابی ضرور ہوگئی کہ پاک ایئر کے سرمایے کے لیے انھیں حیدر آباد سے کافی رقم مل گئی۔ لیکن یہ کمپنی بدانتظامی کا شکار ہوگئی اور چند حادثات کے بعد اس کا کاروبار بند ہوگیا، ان حادثات میں کئی قیمتیں جانیں ضائع ہوگئیں۔ ان میں پاکستانی فوج کے دو قابل ترین افسر میجر جنرل محمد افتخار خان اور بریگیڈیئر شیر خان بھی تھے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تجارت نے لازماً فروغ پانا تھا لیکن بعض خاص ضروریات مثلاً مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کو خوراک اور نمک کی ترسیل فوری طور پر درکار تھی۔ اس زمانے میں تجارتی جہازوں کے بیڑے کا تو ذکر ہی کیا، استعمال شدہ جہاز بھی آسانی سے نہیں ملتے تھے۔ جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں ہر قسم کی بھاری مشینری بہت کم یاب تھی۔ برطانیہ، مغربی یورپ، روس اور جاپان کی جنگ زدہ معیشت کی بحالی و تعمیر دوسرے تقاضوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ نئے اور ترقی پذیر ملکوں کو اپنے آرڈر قبول کرانے میں بڑی دشواری اور تاخیر کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کی تعمیل کی تاریخ غیر معمولی طور پر لمبی ہوتی تھی۔ یہ تھا وہ پس منظر، جس میں پاکستان کو اپنی معیشت کو رواں دواں کرنا تھا۔

کلکتہ اور اس کی سہولتوں سے محروم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ مواصلات اور برقی طاقت کے ایسے بنیادی ڈھانچہ کی تخلیق تھا، جس کی اساس پر معاشی تعمیر و ترقی کو فروغ دیا جا سکتا۔ بنفسہٖ بھی اور علی الخصوص اس زمانے کے حالات میں یہ ایک تدریجی اور طویل عمل تھا۔ اولیں کام چٹا گانگ کی بندرگاہ کو جدید خطوط پر ترقی دینا اور اس کی توسیع کرنا تھا۔ مرکزی حکومت نے جن بڑے منصوبوں کو منظور کیا، یہ ان میں سہرفہرست تھا لیکن افسوس کہ منظوری اور عمل درآمد میں کافی وقفہ ناگریز ہوتا تھا۔ قابل مشیروں کے تقرر، جائزوں کی تکمیل، ڈیزائنوں اور تخمینوں کی تیاری سب میں وقت لگتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ریلوے

کی پٹڑیاں اور انجن دوسری جنگ عظیم میں برما محاذ کے لیے فوجی رسد اور فوجوں کی بھاری نقل وحمل کے باعث بری طرح گھس چکے تھے۔ وسیع پیمانہ پر نئے ساز وسامان کی ضرورت تھی۔ کوئلے کی کمی بھی نازک صورت اختیار کر رہی تھی۔ دریائی مواصلات جو مشرقی پاکستان کی معیشت میں بہت اہمیت رکھتے تھے، ابتر حالات میں تھے۔ جوائنٹ سٹیم شپ کمپنی جو سب سے بڑا مواصلاتی ادارہ تھا، اس کے صدر دفاتر کلکتہ میں تھے اور اس وجہ سے کئی مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔

مغربی پاکستان میں صورت حال نسبتاً بہتر تھی۔ پنجاب اور اس کے ہمسایہ علاقوں میں نہایت وسیع فسادات سے پیدا شدہ بدنظمی کے باوجود نارتھ ویسٹرن ریلوے مہاجرین کی بے پایاں آمد ورفت کے مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ کراچی کی بندرگاہ میں اگرچہ مرمت اور توسیع درکار تھی لیکن فوری ضروریات پوری کرنے کے لیے وہ کافی تھی۔

سڑکوں کے معاملے میں بھی مغربی پاکستان کی حالت مشرقی پاکستان کے مقابلہ میں بہتر تھی۔ مغربی پاکستان میں سڑکوں کا سلسلہ برصغیر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا، ایک حد تک اس کی وجہ فوجی تقاضے تھے۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں ایک تو پتھر کم یاب ہے اور دوسرے وہاں ہموار میدان میں بے شمار ندیاں چکر کھاتی ہوئی بہتی ہیں۔ اس لیے سڑکوں کی تعمیر ایک مشکل اور گراں کام ہے۔ چنانچہ وہاں اندرونی آمد ورفت کی بیشتر ضروریات کشتیوں سے ہی پوری ہوتی ہیں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں میں برقی قوت کی کمی تھی۔ مغربی پنجاب میں وسیع علاقے کو مشرقی پنجاب میں واقع منڈی ہائیڈرو الیکٹرک ورکس سے بجلی بہم پہنچائی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد بجلی کا یہ ذریعہ قابلِ اعتماد نہ رہا۔ تقسیم کے وقت ملک بھر میں کل نصب شدہ قوت 75,028 کلوواٹ تھی، لیکن مرمت اور موزوں عملہ کی کمی کے باعث کارگر قوت اس سے بہت کم تھی۔ مشرقی پاکستان میں نصب شدہ قوت صرف 15,600 کلو واٹ تھی۔ کرنافلی ہائیڈرو الیکٹرک پروجیکٹ مستقبل میں توروشن امکانات کا حامل تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کئی سال درکار تھے۔ مغربی پاکستان میں بھی ہائیڈرو الیکٹرک منصوبوں کے لیے سروے کیے گئے اور چند سال بعد شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں وارسک پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا گیا۔ موجودہ ضروریات صرف بھاپ سے چلنے والے بجلی گھروں سے پوری کی جا سکتی تھیں۔ لیکن یورپ میں جنگ کے بعد تعمیر نو کے تقاضے اتنے زیادہ تھے کہ کسی بھی نوعیت کی مشینری کی فرمائش پوری ہونے میں طویل مہلت درکار ہوتی تھی۔ مغربی پاکستان میں گھٹیا درجہ کا کچھ کوئلہ اور تیل کی معمولی مقدار بھی دستیاب تھی۔ مشرقی پاکستان ماضی میں اپنی ایندھن کی ضروریات ہندوستان سے پوری کرتا رہا تھا، اب اسے کوئلہ اور تیل کے حصول میں مسلسل مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

آزادی سے قبل پاکستان میں تیل اور معدنی ذخائر کا کھوج لگانے میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا تھا۔ ہند کے محکمہ طبقات الارض نے محض سرسری تحقیقات پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ایسی اور دوسری بے شمار مشکلات اور ہر قسم کی تنگی کے باوجود تعمیر وترقی کا کام شروع کیا گیا۔ تحریکِ پاکستان کے پیش نظر یہ مقصد بھی تھا کہ مسلمان علاقوں کے انسانی اور مادی وسائل کو فروغ دیا جائے تاکہ لوگوں کی اخلاقی فلاح اور مادی ترقی کا سامان ہو سکے۔ ان کے لیے مناسب معیارِ زندگی، رفاہِ عام کے کام اور مساوی مواقع ترقی مہیا ہوں اور آمدنی اور املاک کی زیادہ سے زیادہ منصفانہ تقسیم ہو سکے۔ ان معاشرتی اور معاشی مقاصد کی بنیادیں سماجی انصاف اور انسانی اخوت کے اسلامی اصولوں پر استوار تھیں۔ ان مقاصد کے حصول اور فروغ میں حصہ لے کر ہی حکومت عوام کی دلی آرزوؤں کو پورا کر سکتی تھی اور یہ کام نہ صرف سرانجام دینا تھا بلکہ اسے حتی الوسع جلد از جلد ثمر آور بھی بنانا تھا۔ صدیوں تک جو غفلت برتی گئی تھی، اگر سالوں میں نہیں تو اس کی تلافی عشروں میں کی جانی تھی۔ اتنے عظیم کام کے لیے جو مالی اور معاشی وسائل میسر تھے، وہ بہت ناکافی تھے اور انکل پچو طریق پر فضول خرچی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جہاں یہ ضروری تھا کہ عوام کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھارا اور بروئے کار لایا جائے وہاں حکومت کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ پالیسی کی ترتیب اور سرکاری اور نجی مساعی میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے مثبت اور تعمیری کردار ادا کرے۔ ریلوے، تار اور ٹیلی فون، بندرگاہیں، دفاعی تاسیسات، آب پاشی کے ہیڈ ورکس، نہریں اور جنگلات حکومت کی ملکیت تھے۔ کئی اور شعبے بھی تھے جن میں سرمایہ کی کمی یا گھاٹے کے خوف سے لوگ سرمایہ لگانے سے جھجکتے تھے۔ مثال کے طور پر ڈھاکہ میں صوبائی حکومت کو مرکزی حکومت سے قرضہ لے کر ایک ہوٹل تعمیر کرنا پڑا۔ پاکستان کے معاشی نظام میں لامحالہ قوی اور نجی سرمایہ دونوں نے منصوبہ بندی کے تحت پہلو بہ پہلو کام کرنا تھا لیکن حکومت کی سوچھی سمجھی پالیسی زیادہ سے زیادہ آزاد کاروبار کے حق میں تھی۔

اوائل 1948ء میں ایک ترقیاتی بورڈ قائم کیا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ منصوبوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ تعمیری سکیموں کا تقدم متعین کرے اور ان کی رفتار ترقی کے بارے میں وقتاً فوقتاً حکومت کو رپورٹیں پیش کرے۔ اس بورڈ کا صدر وزیر امور اقتصادیات تھا۔ اس کے ساتھ منصوبہ بندی کا ایک مشاورتی بورڈ بھی قائم کر دیا گیا۔ جو مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے افسروں اور نجی شعبہ کے نمائندوں پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ کا کام منصوبہ بندی کے معاملے میں حکومت کو مشورہ دینا اور ترقیاتی مساعی کے لیے عوامی تعاون کو فروغ دینا تھا۔ منصوبہ بندی کے مشاورتی بورڈ کی مدد کے لیے کئی کمیٹیاں تھیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے قائم کی تھیں۔ 1950ء میں جب کولمبو منصوبہ کے تحت پاکستان کے لیے ایک چھ سالہ ترقیاتی پروگرام مرتب کیا گیا تو وزیر اعظم کی صدارت میں ایک اقتصادی کونسل بھی قائم کر دی گئی۔ اس ابتدائی زمانے میں اس طریقہ کار سے ترقی کی یہ مساعی کافی مفید ثابت ہوئیں، لیکن باقاعدہ طور پر ایک مربوط منصوبہ اس وقت تیار ہوا، جب 1953ء میں منصوبہ بندی کا علیحدہ ادارہ قائم کیا گیا۔

ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت جو کہ ملک کا عبوری آئین تھا، صنعت وحرفت ایک صوبائی محکمہ تھا، لیکن منصوبہ بندی کے تحت ملک کی سریع ترقی کا تقاضا یہ تھا کہ کلیدی صنعتیں مرکزی حکومت کے زیر نگرانی ہوں۔ مرکزی حکومت کے زیر اہتمام دسمبر 1947ء میں منعقد ہونے والی ایک صنعتی کانفرنس نے بعض بنیادی صنعتوں کے قیام کی سفارش کی اور مطلوبہ صنعتی پیداوار کی مقداریں بھی متعین کیں۔ اپریل 1948ء میں حکومت پاکستان نے اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا۔ یہ پالیسی زیر نظر رہتی تھی اور حسب ضرورت اس میں ترمیم کر دی جاتی تھی۔ اس پالیسی میں یہ قرار پایا کہ پاکستان کو پہلے پہل اپنے خام مال سے وہ اشیاء تیار کرنی چاہئیں، جن کے لیے ملک کے اندر یا باہر یقینی مانگ موجود ہے۔ ان میں پٹ سن اور کپاس سب سے اہم تھیں اور سب سے پہلے ان ہی کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ خیال کیا گیا کہ پٹ سن کی صنعت سے ملک کی زرمبادلہ کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور سوتی مصنوعات سے نہ صرف لوگوں کی ایک بنیادی ضرورت پوری ہوگی بلکہ زرِمبادلہ کی بچت بھی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومت ''ہر ایسی بھاری صنعت کو ترقی دے گی، جسے ایک مضبوط اور متوازن معیشت کے جلد از جلد حصول کے لیے ضروری سمجھا جائے گا''۔ تین قسم کی صنعتیں سرکاری ملکیت کے لیے مخصوص کر دی گئیں، اسلحہ اور گولہ بارود، پن بجلی اور ریلوے، ٹیلی فون، تار اور وائرلیس کے ساز وسامان کا بنانا اور چلانا۔ باقی سارا میدان نجی مساعی کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ لیکن

حکومت ذمہ دار تھی کہ ''محنت کشوں کے ساتھ آجر مصنفانہ سلوک کریں گے۔ بالخصوص اوقاتِ کار، اجرتوں، کام اور ملازمت کی شرائط میں''۔

27 صنعتوں کی منصوبہ بندی مرکزی حکومت نے کرنی تھی۔ ان میں لوہا اور فولاد، ضخیم انجینئرنگ، مشینی اوزار، ثقیل کیمیات، سیمنٹ، معدنیات اور معدنی تیل، چینی، پارچہ بافی اور تمباکو کی صنعتیں شامل تھیں۔ حکومت نے یہ حق بھی اپنے لیے محفوظ رکھا کہ وہ ملک کے تحفظ یا بہبود کے لیے ضروری صنعتوں کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے یا ان میں شرکت کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ قومی اہمیت کو کسی خاص صنعت کی ترقی کے لیے نجی سرمایہ خاطر خواہ مقدار میں نہ لگایا جا رہا ہو۔

اسی پالیسی میں اعلان کیا گیا کہ ''پاکستان ہر ایسے غیر ملکی سرمایہ کا خیر مقدم کرے گا، جس کا مقصد خالصتاً صنعتی اور معاشی ہو اور جو کسی خاص رعایت کا طالب نہ ہو''۔ سالانہ منافع کی ترسیل اور لگا ہوا سرمایہ مع بکار آمدہ منافع واپس لیے جانے کا بھی یقین دلایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اگر کسی صنعتی ادارہ کو قومی ملکیت میں لیا گیا ہو تو اس کا منصفانہ معاوضہ ادا کیا جائے گا جسے واپس لے جانے کی اجازت ہوگی۔ تیرہ متعین صنعتوں میں لازماً 51 فیصد مقامی سرمایہ لگایا جائے گا اور باقی میں 30 فیصد۔ لیکن اگر مقامی سرمایہ کی مطلوبہ رقم میسر نہ ہو سکی تو پھر حکومت کی منظوری سے باقی رقم بھی غیر ملکی سرمایہ کار لگا سکیں گے۔ بعد میں مقامی سرمایہ کی حد کو گھٹا کر 40 فیصد کر دیا گیا۔ تیل اور گیس کی تلاش میں غیر ملکی کمپنیوں کی بالخصوص حوصلہ افزائی کی گئی۔

صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے حکومت نے بنیادی ارتفاقات، حفاظت محصولات اور مالی ترغیبات کے ذریعے ہر ممکن مدد دی۔ ان ارتفاقات میں معدنی وسائل کا سروے، برقی طاقت کی پیداوار میں توسیع، ذرائع مواصلات کی بہتری، مشینری اور خام مال کے حصول میں اعانت اور صنعتی مقاصد کے لیے اراضی کے حصول میں مدد بھی شامل تھیں۔ علاوہ ازیں فنی تعلیم کا فروغ، سائنس اور صنعتی تحقیقات اور صنعتی تجارتی املاک کی تعمیر بھی ان سہولتوں میں شامل تھیں۔ پہلے بجٹ میں ہی ٹیکس کی کئی رعایات کا اعلان کیا گیا۔ مثلاً نئے صنعتی اداروں میں لگائے ہوئے سرمایہ پر پہلے پانچ سال کے لیے پانچ فیصد تک منافع کو انکم ٹیکس، سوپر ٹیکس اور کاروباری منافع ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ نئی مشینری اور اس کے متعلقات پر کاہش بہا کی آغازی شرح 20 فیصد اور صنعتی مقاصد کے لیے نئی تعمیرات پر 15 فیصد کر دی گئی۔ یہ آغازی کاہش بہا گویا حکومت کی طرف سے صنعتی اداروں کے لیے بلاسود قرضہ تھی۔ متوسط اور طویل المیعاد صنعتی قرضے دینے کے لیے 1949ء میں حکومت نے ایک صنعتی مالیاتی کارپوریشن قائم کی۔ جس کے دو کروڑ روپے کے سرمایہ کا 51 فیصد حکومت نے لگایا اور باقی رقم کے لیے عام لوگوں کو دعوت دی گئی۔

ان مراعات کے باوجود سرمایہ دار اور کاروباری لوگوں کا صنعت کی طرف رجحان توقع سے بہت کم تھا۔ اس کی وجہ کسی حد تک تو انتظامی قابلیت اور فنی مہارت کی کم یابی تھی۔ یہ پسماندہ ملکوں کی ایک عام کمزوری ہے۔ لیکن اصل اور اہم وجہ فوری اور زیادہ منافع کی وہ کشش تھی جو تجارت میں کمایا جا سکتا تھا۔ ہندو تاجروں کے واپس جانے سے کاروبار میں رخنہ پڑ گیا تھا، اس کی تلافی بڑی تیزی سی ہو رہی تھی۔ پاکستانی خام اشیاء کی دوسرے ملکوں میں بڑی اچھی مانگ تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں درآمدات پر جو سخت پابندیاں عائد کی گئی تھیں، ان کی وجہ سے اشیائے صرف کی مانگ بہت چڑھ گئی تھی۔ اگست 1948ء میں جب درآمدی پالیسی میں فراخدلی سے کام لیا گیا تو درآمدات جو کہ سال کے پہلے نصف میں 11 کروڑ 50 لاکھ روپے تھیں، اس سے بڑھ کر سال کے دوسرے نصف حصہ میں 31 کروڑ روپے تک جا پہنچیں۔ درآمدات کا ایک تہائی حصہ سوتی پارچات اور سوت پر مشتمل تھا۔ ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں تھی کہ جو سرمایہ بھی میسر تھا اس نے صنعت کے بجائے تجارت کا رخ کر لیا۔ حکومت نے ایک سرمایہ کاری کی تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جو اس امر کی تفتیش کرے اور چارۂ کار تجویز کرے۔ مستقبل کے صنعت کاروں

پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی

- پہلا پنج سالہ منصوبہ (1955ء-1960ء)۔ اس منصوبے کا تخمینہ دس ارب اور 80 کروڑ روپے لگایا گیا۔ اس میں سے سرکاری شعبے میں 750 کروڑ اور نجی شعبے میں 330 کروڑ روپیہ لگانے کا ہدف مقرر کیا گیا۔
- دوسرا پنج سالہ منصوبہ (1960ء-1965ء)۔ اس منصوبے کے لیے 23 ارب روپے مخصوص کیے گئے جن میں سے سرکاری شعبے میں چودہ ارب چھ کروڑ 20 لاکھ روپے اور نجی شعبے میں آٹھ ارب تین کروڑ 80 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کا اعلان کیا گیا۔
- تیسرا پنج سالہ منصوبہ (1965ء-1970ء)۔ اس منصوبے کے لیے 52 ارب مختص کیے گئے۔ 30 ارب سرکاری شعبے میں اور 22 ارب نجی شعبے میں۔
- چوتھا پنج سالہ منصوبہ (1970ء-1975ء)۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو اور اُن کی پیپلز پارٹی کا عہد حکومت تھا۔ اِس عہد میں غیر معمولی سیاسی حالات کے سبب پنج سالہ منصوبہ سازی پر توجہ نہ دی جا سکی۔
- پانچواں پنج سالہ منصوبہ (1978ء-1983ء)۔ اس منصوبے کے لیے 202 ارب روپے کا ہدف مقرر کیا گیا۔ 148 ارب سرکاری شعبے میں اور 62 ارب نجی شعبے میں۔
- چھٹا پنج سالہ منصوبہ (1983ء-1988ء)۔ یہ منصوبہ پانچویں منصوبے کی نسبت 109 فیصد بڑا تھا۔ اس منصوبے کے لیے 495 ارب روپے کا ہدف مقرر کیا گیا۔ 295 سرکاری اور 200 نجی شعبے میں۔
- ساتواں پنج سالہ منصوبہ (1988ء-1993ء)۔ اس منصوبے کا حجم 682 ارب روپے مختص کیا گیا تھا' اس میں سرکاری شعبے میں 332.3 ارب' جبکہ نجی شعبے میں 349.7 ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔
- آٹھواں پنج سالہ منصوبہ (1993ء-1997ء)۔ اِس منصوبے کا ہدف 1700.5 ارب روپے مقرر کیا گیا تھا' جن میں سے 948.4 ارب روپے نجی شعبے کے لیے اور 752.1 روپے سرکاری شعبے کے لیے متعین کیے گئے۔
- دس سالہ ترقیاتی منصوبہ (2001ء تا 2010ء)۔ اس منصوبے کا ہدف 17 کھرب 28 ارب 70 کروڑ لگایا گیا ہے۔ اِس منصوبے میں پہلی مرتبہ انسانی وسائل کی ترقی پر 31 فی صد رقم خرچ کرنے کا اعلان کیا گیا۔

سے حبِ وطن کے نام پر بھی بار بار اپیل کی گئی۔ لیکن اس کا اس وقت تک کوئی اثر نہ ہوا، جب تک ایسے اقتصادی حالات پیدا نہ کر دیئے گئے، جن میں صنعت بھی تجارت کی طرح منفعت بخش ہوگئی۔ جنگ کوریا کے ختم ہونے کے بعد جب خام اشیاء کی قیمتیں بڑی تیزی سے گر گئیں تو اس سے پاکستان کی زرِ مبادلہ کی آمدنی بھی بہت گھٹ گئی۔ چنانچہ پہلے سالوں کی تاروا طور پر فراخدلانہ درآمدی پالیسی جس کے تحت صنعتی مشینری سے کہیں زیادہ اشیاء صرف منگوائی جاتی تھیں 1952ء میں اس پر سختی سے نظر ثانی کی گئی اور اس کا رخ نئی صنعتوں کے لیے مشینری وغیرہ کی درآمد کی طرف پھیر دیا گیا۔ غیر ملکی کپڑے اور دوسری اشیاء صرف کی درآمد پر پابندیوں سے مقامی صنعتی پیداوار کو تحفظات بھی ملے اور محرکات بھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ تجارت سے صنعت کی طرف بہنے لگا۔ اسی زمانہ یعنی جنوری 1952ء میں پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن بھی قائم کر دی گئی تاکہ قومی اہمیت کی ایسی صنعتوں کی تاسیس کی جاسکے جن میں نجی سرمایہ نہیں لگایا جا رہا تھا۔ اس کارپوریشن میں سارا سرمایہ مرکزی حکومت نے لگایا تھا۔ غلام فاروق کی سرگرم سربراہی میں اور ان وسیع مسائل کی مدد سے جو حکومت پاکستان نے باوجود سخت مالی تنگی کے اسے مہیا کیے' اس کارپوریشن نے ملکی صنعتی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ کارپوریشن نے خود پہل کر کے اور نجی سرمایہ کی شرکت کے ساتھ پٹ سن کی صنعت کو فروغ دیا۔ اس نے کرنافلی پیپر مل اور سیمنٹ، چینی اور کیمیائی کارخانوں کے علاوہ جہاز سازی کے ادارے بھی قائم کیے۔ نجی اور سرکاری مساعی کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ 1952ء سے 1955ء تک چار سالوں میں صنعتی پیداوار میں 100 فیصد سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔ معاشی ترقی کی یہ رفتار کسی بھی دور میں کسی بھی ملک کے لیے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

زراعت ایک صوبائی شعبہ تھا۔ یہ شعبہ نہ صرف صنعتوں کے لیے خام مال اور آبادی کے لیے خوراک کی ضروریات پوری کرتا تھا بلکہ کم و بیش سارا زرِ مبادلہ بھی اسی شعبہ سے حاصل ہوتا تھا اور آبادی کی اکثریت کے لیے ذریعہ معاش بھی یہی شعبہ تھا۔ مرکزی حکومت نے اس کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضوں اور عطیات کی صورت میں مدد بہم پہنچائی۔ آب پاشی کے منصوبے مثلاً مغربی پاکستان میں تھل پروجیکٹ اور مشرقی پاکستان میں گنگا کبادک پروجیکٹ زراعت کی ترقی کے لیے نہایت ضروری تھے۔ کام میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور فنی امداد دینے کے لیے حکومت پاکستان نے سنٹرل انجینئرنگ اتھارٹی قائم کر دی۔ حکومتِ پاکستان نے لارڈ بائیڈار کی صدارت میں ایک زرعی تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کی۔ مرکزی حکومت نے زرعی ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن بھی قائم کی۔ لیکن زراعت کی بنیادی ذمہ داری صوبائی حکومتوں کی تحویل میں رہی اور انھوں نے بدقسمتی سے اس کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی۔

مشرقی پاکستان میں اور مغربی پاکستان کے بیشتر علاقوں میں عام طور پر زرعی املاک قلیل اور اقتصادی لحاظ سے ناکافی تھیں اور آبادی بڑھنے سے حصے بخروں میں تقسیم ہو کر اور بھی کم ہوتی جا رہی تھیں۔ اشتمال اراضی ایک فوری اور اہم ضرورت تھی۔ مشرقی پاکستان میں جو آبادی کے اعتبار سے دنیا بھر میں ایک گنجان ترین علاقہ تھا' زمین کی شدید قلت تھی۔ وہاں اراضی سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مصنوعی آب پاشی سے موسم سرما میں ایک اور فصل حاصل کی جاتی۔ ایک بڑی اور بڑھتی ہوئی آبادی زمین کے محدود وسائل پر صرف اسی طرح بسر اوقات کر سکتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ فصلیں کاشت کی جاتیں۔ زراعت کو سائنسی خطوط پر ترقی دی جاتی اور اسے گھریلو دستکاریوں اور اوسط درجہ کی صنعتوں سے مربوط کیا جاتا۔ اس کام کے لیے ملک بھر کے دیہات میں بجلی کی بہم رسانی ناگزیر تھی۔ جہاں ملکیتیں اتنی چھوٹی ہوں کہ ان پر گزارہ مشکل ہو اور کسان اتنے غربت زدہ ہوں کہ اکیلے اکیلے نہ کسی برے وقت کا سامنا کر سکیں اور نہ قرض حاصل کر سکیں' تو وہاں امداد باہمی اور اجتماعی جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا لازمی ہے۔

آزادی کے بعد پہلے چند سالوں میں زراعت کی ترقی کے مسائل کی وسعت اور پیچیدگیوں کا پوری طرح احساس نہیں کیا گیا۔ بارش معمول کے مطابق ہوتی تھی۔ ملک خوراک میں خود کفیل تھا۔ لیکن کتنی تھوڑی حد تک؟ اس پر بہت کم لوگ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ بنیادی زرآور فصلوں پٹ سن اور کپاس کی معقول قیمتیں مل جاتی تھیں اور ان میں اضافہ کا رجحان بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جس کساد بازاری کا اتنا اندیشہ تھا، وہ وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان سے ہندو ساہوکاروں کے چلے جانے سے قرضے کا عظیم بار تقریباً رفع ہو گیا تھا اور اس پر کاشت کاروں نے فوری طور پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد دیہی قرضہ کی سہولتوں میں کمی کا احساس ہوا۔ ہندوستان کی طرف سے نہری پانی بند کر دینے سے مغربی پنجاب کو دھچکہ ضرور لگا تھا۔ لیکن یہ ایک خارجی خطرہ تھا اور اس کی نوعیت اندرونی مسائل مثلاً نظامِ لگان داری یا سیلاب اور سیم سے کافی مختلف تھی۔

مشرقی پاکستان میں لارڈ کارنوالس نے 1793ء میں بنگال کا بندوبست دوامی کر کے زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کر دیا تھا، جو بیشتر ہندو تھے، وہ حکومت کو مالیہ کی ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے لیکن کاشت کار سے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ لگان حاصل کرنے میں انھیں چھوٹ تھی۔ زمیندار اپنی اراضی کسی لگان دار کو پٹے پر دے دیتا تھا، جو لگان وصول کرنے کے لیے آگے کسی اور کو مامور کر دیتا تھا اور اس طرح کاشتکار کی محنت سے کئی ایک گلچھرے اڑتے تھے۔ زرعی اصلاحات کے لیے کئی مرتبہ پرزور آواز بلند کی گئی تھی لیکن مقتدر زمیندار کا طبقہ سیاسی اثر و رسوخ سے اسے صدا بصحرا بناتا رہا۔ 1940ء میں بنگال کے زرعی مالیہ کمیشن کی اس سفارش کے باوجود کہ بندوبست دوامی کو منسوخ کر دیا جائے، انگریزی راج کے خاتمہ تک یہ نظام کسی تبدیلی کے بغیر نافذ رہا۔ قیام پاکستان کی بدولت ان زرعی اصلاحات پر عمل درآمد ممکن ہوگیا، جن کی ضرورت عرصہ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ مشرقی بنگال کے قانون مجریہ 1950ء نے بندوبستِ دوامی کو منسوخ کر دیا اور کاشتکار اور حکومت کے مابین براہِ راست روابط قائم کر دیئے۔ لیکن کئی اور مسائل پیدا ہو گئے مثلاً جوار بھاٹا کی لہروں اور دریاؤں کے کٹاؤ سے حفاظت کے لیے بندوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ۔ تنسیخ زمینداری کے بعد ان بندوں کی مرمت نہ ہو سکی۔ کیونکہ ان کی دیکھ بھال کے لیے کاشتکاروں کے پاس نہ مالی وسائل تھے اور نہ قوت تنظیم۔

مغربی پاکستان میں خود کاشت کاروں کا بہت بڑا طبقہ موجود تھا جو اپنی زیر کاشت اراضی کے خود مالک تھے، لیکن بڑے زمیندار بھی موجود تھے۔ خاص طور پر سندھ اور پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے بعض علاقوں میں زرعی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔

مغربی پاکستان کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ سیم اور تھور کا ہے جو دیہی علاقوں میں سرطان کی طرح پھیل رہا تھا۔ اس سے متاثر ہونے والے وسیع علاقوں کی بحالی اور اس کی مزید تباہ کاریوں کی روک تھام کے لیے پمپوں اور پانی کے نکاس کے لیے نالیوں کے بہت وسیع نظام کی ضرورت تھی، مزید برآں تازہ پانی بھی بڑی مقدار میں درکار تھا تاکہ سطح زمین کو شورہ سے پاک کیا جاتا۔

تعلیم کا بھی صوبائی محکمہ تھا۔ حصولِ آزادی کا ایک اثر یہ ہوا کہ تعلیم کے تقاضے بہت بڑھ گئے، لیکن صوبائی حکومتیں ان سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکیں۔ ہندو اساتذہ کے جانے سے معلمین کی تعداد گھٹ گئی اور عارضی طور پر تعلیم کو دھچکا لگا۔ مرکزی حکومت نے تعلیم کے معاملے میں رہنمائی

بھی کی اور یونیورسٹیوں اور فنی تعلیم کے لیے گرانٹیں بھی دیں۔ کراچی وفاقی علاقہ تھا، وہاں تعلیم کی ذمہ داری حکومتِ پاکستان پر عائد تھی۔ اس نے کراچی یونیورسٹی کو قائم کیا۔ سائنسی وصنعتی تحقیقات کی ایک کونسل بنائی۔ جس کی مرکزی تجربہ گاہ کراچی میں تھی اور مشرقی ومغربی پاکستان میں علاقائی تجربہ گاہیں تھیں۔

اسی طرح صحتِ عامہ بھی صوبوں کی ذمہ داری تھی اور مرکزی حکومت کا کام صرف مشورہ اور تطبیق یا انسدادِ ملیریا ایسے منصوبوں کے لیے اعانت تک محدود تھا۔ شہروں میں آبادی کی افراط نے رہائش کی جو قلت پیدا کردی تھی، اسے دور کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی۔

معاشرتی اور معاشی ترقی کے ان مسائل کے علاوہ پاکستان کو دفاع کا بارگراں بھی درپیش تھا۔ اپنی جغرافیائی وضع کے اعتبار سے پاکستان برصغیر کی شمال مغربی اور شمالی مشرقی سرحدوں کا محافظ ہے۔ برصغیر نے بڑے حملے خواہ وہ زمانہ قبل از تاریخ میں آریاؤں کے تھے یا تاریخی دور میں سکندرِ اعظم اور دوسروں کے، وہ سب کے سب شمال مغرب کی طرف سے ہوئے تھے۔ البتہ دوسری جنگ عظیم میں برصغیر کو جاپان کی طرف سے خطرہ شمال مشرق سے ابھرا۔ لیکن پاکستان کی سلامتی کو سب سے بڑا خطرہ ہندوستان کی طرف سے تھا اور ہے۔

یہ تھا وہ پس منظر، جس میں 49-1948ء کے مالی سال کے لیے پاکستان کے وزیر خزانہ نے مارچ 1948ء میں ملک کا پہلا بجٹ پیش کیا۔ کیا دوست اور کیا دشمن سبھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ متوازن بجٹ تھا۔ برطانوی حکومت کے معمول کے مطابق ہندوستان اور پاکستان میں بجٹ دو حصوں میں منقسم ہوتا۔ مالیاتی بجٹ اور تعمیر وترقی کا بجٹ۔

15 اگست 1947ء سے 31 مارچ 1948ء تک کے ساڑھے سات مہینوں میں خسارہ ہوا تھا۔ لیکن اس عرصہ کے حالات یکسر غیر معمولی تھے۔ ایک نئی انتظامیہ کے قیام اور مہاجرین کے سیلاب نے حکومت پر بڑا بھاری مالی بار ڈال دیا تھا۔ مواصلات اور تجارت میں خلل کی وجہ سے کاروباری سرگرمیاں اور سرکاری آمدنی بہت کم ہوگئی تھی۔ تارکینِ وطن ٹیکسوں کے جو بقایا چھوڑ گئے تھے، وہ وصول نہیں کیے جاسکتے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ اقرار نامہ کے تحت ہر ڈومینین صرف اپنے علاقے میں جمع ہونے والے محاصل وصول کرنے کی مجاز تھی اور یہ بات پاکستان کے مفاد میں نہیں تھی۔ کیونکہ ٹیکسوں کی وصولی کاروباری اداروں کے صدر دفاتر سے ہوتی تھی اور ان میں سے اکثر ہندوستان میں واقع تھے۔ مزید برآں مرکزی ایکسائز کے محاصل ان مقامات سے وصول کیے جاتے تھے جہاں مصنوعات تیار ہوتی تھیں اور ہندوستان نے پاکستان کو ان اشیاء پر یہ محاصل ادا کرنے سے انکار کردیا جو پاکستان کو برآمد کی جاتی تھیں۔

پہلا بجٹ جو پورے سال کے لیے پیش کیا گیا وہ 49-1948ء کے لیے تھا اور وہ متوازن تھا۔ اس مقصد کے لیے غیر منقسم ہند کی وفاقی مالیات کی سکیم میں چند تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ مثلاً ریلوے بجٹ کو مرکزی بجٹ میں شامل کردیا گیا۔ اگرچہ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں دفاعی اہمیت کی حامل ریلوے لائنوں پر خسارہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نارتھ ویسٹرن ریلوے سے متعدبہ فاضل آمدنی حاصل ہورہی تھی' جبکہ ایسٹ بنگال ریلوے خسارہ پر چل رہی تھی۔ تاہم مجموعی حیثیت سے کاہش بہا کا اہتمام کرنے کے بعد بھی ریلوے سے منافع حاصل ہورہا تھا جسے عام محاصل آمدنی میں شامل کرلیا گیا۔ صوبوں سے مشورہ کرنے کے بعد سیلز ٹیکس کو بھی عارضی طور پر مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت یہ صوبوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔ اس سلسلہ میں صوبوں کے ساتھ یہ مفاہمت ہوئی تھی کہ جو آمدنی انھیں اس ٹیکس سے بطورِ خود حاصل ہوتی وہ انھیں بہرحال ادا کردی جائے گی۔ تقسیم سے قبل وفاقی مالیات کی باقی ماندہ سکیم برقرار رہنے دی گئی۔ 1936ء کے نیا ئرایوارڈ کے تحت پٹ سن پیدا کرنے والے صوبے، پٹ سن پر برآمدی محصول کے 62.5 فیصد حصہ کے حقدار تھے۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت کی طرف سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ایک کروڑ روپے کی اعانت ملا کرتی تھی۔ یہ ادائیگیاں بھی جاری رکھی گئیں۔

اخراجات کے ضمن میں دفاعی امور کے لیے 37.10 کروڑ روپے' دفاع کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے 8.3 کروڑ روپے مخصوص کیے گئے۔ اقتصادی ترقی وتعمیر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ریلوے اور ڈاک اور تار اور مرکزی حکومت کے دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے لیے دس کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی اور صوبائی حکومتوں کو ترقیات کے لیے ڈیڑھ کروڑ کے عطیات اور بارہ کروڑ کے قرضے دیئے گئے۔ یہ رقوم بڑی نہیں تھیں۔ لیکن آغاز تو کردیا گیا۔ آئندہ سالوں میں، جوں جوں آمدنی بڑھتی گئی، ترقیات کے لیے ان سے بہت بڑی رقوم مخصوص کی جانے لگیں۔

صوبائی حکومتوں نے بھی شدید دشواریوں کے باوجود اپنے وسائل کے اندر گزراوقات کا انتظام کرلیا۔ مشرقی بنگال کو چونکہ ایک نئی انتظامیہ کے ساتھ ہی ساتھ ڈھاکہ میں نیا دارالحکومت بھی قائم کرنا تھا، اس لیے اسے غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے پڑے۔ اگرچہ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی بنگال کے مقابلہ میں دگنی تھی، تقسیم کے وقت اس کی آمدنی مغربی بنگال سے آدھی تھی۔ یہ کلکتہ اور دوسرے ترقی یافتہ علاقوں کے پاکستان سے نکل جانے کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ مغربی بنگال نے مشترک اثاثہ جات سے مشرقی بنگال کا حصہ نہ دیا۔ حکومت ہندوستان نے بھی مختلف حیلوں بہانوں سے مشرقی بنگال کو 12 کروڑ روپے کی وہ خطیر رقم ادا کرنے سے انکار کردیا جو دوسری جنگِ عظیم میں زمینوں اور عمارات کو سرکاری تحویل میں لینے کے باعث واجب الادا تھی۔ بہ حیثیت مجموعی مشرقی پاکستان کو خاصی شدید مشکلات درپیش تھیں۔ مغربی پنجاب کی معیشت کو انتہائی وسیع فسادات اور عام تبادلۂ آبادی نے متحمل کردیا تھا۔ زراعت، تجارت، صنعت، مواصلات الغرض معاشی زندگی کے ہر شعبہ کو نقصان پہنچا تھا اور اس کی بحالی ضروری تھی۔

کیسی بلندی' کیسی پستی

پاکستان کا پہلا بجٹ برائے 1948-1949ء وزیر خزانہ ملک غلام محمد نے قیام پاکستان کے صرف سات ماہ کے بعد مارچ 1948ء میں پیش کیا۔ کیا دوست اور کیا دشمن' سبھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ متوازن بجٹ تھا۔ جبکہ موجودہ بجٹ برائے 08-2007ء سابق صدر ایوب خان کے پوتے عمر ایوب نے بطور وزیر خزانہ قومی اسمبلی میں جون 2007ء میں پیش کیا۔ یہ بجٹ خسارے کا بجٹ تھا۔ پہلے بجٹ کا حجم پانچ کروڑ 85 لاکھ 13 ہزار روپے تھا' اور جاریہ بجٹ کا حجم 18 کھرب 74 ارب روپے ہے۔ اُس وقت عوام میں بڑی آسودگی' طمانیت اور خوشحالی تھی' اور اب بہت بے چینی' ہوس اور بدحالی ہے۔

لاکھوں مہاجروں کو آباد کرنا تھا۔ بایں ہمہ معیشت کی بحالی تیز رفتاری سے ہوئی۔ سب صوبوں میں سے سندھ کی حالت اطمینان بخش تھی۔ اس کے زمین اور پانی کے وسائل بلحاظ آبادی بہت کافی تھے۔ سکھر بیراج سے وسیع علاقے سیراب ہوتے تھے اور کوٹری کے مقام پر ایک اور بیراج پایہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔

بہ حیثیت مجموعی حالت یہ تھی کہ صوبے موجودہ انتظامیہ کو تو برقرار رکھ سکتے تھے لیکن قومی تعمیر کے کاموں کے لیے ان کے وسائل ناکافی تھے۔ وہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے مابین محاصل آمدنی کی تقسیم کا ازسرنو جائزہ لینے اور اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا جائزہ 52-1951ء کے موسم سرما میں سرجیری ریز مین نے لیا، وہ غیر منقسم ہند میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا سابق فنانس ممبر تھا۔ اس نے جو سفارش پیش کیں وہ منظور کر لی گئیں۔

پاکستان کا پہلا بجٹ فقط اس لحاظ سے وقیع نہیں تھا کہ وہ متوازن تھا بلکہ اس کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس نے

ایک ہندوستانی وفد کے لیڈر نے کہا: ''آپ اپنی پٹ سن کا کیا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں؟ کیا آپ اسے نذرِ آتش کر دیں گے؟ یا خلیج بنگال میں پھینک دیں گے؟

ثابت کر دیا کہ حکومت پاکستان کے پاس نہ صرف انتظامیہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی وسائل ہیں، بلکہ دفاع اور ترقی و تعمیر کے لیے بھی وسائل میسر ہیں۔ پاکستان کے مخالفین کی یاس انگیز پیشگوئیاں غلط نکلیں۔ پاکستان کی صلاحیت بقا محقق ہوگئی اور پاکستان کے معاشی استحکام میں لوگوں کے یقین کو بڑی تقویت پہنچی۔ یکم اپریل 1948ء کو قائداعظم نے ایک تقریر کے دوران کہا:

''جب ہم نے پہلے پہل پاکستان کی آزاد و خودمختار مملکت کے لیے مطالبہ کیا تھا تو ایسے باطل ''پیغمبروں'' کی تعداد کم نہ تھی جو ہمیں اپنے نصب العین سے یہ کہہ کر منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ پاکستان معاشی اعتبار سے ممکن العمل نہیں ہے۔ اولین بجٹ نے ہی ان باطل پیغمبروں کو سخت صدمہ پہنچایا ہوگا۔ اس نے پاکستان کے مالیاتی استحکام اور اس کی حکومت کے اس عزم کا پورا مظاہرہ کر دیا ہے کہ وہ اسے مستحکم اور مضبوط تر بنائے گی''۔

ایک اور اقدام جو قوم کے لیے اطمینان بخش اور اعتماد افزا تھا وہ یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح تھا۔ سٹیٹ بنک کے گورنر کے طور پر زاہد حسین کا انتخاب ایک طے شدہ معاملہ تھا۔ وہ ایک بہت آزمودہ کار ماہر مالیات تھا۔ لیکن جب یکم اکتوبر 1948ء تک ریزورو بنک آف انڈیا کو ہی پاکستان کے کرنسی کے معاملات سپرد کرنے کا فیصلہ ہوگیا تو انھیں عارضی طور پر ہندوستان میں ہائی کمشنر برائے پاکستان مقرر کر دیا گیا۔ جب دسمبر 1947ء میں حکومت ہندوستان کی ہدایات کے تحت ریزورو بنک آف انڈیا نے پاکستان کے حصہ کے متفق علیہ نقد بقایا جات روک لیے تو طے شدہ تاریخ سے پہلے ہی اپنے لیے آپ انتظام کرنے کی ضرورت واضح ہوگئی اور سٹیٹ بنک آف پاکستان کے قیام کی تاریخ تین ماہ پہلے کر دی گئی۔

سٹیٹ بنک آف پاکستان کا قیام یکم جولائی 1948ء کو تین کروڑ روپے کے سرمایہ سے عمل میں لایا گیا، 51 فیصد سرمایہ مرکزی حکومت نے اور باقی عام لوگوں نے لگایا تھا۔ بنک کے امور کی ہدایت اور نگرانی ایک سنٹرل بورڈ آف ڈائریکٹر کے ذمے تھی۔ ان میں بعض حکومت نامزد کرتی اور بعض کا انتخاب حصہ دار کرتے۔ کراچی، ڈھاکہ اور لاہور کے تین مرکزوں میں ایک ایک لوکل بورڈ بھی تھا۔

غیر منقسم ہند میں بنک کاری کا میدان غیر مسلموں کے لیے مخصوص تھا اور بہت تھوڑے مسلمان اس پیشہ میں تربیت یافتہ تھے۔ تجربہ کار عملہ کی کمی کے باعث جن مشکلات سے پاکستان کا ہر محکمہ اور ادارہ دوچار تھا، سٹیٹ بنک کو وہ بدرجہا بڑے پیمانے پر درپیش تھیں۔ تمام ابتدائی امور کو سرانجام دینے کے لیے بہت تھوڑا وقت میسر تھا۔ لیکن زاہد حسین کی قابل قیادت میں بنک نے مقررہ تاریخ کو اپنا کام شروع کر دیا۔

یکم جولائی 1948ء کو رسم افتتاح قائداعظم نے ادا کی۔ وہ اس تقریب کے لیے اپنی علالت کو نظرانداز کرتے ہوئے کوئٹہ سے خاص طور پر کراچی آئے، جہاں گرمی کا کافی زور تھا۔ اس موقع کو اور زیادہ یادگار حیثیت اس لیے بھی حاصل ہوگئی کہ یہ آخری تقریب تھی جس میں قائداعظم تشریف لائے۔ انھوں نے کہا ''سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح مالیاتی شعبہ میں ہماری مملکت کی خود مختاری کا مظہر ہے''۔ انھوں نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے جو خیالات ظاہر کیے، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا جن معاشرتی و معاشی عوارض میں مبتلا تھی، وہ انھیں کس قدر شدت سے محسوس کرتے تھے اور ان کے امداد کی انھوں نے کیا تدبیر تجویز کی۔

سٹیٹ بنک کے اوّلین فرائض میں قبل از تقسیم کرنسی کو تبدیل کرنا تھا۔ یکم اپریل 1948ء سے ایسے ہندوستانی نوٹ چلے جا رہے تھے، جن پر ''حکومت پاکستان'' کے الفاظ کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ پاکستان کے اپنے نوٹوں نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ تھامس ڈی لارو کی برطانوی فرم کے ساتھ مل کر کراچی میں سیکورٹی پرنٹنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ کرنسی نوٹ اور وثیقہ کی دوسری دستاویزات تیار کی جا سکیں۔

سٹیٹ بنک کا بنیادی فرض منصبی روپے پیسے کے نظام کو استحکام اور بنکوں اور قرضوں کے سسٹم کو ملک کے بہترین مفاد میں فروغ دینا تھا۔ غیر منقسم ہند میں بنک کاری میں عملی طور پر ہندوؤں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ تقسیم کے ایام میں 3 جون سے 15 اگست 1947ء تک ہندوؤں کے زیر انتظام بیشتر بنکوں نے اپنے صدر دفاتر اور فنڈ پاکستان سے ہندوستان میں منتقل کر دیئے تھے۔ پنجاب میں فسادات نے اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ مغربی پاکستان میں منظور شدہ بنکوں کی 487 شاخوں میں سے تقسیم کے بعد صرف 69 باقی رہ گئیں، صرف ایک بنک نے اپنے صدر دفتر کو ہندوستان سے پاکستان میں منتقل کیا اور وہ مسلمانوں کی زیر ملکیت حبیب بنک تھا۔ اس طرح قرضہ کی سہولتیں بے حد کم ہوگئی تھیں اور اس شعبہ میں خاص جدوجہد کی ضرورت تھی۔

سٹیٹ بنک کو زرمبادلہ کو کنٹرول کرنے اور قومی قرضہ کا انتظام کرنے کے فرائض بھی تفویض کیے گئے تھے۔ چونکہ بازار زر بالکل ابتدائی حالت میں تھا' اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری قرضے لینے کا سارا کام مرکزی حکومت کی وساطت سے سرانجام دیا جائے، اس میں صوبائی حکومتوں کو ان کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضے بھی شامل تھے۔ 1948ء میں کئی قرضے جاری کیے گئے۔ عوام نے ان میں بڑے جوش و خروش سے سرمایہ لگایا۔ چنانچہ اس سال کے دوران میں قرضوں سے حاصل شدہ رقوم کی مجموعی مالیت 70.5 کروڑ روپے تھی، جو اس زمانے میں ملک کے معاشی حالات کے پیش نظر بہت غیر معمولی تھی۔ یہ ہر طبقے کے لوگوں کی طرف سے پاکستان کو ایک مستحکم اور جدید مملکت بنانے کے پختہ عزم کا ایک اور مظاہرہ تھا۔

زرِ مبادلہ کی حالت اطمینان بخش تھی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی اشیاء کی بیرونی منڈیوں میں خاصی مانگ

تھی۔ رواں آمدنی کے علاوہ پاکستان کے حصہ کے وہ سٹرلنگ بقایاجات بھی تھے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران جمع ہوتے رہے تھے۔ ان کی مالیت 96 کروڑ روپے تھی۔ اس بندکھاتے سے جاریہ اخراجات کے لیے رقوم وقتاً فوقتاً گفت وشنید سے نکلوائی جاتی تھیں۔ بڑی درآمدات خام پٹ سن کی اوسطاً ساٹھ لاکھ گانٹھیں اور روئی کی سولہ لاکھ گانٹھیں سالانہ تھیں۔ پٹ سن سے برآمدی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ حاصل ہوتا تھا اور روئی سے ایک تہائی۔ جنگِ کوریا کی وجہ سے جب بھاؤ چڑھ گئے تو روئی سے برآمدی آمدنی کا حصہ 47 فیصد تک بڑھ گیا۔ لیکن ملک میں پارچہ بافی کی صنعت کے فروغ پانے سے اس میں معتدبہ کمی ہوگئی۔ پٹ سن اور روئی سے کم درجہ پر چھوٹی برآمدات تھیں۔ مثلاً چائے، اون، کھالیں اور چمڑا وغیرہ اہم درآمدات سوتی کپڑا اور سوت، مشینری، گاڑیاں، دھاتیں، تیل کیمیات اور ادویہ تھیں۔

تجارت کا اسلوب وہی تھا، جو قبل از تقسیم زمانہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار ہندوستان تھا۔ درآمدات میں برطانیہ سے خریداری سرِ فہرست تھی۔ اس کی ایک وجہ شاہی ترجیحات تھیں، جن کے تحت برطانوی مصنوعات بشمول سوتی کپڑا اور فولاد کی درآمد پر محصول میں رعایت دی جاتی تھی اور کسی حد تک یہ بات برصغیر سے طویل برطانوی تعلقات کا نتیجہ تھی۔ برطانیہ سے تجارت میں مستقل خسارہ رہتا تھا، یعنی اس کی پاکستان میں درآمد زیادہ تھی اور یہاں سے برآمد کم۔

اس ناہموار صورتِ حال کو زیادہ متوازن اور متنوع بنانے کی ضرورت تھی تاکہ پاکستان کی معاشی قسمت ایک یا دو ملکوں سے جکڑی نہ رہے۔ اس پالیسی کے تحت کئی ملکوں سے بات چیت کے بعد تجارتی معاہدے کیے گئے۔ ان معاہدوں میں باہمی خریداری کی حدیں متعین کردی جاتی تھیں۔ اگرچہ ان پر ہمیشہ پورا عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ تجارت کے نئے میدان کھولنے میں بہت مفید ثابت ہوئیں اور ان سے پالیسیوں کی تشکیل میں زیادہ آزادی ملی۔

پاکستان کی معاشی آزادی کو ستمبر 1949ء میں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا، جب برطانیہ نے پونڈ سٹرلنگ کی قیمت میں تقریباً 30 فیصد کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی سٹرلنگ علاقے کے رکن تھے۔ ہندوستان نے برطانیہ کی پیروی کی اور ہندوستانی روپے کی قیمت میں کمی کردی۔ پاکستان نے پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ میں پاکستان کی برآمدات تقریباً تمام تر خام مال پر مشتمل تھیں اور دنیا میں مناسب قیمتوں پر آسانی سے فروخت ہو جاتی تھیں۔ پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی کرنے سے برآمدات میں تو اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔ البتہ ملک کے اندر قیمتوں کی سطح بلند ہو جاتی۔ نو ماہ بعد جب کوریا میں جنگ چھڑ گئی اور خام اشیاء کے بھاؤ تیزی سے چڑھنے لگے تو ملک کے اندر قیمتوں کو افراطِ زر سے بچانے کے لیے روئی اور پٹ سن پر بھاری شرح سے برآمد محصول عائد کرنا پڑا۔ دوسری طرف پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی کرنے سے سٹرلنگ علاقہ کے باہر سے درآمد ہونے والی مشینری کی قیمت بڑھ جاتی اور صنعتی ترقی اور زیادہ مشکل ہو جاتی۔ اس کے برعکس پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلتا کہ اس سے برطانیہ اور باقی سٹرلنگ علاقہ سے درآمدات کی رفتار تقریباً تیز تر ہو جاتی اور چونکہ اس زمانہ میں کھلے عام لائسنس پر آزادانہ درآمدگی کی پالیسی پر عمل ہورہا تھا، اس لیے پاکستان میں دوسرے ملکوں سے اشیائے صرف کا سیلاب آجاتا۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی نئی صنعتوں کے قیام کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوسکتی تھی۔

وزیر خزانہ غلام محمد اس موقع پر ملک سے باہر تھے، انھوں نے وزیراعظم کو ایک مفصل تار بھیجا جس میں سٹرلنگ کے ساتھ ہی ساتھ اس شرح سے پاکستانی روپے کی قیمت کم کرنے کا پُرزور مشورہ دیا۔ لیکن وزیر تجارت فضل الرحمٰن نے ان سے بھی زیادہ اصرار کیا کہ قیمت میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ کابینہ میں اس مسئلہ پر طویل بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ سٹیٹ بنک کے گورنر زاہد حسین کو مشورے کے لیے بلایا گیا۔ بہ حیثیت مجموعی وہ قیمت میں کمی کرنے کے حق میں تھے لیکن ہر دو صورتوں میں ان کے نزدیک فوائد اور نقصانات کم وبیش یکساں تھے۔ قیمت میں کمی کرنے کی ضرورت تو تھی، لیکن برآمدات بڑھانے کے لیے نہیں، کیونکہ ہماری برآمدات بیشتر خام مال پر مشتمل تھیں، بلکہ اشیائے صرف کی درآمد کے سیلاب کو روکنے کے لیے اور اس مقصد کے لیے سٹرلنگ جتنی نہیں، بلکہ جزوی تخفیف کافی تھی۔ اس صورت حال کا ایک علاج درآمدات پر پابندی بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں کابینہ کھلے عام لائسنس کی پالیسی جاری رکھنے کا تہیہ کرچکی تھی۔ پورے دو دن تک اس مسئلہ کے ہر پہلو پر مفصل غور وخوض کرنے کے بعد کابینہ نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہیں کی جائے گی۔ آخری فیصلہ میں ایک اہم عنصر یہ احساس بھی تھا کہ اس سے پاکستان کی ساکھ بڑھ جائے گی۔

پاکستان روپے کی قیمت کو برقرار رکھنے کا فیصلہ پاکستان کے مفادات کی روشنی میں تمام پہلوؤں کا محتاط جائزہ لینے کے بعد کیا گیا۔ اس سے پاکستان کے معاشی استحکام اور آزادیٔ رائے کا جو مظاہرہ ہوا، اس سے دنیا دنگ رہ گئی۔ ہندوستانی نہ صرف دنگ رہ گئے بلکہ اس معاملہ میں انھوں نے اپنی تحقیر بھی محسوس کی، کیونکہ انھیں یہ بات ماننی پڑی کہ ایک سو پاکستانی روپے 144 ہندوستان روپوں کے برابر ہیں۔ دنیا بھر کے ملکوں میں ہندوستان واحد ملک تھا، جس نے پاکستان کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور تجارتی جنگ شروع کردی۔

اس وقت پٹ سن کی فصل کا موسم تھا۔ ہندوستان میں دنیا کی ساٹھ فیصد پٹ سن کی کھڈیاں نصب تھیں اور وہی خام پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ کلکتہ جہاں کثیر تعداد میں گانٹھیں باندھنے والے کارخانے تھے، مشرقی پاکستان سے بیرونی منڈیوں کے لیے خام پٹ سن کی نکاس کا وہی بڑا دروازہ تھا۔ ماروا ڑی جن کے ہاتھ میں پٹ سن کی بیشتر تجارت تھی، ہندوستانی شہری تھے اور ان کے صدر دفاتر کلکتہ میں تھے۔ تجارت کے لیے جو بنک قرضے کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے، وہ بھی کلکتہ میں ہی تھے۔ پٹ سن کے معاملہ میں ہندوستانیوں کو اپنی مضبوط پوزیشن کا اتنا زعم تھا کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی معاہدہ کے لیے بات چیت کے دوران ایک ہندوستانی وفد کے لیڈر نے کہا: ''آپ اپنی پٹ سن کا کیا کرسکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہمارے ہاتھ فروخت کردیں؟ کیا آپ اسے نذرِ آتش کر دیں گے؟ یا خلیج بنگال میں پھینک دیں گے؟''

اب یکایک پاکستان کو ایک سنگین بحران درپیش تھا۔ ہندوستان کا پٹ سن کی خرید سے انکار اور اس کی برآمد اور کلکتہ میں بنک کاری کی سہولتیں بند کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پٹ سن کی قیمتوں میں تباہ کن کمی ہو جائے گی، جس سے مشرقی پاکستان میں لاکھوں کاشت کار مالی طور پر تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔ مشرقی پاکستان میں کئی ہنگامی نوعیت کے اقدامات کیے گئے۔ ''پٹ سن کی بین الاقوامی تجارت کے تحفظ کے لیے'' ایک آرڈی نینس جاری کیا گیا۔ اس کے تحت مرکزی حکومت اس کی کم از کم امدادی قیمت متعین کرنے اور اپنی طرف سے پٹ سن خریدنے، ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کے لیے ایجنٹ اور دلال مقرر کرنے کی مجاز تھی۔ ان فرائض کو سرانجام دینے کے لیے ایک جیوٹ بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کھلی پٹ سن کے لیے کم از کم قیمتوں پر پٹ سن خریدنے کے لیے مشرقی پاکستان بھر میں ایجنٹ مقرر کردیئے گئے اور پٹ سن کی تجارت میں حصہ لینے کے لیے پاکستانیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ قرضہ کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے نیشنل بنک آف پاکستان قائم کرنے کا

فیصلہ کیا گیا۔ گانٹھیں باندھنے والے جدید کارخانوں کے مزید آرڈر دیئے گئے۔ چٹاگانگ بندرگاہ کی ترقی و توسیع اور چالنامیں لنگر اندازی کے انتظامات کا کام تیز تر کر دیا گیا۔ ان ٹھوس اقدامات اور عوام کی طرف سے حکومت کی پالیسیوں کی پرجوش حمایت کی بدولت پاکستان اس بحران سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوگیا، جو پاکستان کے اپنے روپے کی قیمت کم نہ کرنے پر ہندوستان کے معاندانہ ردعمل سے پیدا ہوگیا تھا۔

48-1947ء میں پاکستان کی معیشت ابھی دوسری جنگ عظیم کے افراطِ زر کے اثرات سے متاثر تھی۔ قیمتوں پر کنٹرول نافذ تھے جو اپنے جلو میں چور بازاری اور منافع اندوزی کی ساری قباحتیں لے کر آئے تھے۔ فسادات اور عام تارکین وطن کے طوفان سے خوراک کی پیداوار بہت کم ہوگئی تھی۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے ساز و سامان اور اشیاء ضرورت کی باہر سے بہم رسائی بہت محدود تھی۔ یہ عوامل جو قیمتوں اور اخراجاتِ زندگی کو بڑھا رہے تھے، ان کے خلاف موثر اقدامات ناگریز تھے۔ رفتہ رفتہ صورتِ حال بہتر ہوگئی اور قیمتیں مستحکم ہوگئیں۔ معاشی ترقی کے لیے زمین صاف کر دی گئی۔ پیشتر اس کے کہ ترقی و تعمیر کے منصوبے بنائے جائیں، پاکستان کو زندہ رہنے کا حق حاصل کرنا تھا۔ اس زمانے میں غیر ملکی امداد کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حتیٰ کہ صدر ٹرومین کا نہایت معمولی چار نکاتی پروگرام برائے امدادِ فنی اور دولتِ مشترکہ کا وضع کردہ کولمبو منصوبہ بھی ابھی مستقبل کی آغوش میں تھے۔ اس لیے پاکستان کو اپنی مساعی پر ہی انحصار کرنا تھا۔ پاکستان کے ابتدائی سال شدید مشکلات اور دشواریوں سے پُر تھے اور ان پر قابو پانا بہت بڑی کامیابی تھی۔ یہ کامیابی عزم و ہمت اور خوش تدبیری کا نتیجہ تھی۔ جس کا ثمر مالی اور اقتصادی استحکام تھا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تنظیم اسلامی کا پیغام

نظام خلافت کا قیام

قرآن کا پیغام خلافت کا قیام

تنظیم اسلامی کی پیش کش

امیر تنظیم اسلامی حافظ **عاکف سعید** صاحب

یا دیگر مرکزی ذمہ داران تنظیم کا

مرکزی خطابِ جمعہ

جو بالعموم تذکیر بالقرآن، حالات حاضرہ پر تبصرے اور آئندہ کے لائحہ عمل پر مشتمل ہوتا ہے

اب آپ ہر ہفتے اپنی جگہ پر سُن سکتے ہیں

جن شہروں میں کوریئر سروس موجود ہے وہاں بذریعہ کوریئر، بصورت دیگر ڈاک کے ذریعے اس خطاب کا کیسٹ اگلے ہی دن یعنی ہفتے کے روز آپ کے پتے پر ارسال کر دیا جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

ممبر بنیں اور استفادہ کریں

سالانہ ممبر شپ فیس۔750 روپے ﴿TDK کیسٹ﴾

مرکز تنظیم اسلامی میں نقد، منی آرڈر یا پھر ڈرافٹ کے ذریعے رقم جمع کروائیں اور رسید حاصل کریں

نوٹ: یہی خطاب جمعہ بذریعہ Internet ہماری ویب سائٹ www.tanzeem.org سے براہ راست یا Download کر کے بھی سنا جا سکتا ہے۔

تنظیم اسلامی

67/A علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

مزید معلومات کے لئے درج ذیل نمبرز پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

فون نمبرز: 6316638/6366638 فیکس: 6271241

Email:markaz@tanzeem.org

website:www.tanzeem.org

میڈیا کے نامور سکالر جاوید احمد غامدی کے فکری تفردات، تجدد پسندانہ نظریات اور اُن کے پیش کردہ روشن خیال تصورِ اسلام کا قرآن و سنت کی روشنی میں علمی محاکمہ اور تحقیقی تجزیہ

جاوید احمد غامدی کے متجددانہ نظریات پر منفرد اور مستند کتاب

فکرِ غامدی

ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

تالیف: حافظ محمد زبیر، حافظ طاہر اسلام عسکری

شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

☆ معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ☆ اعلیٰ سفید کاغذ ☆ عمدہ طباعت

☆ صفحات: 128 ☆ قیمت: 70 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-5869501

website : www.tanzeem.org email : maktaba@tanzeem.org

مختصر تاریخ: سیاسی حالات

قیام پاکستان سے لے کر اب تک کے حالات وواقعات پر ایک طائرانہ نگاہ

ابتدائی مشکلات اور مہاجروں کا مسئلہ

(اگست 1947ء سے اکتوبر 1948ء)

پاکستان کو ابتدا ہی سے مہاجروں کی آمد کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ نئے ملک کی نہ تو کوئی اپنی منظم فوج تھی، نہ کوئی انتظامیہ تھی۔ 22 جولائی 1947ء کو مجلس تقسیم ملک (Partition Council) کے اعلان عافیت وآزادی کی رو سے مسلم لیگ کے علاوہ کانگریس اور سکھوں کے رہنما بھی اس امر پر متفق ہو چکے تھے کہ انتقال [illegible] کے بعد اقلیتوں کے ساتھ خوش معاملگی اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا۔ تمام شہریوں کو جان و مال کا تحفظ دیا جائے گا اور کسی حالت میں تشدد گوارا نہیں کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں پنجاب میں امن قائم کرنے کے لیے اضلاع سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر، فیروز پور اور لدھیانہ میں فوجی کمان قائم کر دی گئی تھی، جس کا کمانڈر میجر جنرل ریس تھا اور اس کے مشیروں کے طور پر ہندوستان کی طرف سے بریگیڈیئر دگمبر سنگھ اور پاکستان کی طرف سے کرنل محمد ایوب خان مقرر کیے گئے تھے۔

حصول آزادی سے قبل فسادات دو طرفہ تھے، لیکن آزادی ملنے کے بعد حکومت پاکستان نے فتنہ وفساد کو دبانے کی پرزور کوشش کی جو بڑی حد تک کامیاب بھی رہی۔ اس کے برعکس سکھوں اور فرقہ پرست ہندوؤں نے مشرقی پنجاب اور دوسرے بھارتی علاقوں میں قتل وغارت کا سلسلہ جاری [illegible] سرپرستی میں مسلح اور منظم دستوں نے، جن میں سکھ ریاستوں کے فوجی بھی شامل تھے، مشرقی پنجاب، دہلی اور شمالی یو۔پی کو مسلمانوں سے خالی کرانا شروع کر دیا۔ لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ ہزاروں عورتیں اغوا کر لی گئیں اور لاکھوں کی تعداد میں زخمی اور لٹے پٹے لوگ پاکستان میں داخل ہونے پر مجبور کر دیے گئے۔

ہندوستانی لیڈر نئے ملک کو ختم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی طرف پناہ گزینوں کا ایک بے پناہ سیلاب جاری کر دیا جائے تاکہ اس کی حکومت قائم ہی نہ ہو سکے اور اگر ہو بھی جائے تو انتہائی کمزور اور بودی۔ اسی پروگرام کے تحت مغربی پاکستان کے ہندوؤں کو پاکستان سے چلے آنے کی ہدایت کی گئی جو وہاں کی تمام تر تجارت، صنعت اور بینکنگ پر قابض اور بیشتر کلیدی ملازمتوں پر فائز

[illegible]

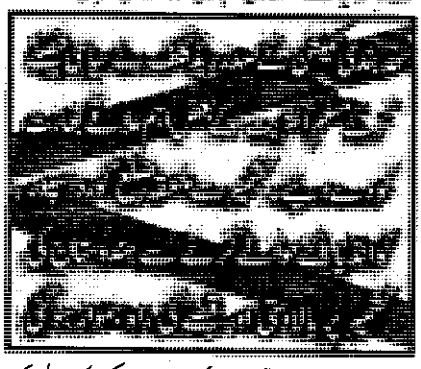

[illegible]

جائے، چنانچہ ان علاقوں کے بھی ہندو اور سکھ ترک وطن کر گئے، جہاں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور جاتے جاتے اپنا مال ومتاع، سرکاری دفاتر کا سامان، کارخانوں کی مشینوں کے ضروری پرزے اور ہسپتالوں کے آلات بھی یا تو اپنے ساتھ لے گئے یا تباہ کر گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکانیں، بینک، منڈیاں، کارخانے، شفاخانے، سب کچھ عرصے کے لیے بند ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان کو اس کے حصے کا فوجی سامان اور روپیہ بھی نہیں دیا گیا تھا۔

اس موقع پر اہل پاکستان نے حب الوطنی، حوصلہ مندی اور ایثار کا ثبوت دیا اور وزارت مہاجرین نے عوامی کارکنوں کی مدد سے مہاجرین کو ہنگامی طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں آباد کر کے ان کی ضروریات کا انتظام کیا اور انھوں نے ہندوؤں کے چھوڑی ہوئی اراضی، مکانات، دکانیں اور کارخانے وغیرہ "الاٹ" کر کے زراعت، تجارت اور صنعت کا تعطل دور کرنے کے علاوہ لاکھوں نفوس کی بحالی اور آبادکاری کا اہتمام کیا۔ اسی طرح سرکاری دفاتر میں ملازمین نے انتہائی دشوار حالات میں کام سنبھالا اور حکومت کے نظم ونسق کو کامیابی سے چلانا شروع کر دیا۔ یوں قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کر کے اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کر دیں۔

قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے اور لیاقت علی خان وزیراعظم۔ کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ ملک کے لیے مؤثر انتظامی ڈھانچے کی تشکیل کی گئی اور آئین ساز مجلس بنائی گئی، جس کے پہلے صدر خود قائداعظم تھے۔

نیا ملک زیادہ تر ان حصوں پر مشتمل تھا جنھیں انگریز حکمرانوں نے صنعتی طور پر پس ماندہ رکھا ہوا تھا۔ اس علاقے سے صرف فوجی سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے اور خام مال انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ تقسیم کے وقت ریڈکلف نے، جو حد بندی کمیشن کا صدر تھا، سیاسی فیصلے کر کے مسلم   کے بعض اہم علاقے بھارت کو دے دیے۔ بھارت کی کشمیر پر بالادستی قائم کرنے کے لیے ملحقہ ضلع گورداسپور اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ اہم نہری ہیڈ ورکس (Head Works) بھی، جو فیروز پور اور مادھو پور میں واقع تھے اور

جہاں سے پاکستانی علاقوں کو نہری پانی فراہم ہوتا تھا، بھارت کو دیئے گئے۔ یہ ایک صریح ناانصافی تھی لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود پاکستان آگے بڑھتا رہا۔

صوبہ سرحد کا مسئلہ

صوبۂ سرحد میں 1946ء میں ڈاکٹر خان صاحب کے زیر قیادت کانگریسی حکومت قائم ہوئی تھی، جسے معمولی اکثریت حاصل تھی، لیکن صوبہ سرحد کے مسلمان اس حکومت کے خلاف ہو گئے اور 1947ء کے ایکٹ کے مطابق یہاں عام رائے شماری ہوئی تو بھاری اکثریت نے صوبے کے پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ دیئے۔ چنانچہ قائداعظم کے حکم سے صوبے کے گورنر نے 22 اگست 1947ء کو کانگریسی وزارت برطرف کر دی۔ انگریز تو فوجی طاقت، سیاسی چالوں اور رشوت کے ذریعے سرحدی قبائل کو قابو میں رکھتے تھے، مگر پاکستان بننے کے بعد یہ طریق کار ترک کر دیا گیا اور قبائلی پٹھانوں نے محسوس کر لیا کہ وہ پاکستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کے شریک کار ہیں۔ جب نئی نئی سڑکیں بنائی گئیں اور سکول کھولے گئے تو صوبہ سرحد اور دوسرے علاقوں کے باشندوں کے درمیان گہرا رابطہ پیدا ہو گیا اور دوری کا احساس ختم ہو گیا۔

مسئلہ کشمیر

انگریزوں نے 1745ء میں جموں اور کشمیر کی ریاست 75 لاکھ روپے کے عوض ایک ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ہاتھوں بیچ ڈالی تھی۔ مسلمان اکثریت کی اس ریاست پر نئے حکمران نے تشدد کے ساتھ حکومت کرنا شروع کی اور اس کے جانشینوں نے بھی کشمیری پنڈتوں کی مدد سے مسلمان عوام پر ظالمانہ تسلط قائم رکھا۔

جموں و کشمیر کے باشندوں کی 80 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی اعتبار سے اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ قانون آزادی مجریہ 1947ء کی رو سے ریاستوں کو پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا تھا، البتہ ماؤنٹ بیٹن نے ریاستی حکمرانوں کو انتباہ کیا تھا کہ وہ جغرافیائی تقاضوں کو مدنظر رکھیں۔

برصغیر کی آزادی کے موقع پر ہی کانگریسی لیڈروں نے کشمیر کو بھارت کے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں، چنانچہ گاندھی جی نے 1947ء کے موسم گرما میں کشمیر کا دورہ کیا۔ مہاراجا ہری سنگھ کو معلوم تھا کہ ریاست کے مسلمان لازماً پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ انھیں دھوکا دینے کے لیے اگست 1947ء میں اس نے بظاہر تو پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ فی الحال جو حالات و تعلقات ہیں وہ بحال رہیں (Stand Stil Agreement) لیکن جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا تو اس کے اشارے پر ریاست کے مسلح ہندوؤں اور فوج نے جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے ان پر منظم حملے شروع کر دیئے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر پونچھ کے مسلمانوں نے راجا کے خلاف بغاوت کر دی اور ریاست کی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کے بہت سے مسلمان بھی اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے چل پڑے اور ان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ لڑائی کی آگ ریاست کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ ہر طرف ریاستی فوجوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور مہاراجا اور اس کے ارکان حکومت بھاگ کر دہلی جا پہنچے۔ مہاراجا نے بھارتی حکومت سے الحاق کی درخواست کی اور فوجی امداد طلب کی، جسے فوراً منظور کر لیا گیا۔ 26 اکتوبر 1947ء کو الحاق کی دستاویز پر دستخط ہو گئے۔ بھارتی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتاری گئیں اور مجاہدین کے خلاف صف آراء ہو گئیں۔ اسی اثناء میں کانگریسی لیڈروں نے ممتاز کشمیری رہنما شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے نکال کر ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔

ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق ریڈکلف ایوارڈ کی ناانصافی کی وجہ سے ممکن ہوا، کیونکہ گورداسپور کا مسلم اکثریتی علاقہ بھارت کو دے دیا گیا تھا۔ اس طرح بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کے لیے راستہ مل گیا۔ دوسرے یہ کہ الحاق کا معاہدہ جلد بازی میں کیا گیا تھا اور چونکہ اس میں عوام کی مرضی شامل نہیں تھی اس لیے اس کی کوئی اخلاقی اور قانونی وقعت نہ تھی۔ قائداعظم نے بھارتی حکومت پر زور دیا کہ وہ ریاست میں غیر جانب دار حکومت قائم کر کے عام رائے شماری کے لیے حالات سازگار بنانے میں مدد دے، لیکن بھارتی حکومت نے ایسا نہ کیا۔ جنگ شدید ہوتی گئی اور قبائلی مجاہدین اور دیگر رضا کار جماعتوں کے کچھ دستے بھی کشمیری مسلمانوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ بے بسی کے عالم میں بھارتی حکومت نے جنوری 1948ء میں سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فائر بندی ہو گئی۔ اس عرصے میں جو علاقے آزاد کرا لیے گئے تھے وہاں کشمیریوں نے آزاد جموں و کشمیر حکومت قائم کر لی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے سلامتی کونسل کی یہ قرار داد منظور کر لی کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت کے تحت اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا، لیکن بعد میں بھارتی حکومت نے تعاون نہ کیا۔

نہری پانی کا جھگڑا

ریڈکلف نے پاکستانی علاقوں کو سیراب کرنے والی نہروں کے ہیڈ ورکس، جو فیروز پور اور مادھو پور کے مقامات پر واقع تھے، بھارت کو دے دیئے۔ بعد میں بھارتی حکومت نے ستلج، بیاس اور راوی کے پانی پر اپنا مکمل حق جتانا شروع کر دیا۔ ابتدا میں چند عارضی معاہدے ہوئے جن کی رو سے پاکستان نہری پانی کی فراہمی کے عوض نقد روپیہ ادا کرتا رہا، لیکن بھارتی حکام اکثر ضرورت کے وقت پانی بند کر دیتے تھے جس سے پاکستان کی فصلوں کو نقصان پہنچتا۔

قائداعظم کی وفات: ایک غلط فہمی

کام کی زیادتی اور قومی ذمہ داریوں کے بوجھ اور عمر کے تقاضے سے قائداعظم کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ قومی و سرکاری فرائض بدستور انجام دیتے رہے۔ آخر 11 ستمبر 1948ء کو رحلت کر گئے۔

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظم کے انتقال کے ضمن میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے۔ ''فریڈم ایٹ نائٹ'' کے مصنفین نے، اپنی افسانوی طرز میں لکھی ہوئی کتاب میں لکھا کہ: ''قائداعظم تپ دق کے مریض تھے اور یہ مرض چالیس کے عشرے میں تشخیص ہوا۔ اس بیماری کا چالیس کے عشرے میں کوئی موثر علاج نہ تھا۔ قائداعظم بمبئی کے ماہر معالج ڈاکٹر جے اے ایل پٹیل کے مریض تھے اور قائداعظم نے ہی ڈاکٹر پٹیل کو بیماری کے اخفائے راز کی تاکید بھی کی تھی۔ قائداعظم کئی مرتبہ ڈاکٹر پٹیل کے پاس گئے تھے اور اُن کے ایکسرے بھی اُس کی خفیہ فائلوں میں موجود تھے اور خود قائداعظم کے پاس بھی اس کا ریکارڈ موجود تھا۔ اسی ریکارڈ کی روشنی میں ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے علاج شروع کیا تھا۔'' کتاب مذکور کی بنیاد پر یہ خبر پاکستان کے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔

قائداعظم بہتر سال کی انتہائی بامقصد اور پُرمشقت زندگی گزارنے کے بعد طبعی موت مرے۔ بعض افراد کی جانب سے یہ الزام تراشی کہ انہیں زہر دے کر آہستہ آہستہ موت کی نیند سلایا گیا محض سازشی ذہن کی غمازی ہے

Liberty or Death شائع ہوئی تو اُس نے ''فریڈم ایٹ نائٹ'' کی بیان کردہ کہانی کی تردید کردی۔ مصنف نے لکھا کہ یہ کہانی ایک من گھڑت ہے۔ بمبئی میں جے ایل پٹیل نام کا کوئی ڈاکٹر نہ تھا، جس سے قائداعظم نے ''کئی مرتبہ'' ملاقات کی ہو، معائنہ کرایا ہو اور بیماری کو راز میں رکھنے کا معاہدہ کیا ہو۔ بلاشبہ قائداعظم کی وفات تپ دق کے مرض سے ہوئی، لیکن اُس کی تشخیص پہلی بار جولائی 1948ء میں، یعنی وفات سے صرف دو ماہ قبل اُس وقت ہوئی جب قائداعظم آرام کی غرض سے زیارت (بلوچستان) میں تھے اور کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ کے زیرِ علاج تھے۔ ان دونوں معالجوں نے اپنی اپنی ڈائریوں میں اُس وقت کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ کرنل الٰہی بخش کی مختصر کتاب ''قائداعظم کے آخری ایام'' نومبر 1949ء ہی میں پہلی بار شائع ہوگئی تھی۔ جب کرنل صاحب نے پہلی بار قائداعظم کا معائنہ کیا تو انہوں نے اپنی بیماری کا پس منظر بتاتے ہوئے کہا:

''مجھے کوئی خاص عارضہ نہیں سوائے معدے کی خرابی اور تکان کے جو کام کی زیادتی اور دماغی پریشانیوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ میں اپنی زندگی کے گزشتہ چالیس برسوں میں ہر روز چودہ گھنٹے کام کرتا رہا ہوں، لیکن کسی عارضے کا سامنا نہیں ہوا، لیکن گزشتہ چند برسوں میں مجھے کبھی کبھی بخار اور کھانسی کی شکایت ہوتی رہی۔ میرے ڈاکٹر اسے پھیپھڑوں کی نالیوں کی سوجن بتاتے تھے۔ معمولی علاج اور آرام کرنے سے میں بالعموم ہفتے عشرے میں تندرست ہو جاتا تھا، لیکن کوئی ایک دو سال سے یہ تکلیف زیادہ تیزی کے ساتھ عود کرنے لگی، اور اس کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا رہا جس سے میں نڈھال ہو جاتا ہوں..... کوئی تین ہفتے سردی لگ جانے کی وجہ سے مجھے بخار اور کھانسی کی شکایت ہوئی۔ میرا خیال ہے، مجھے کوئی جسمانی عارضہ نہیں۔ بلغم کا آنا غالباً معدے کی وجہ سے ہے۔ اگر معدہ ٹھیک ہو جائے تو فوراً تندرست ہو جاؤں گا۔''

یہ سب کچھ سن لینے کے بعد ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے قائداعظم کا معائنہ شروع کیا۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہُوا کہ وہ کپڑوں میں جو کچھ نظر آتے تھے، اُس سے کہیں زیادہ نحیف اور لاغر تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنے دبلے اور ناتواں ہونے کے باوجود وہ زندہ کیونکر تھے اور کام کیسے کرتے تھے۔

.....معائنے کے بعد میں کچھ مایوس سا ہوگیا، اگرچہ میں نے اپنی مایوسی نو مریض پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اتنا اشارہ ضرور کر دیا کہ اصل شکایت معدے کی نہیں، بلکہ پھیپھڑے کی ہے، لیکن اُنہیں یہی یقین تھا کہ اصل شکایت معدے کی ہے، پھیپھڑے کی نہیں۔''

25 جولائی 1948ء اتوار کی صبح کو لیبارٹری کے ٹیسٹ بھی آ گئے۔ لیبارٹری کی تفتیش سے بھی تصدیق ہوگئی کہ قائداعظم کی اصل بیماری پھیپھڑوں کی تھی، (یعنی تپ دق)۔ مس فاطمہ جناح کو یہ خبر بتائی گئی تو انہوں نے کہا: ''کاش یہ تشخیص کچھ عرصے پہلے ہو جاتی۔''

غرضیکہ، حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم بہتر سال کی انتہائی بامقصد اور پُر مشقت زندگی گزارنے کے بعد طبعی موت مرے۔ بعض افراد کی جانب سے یہ الزام تراشی کہ اُنہیں زہر دے کر، آہستہ آہستہ موت کی نیند سلایا گیا، محض سازشی ذہن کی غمازی ہے۔

قائداعظم کی وفات کے بعد

قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کے سابق وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نئے گورنر جنرل مقرر ہوئے اور لیاقت علی خان بدستور وزیرِ اعظم رہے۔ خواجہ ناظم الدین کے دور میں وزیرِ اعظم کے اختیارات اور ذمے داریوں میں وسعت پیدا ہوگئی۔

آہستہ آہستہ لیاقت علی خان بھی سیاست برائے اقتدار کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے پارٹی میں اپنے ایسے حامیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جو اپنے سیاسی مخالفوں کو پوری طرح سے دبائے رکھتے اور اپنی بالادستی برقرار رکھتے تھے

قرارداد مقاصد

نئی دستور ساز اسمبلی کے فرائض میں دستوری اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کی ذمے داریاں شامل تھیں۔ ابتدا میں اس کے ارکان کی تعداد 69 تھی، جو بعد میں ریاستوں کے نمائندے ملا کر 79 ہوگئی، لیکن تارکینِ وطن کی بحالی اور اقتصادی و انتظامی امور کی تنظیم نو جیسے مسائل کی وجہ سے دستور سازی پر پوری توجہ نہ دی جا سکی۔ دستور سازی کی ابتدا قرار داد مقاصد سے ہوئی، جو 13 مارچ 1949ء کو پیش ہوئی اور مختصر بحث کے بعد منظور کر لی گئی۔ اس میں پاکستان کا دستور قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا (دیکھیے تفصیل بذیل ''آئین سازی کی تاریخ'')۔

اس کے بعد ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی'' مقرر ہوئی، جس نے دستور کا مسودہ تیار کیا۔ ستمبر 1950ء میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں پارلیمانی طرز حکومت، دو قانون ساز اداروں (ایوان بالا و ایوان زیریں) اور وزراء پر پارلیمان کی بالادستی کی سفارشات شامل تھیں۔ مشرقی پاکستان نے مرکز کے وسیع اختیارات کے خلاف احتجاج کیا اور یہ معطل ہوگئی۔

چونکہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی مکمل بالادستی تھی اور حزب اختلاف ابھی وجود میں نہ آئی تھی، اس لیے پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے قوانین پر شاذ ہی بحث ہوتی۔ اس دور میں ایک اہم دستوری ترمیم دفعہ 92 الف میں ہوئی، جس کی رو سے آئینی حکومت ناکام ہونے کی صورت میں صوبے کا انتظام براہ راست گورنر جنرل اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ پنجاب میں وزراء کے باہمی اختلافات نازک صورت اختیار کر گئے تو 1949ء کے آغاز میں وزارت برطرف کر کے صوبے کا انتظام گورنر کے سپرد کر دیا گیا۔ دوسرے صوبوں کی حالت بھی کم و بیش یہی رہی۔

لیاقت علی خان کے عہد میں بالغ رائے دہی کا نظام بہ ترمیم رائج کیا گیا اور پنجاب اور صوبہ سرحد میں 1951ء کے انتخاب کے بعد نئی منتخب حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اگرچہ مسلم لیگ کی بالادستی قائم رہی، لیکن عوام سے رابطہ کٹ جانے کی وجہ سے جماعت کمزور ہوگئی تھی۔ لیاقت علی خان آہستہ آہستہ سیاست برائے اقتدار کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے پارٹی میں اپنے ایسے حامیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جو اپنے سیاسی مخالفوں کو پوری طرح سے دبائے رکھتے اور اپنی بالادستی برقرار رکھتے تھے۔ کے ایما پر لیگ کے دستور کی وہ شق ختم کر دی گئی جس کی رو سے وزرا کوئی جماعتی عہدہ نہیں سنبھال سکتے تھے۔ وہ خود مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور ان کی پیروی میں تمام صوبائی وزرائے اعلیٰ نے صوبائی شاخوں کی صدارت سنبھال لی۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ جماعت اور حکومت میں کوئی فرق نہ رہا۔

بھارت سے تعلقات

تقسیم ملک کے بعد بھی بھارتی حکومت نے کشمیر، نہری پانی اور متروکہ جائیداد کے مسائل حل نہ کیے، جس کے باعث پاکستان کے لیے گوناگوں مشکلات پیدا ہوگئیں۔ دہشت پسند غیر مسلم جماعتوں نے مسلم کش فسادات برپا کر کے بے شمار مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیل دیا۔ اس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے لیاقت علی خان نے خود 1951ء میں دہلی جا کر بھارتی وزیرِ اعظم پنڈت نہرو سے ''اقلیتوں کا معاہدہ'' طے کیا، جس کی رو سے دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے لیے الگ وزارتیں قائم کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کی ذمے داری قبول کی۔

ہندوؤں کے چلے جانے سے پاکستان کو صنعتی، تجارتی اور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان امور پر ہندوؤں ہی کی اجارہ داری تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حکومت نے منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں اہم زرعی اصلاحات نافذ کر کے جاگیرداری پر مؤثر پابندیاں عائد کی گئیں اور کاشت کاروں کو اہم سہولتیں دی گئیں۔ 1951ء میں لیاقت علی خان نے امریکہ کا دورہ کیا اور پاکستان کے بارے میں متعدد تقریریں کیں۔ مارچ 1951ء میں حکومت کے خلاف ایک بغاوت (روالپنڈی سازش) کا انکشاف ہوا، جس میں چند اعلیٰ فوجی افسر بھی شامل تھے۔

لیاقت علی کا قتل

17 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کو ایک جلسۂ عام میں ایک آدمی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ لیاقت علی خان کا قتل ایسا معما ہے جو 56 سال گزرنے کے باوجود حل نہیں ہوا اور نہ آئندہ اس امر کی کوئی توقع ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم کا قاتلوں اور اصل وجہ قتل کا سراغ مل سکے گا۔ اُن کے قتل کے پس پردہ محرکات کیا تھے؟ افغان قاتل اکبر نے انہیں کیوں قتل کیا؟ کیا اس لیے کہ وہ انہیں پختونستان کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا یا یہ کہ ایران کے مسئلے پر امریکیوں کی پالیسی سے اختلاف اور اڈے خالی کر دینے کی دھمکی کے باعث انہیں قتل کیا گیا، جیسا کہ انڈیا کے ایک روزنامے نے انکشاف کیا ہے، ہماری رائے میں، جیسا کہ اب بیرونی عوامل کو ملوث کرنے سے پہلے تک، عام خیال تھا کہ اُن کے قتل میں اندرونی عوامل کی سازشوں کا عمل دخل رہا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ اور مسلم لیگی حکومت کی باہمی آویزش، اس ضمن میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے، اہل الرائے مبصرین کی نظر میں بڑی اہم رہی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے:

آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس 14 دسمبر 1947ء کو خالق دینا ہال کراچی میں منعقد ہوا، جس میں شرکت کے لیے برعظیم کے طول و عرض سے کُل 475 میں سے 250 کونسلر کراچی پہنچے تھے۔ کونسل نے ایک قرارداد مرتب کی جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کو دوجداگانہ تنظیموں میں تقسیم کر دینے کی سفارش کی۔ ''آل پاکستان مسلم لیگ'' کا کنوینر لیاقت علی خان کو اور بھارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا کنوینر محمد اسماعیل کو مقرر کیا گیا۔

آل پاکستان مسلم لیگ کا نیا آئین مرتب ہونے کے بعد، اس کی توثیق کی غرض سے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس 26 فروری 1948ء کو منعقد ہوا۔ چودھری خلیق الزماں انہی دنوں بھارت سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے اور انہیں مسلم لیگ کا ایک مخلص اور بے لوث کارکن سمجھا جاتا تھا۔ چیف آرگنائزر کے عہدے کے لیے اُن کا نام تجویز کیا گیا اور اکثریت نے اس کی حمایت کی۔ چیف آرگنائزر کی حیثیت سے اُن کے بنیادی فرائض پرائمری اداروں کا قیام، رُکن سازی اور صوبوں میں جماعت کے لئے انتخابات کا انتظام کرنا تھا۔

رُکنیت سازی کی مہم جون 1948ء میں ختم ہوئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں 25 لاکھ سے زائد پرائمری ارکان بنائے گئے ہیں۔ انتخابات کے نتیجے میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کا قیام معرضِ وجود میں آیا جس کا اجلاس 20 فروری 1949ء کو ہُوا۔ کونسل نے چودھری خلیق الزماں کو پاکستان مسلم لیگ کا پہلا صدر منتخب کیا۔

چودھری خلیق الزماں 13 اگست 1950ء تک ''پاکستان مسلم لیگ'' کے صدر رہے، جب انہیں اپنی رہائش گاہ کے سامنے مہاجرین کے مظاہرے کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ اِس مظاہرے کی دو وجوہ تھیں:

1۔ مہاجرین یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ چودھری خلیق الزماں کی قیادت میں مسلم لیگ اُن کی بحالی کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔

2۔ قائداعظم کی وفات کے بعد ''ڈان ٹرسٹ'' کے صرف دو متولی محترمہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان بقیدِ حیات تھے۔ اور چودھری خلیق الزمان بہ حیثیت صدر مسلم لیگ ''ڈان ٹرسٹ'' کے متولی بننے کے خواہاں تھے۔ اور یہ بات نہ مس فاطمہ کو منظور تھی نہ لیاقت علی خان کو اور نہ عوام کو (حوالہ: سوانح حیات راجہ غضنفر علی خان، مولفہ سید نور احمد)، روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور نے اپنے 17 اگست 1950ء کے شذرے میں لکھا: ''چودھری خلیق الزماں کا استعفیٰ قیام پاکستان کے بعد اِس ملک کے عوام کی پہلی فتح ہے۔ چودھری صاحب کی حیثیت اتنی کمزور اور بے وقعت ہو چکی تھی کہ صرف ایک مظاہرے کے بعد وہ مستعفی ہو گئے (حوالہ: مسلم لیگ کا دورِ حکومت، مؤلفہ ڈاکٹر صفدر محمود)

پاکستان مسلم لیگ کے آئین کے تحت کوئی حکومتی عہدہ دار مسلم لیگ کے عہدے پر فائز نہیں رہ سکتا تھا، اِس قاعدے کی وجہ سے چودھری صاحب بطور صدر مسلم لیگ اپنے آپ کو وزیراعظم لیاقت علی خان سے برتر سمجھنے لگے تھے، جبکہ لیاقت علی خان بہرحال چودھری صاحب سے زیادہ مقبول اور طاقتور لیڈر تھے۔ چودھری صاحب کے طور طریقوں کے باعث تمام صوبوں میں مسلم لیگ کے رہنماؤں اور وزرائے اعلیٰ میں کشمکش شروع ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں کرنے لگے۔ مسلم لیگی رہنما حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں کرنے لگے اور یہ جرأت انہیں اس لیے ہوئی کہ وہ مسلم لیگ پر قابض تھے اور حکومت مسلم لیگ کی تھی۔ چنانچہ وہ وزیراعظم لیاقت علی خان کو بھی اپنے سے کمتر سمجھنے لگے۔

چودھری خلیق الزمان کے استعفے کے بعد لیاقت علی خان پاکستان مسلم لیگ کے صدر بنے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن کا انتخاب اُن کی رضامندی اور اجازت سے ہُوا تھا، تاہم اُن کے انتخاب میں ایک آئینی رکاوٹ تھی کہ مسلم لیگ کے آئین کی رُو سے حکومتی عہدے دار جماعت میں عہدے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ یہ رکاوٹ آئین میں ترمیم کر کے دُور کر دی گئی اور کونسل نے 9 اکتوبر 1950ء کو لیاقت علی خان کو اتفاق رائے سے پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کر کے حکومت اور جماعت کی قیادت کو یکجا کر دیا۔ چودھری خلیق الزماں کی صدارت میں مسلم لیگ کو اعلیٰ اور غالب ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ لیاقت علی خان کے صدر بننے سے وہ محض ایک حکومتی ترجمان کی سطح پر اُتر آئی۔ اب اس کا اہم اور بنیادی فریضہ یہ تھا کہ حکومت کی پالیسیوں کی وکالت کرے اور صفائی پیش کرتی رہے۔

لیاقت علی خان کے صدر مسلم لیگ بننے کے دو ماہ بعد، وہ دسمبر 1950ء میں امریکا کے دورے پر گئے تو اُن کی عدم موجودگی میں انہیں ہٹانے کی سازش چودھری خلیق الزماں، غلام محمد، خواجہ شہاب الدین اور نواب مشتاق احمد گورمانی نے مل کر کی تھی، لیکن لیاقت علی خان کی مقبولیت کے سبب یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی (حوالہ: مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن عبدالوحید خان کا بیان۔ انٹرویو از ڈاکٹر صفدر محمود)

تین ماہ بعد مارچ 1951ء میں ''راولپنڈی سازش'' کا انکشاف ہُوا۔ اُس وقت لیاقت علی خان وزیراعظم اور جنرل ایوب خان کمانڈر انچیف تھے۔ اس سازش میں بائیں بازو کے سویلین افراد کے ساتھ ساتھ بعض اعلیٰ فوجی افسر بھی شامل تھے۔ عام طور پر کہا گیا کہ یہ سازش یا بغاوت کشمیر کے محاذ پر فائر بندی کے فیصلہ کے خلاف تھی، جبکہ سری نگر چندون کی جدوجہد کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ سازش کے سرکردہ جنرل اکبر خان جنگِ کشمیر جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ تاہم اُن کی یہ خوش نیتی قانونی حکومت (یعنی لیاقت علی خان) کا تختہ اُلٹنے کا جواز نہیں بن سکتی تھی، لہٰذا عام طور پر ''سازش'' کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔

اُس وقت سیاسی حالات کا نقشہ یہ تھا کہ لیاقت علی خان بھی مسلم لیگ کے اندرونی حالات کو اُن سازشوں سے

پاک نہ کر سکے جن کا سلسلہ چودھری خلیق الزماں کے زمانۂ صدارت میں شروع ہُوا تھا۔ آہستہ آہستہ لیاقت علی خان خود بھی سیاست برائے اقتدار کا شکار ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے پارٹی میں اپنے ایسے حامیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جو اپنے سیاسی مخالفوں کو پوری سختی سے دباتے تھے اور اپنی بالادستی برقرار رکھتے تھے۔

16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کو کمپنی باغ، راولپنڈی کے جلسۂ عام میں ایک شخص سید اکبر نے قتل کر دیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے مشتاق احمد (ریٹائرڈ جنرل) کے زیرِ طبع مسودے ''ہنگاموں میں زندگی'' سے ایک معنی خیز اقتباس پیش کیا ہے۔ مشتاق احمد رقم طراز ہیں: ''اس گہری سازش کے راز ہمیشہ راز ہی رہیں گے، کیونکہ اِس سازش کے کردار کسی نہ کسی طرح اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ اس لیے تحقیق مکمل نہ ہوگی۔ دنیا نے تو یہ دیکھا کہ غلام محمد صاحب کو وزارت سے نکالا جا رہا تھا۔ انہوں نے استعفیٰ دینے سے پہلے چند دن کی مہلت مانگی تھی۔ اس مدت کے اختتام سے پہلے یہ واقعہ ظہور پذیر ہُوا اور وہ گورنر جنرل بن گئے۔ انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی وزیر اعظم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے جس طرح اپنا ''فرض'' انجام دیا، اُس کے عوض وہ ترقی کر کے بلوچستان کے گورنر بنا دیے گئے۔ جس سب انسپکٹر پولیس محمد شاہ نے قاتل کو گولی مار کر موقع پر ہلاک کر دیا تھا، اس کو ترقی پر ترقی ملتی رہی۔ اس قتل کی تفتیش و تحقیق آئی جی سپیشل پولیس اعتزاز الدین کے سپرد تھی۔ اُن سے پوچھا تو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ میاں موت سر پر کھیل رہی ہے۔ آخر دورانِ سفر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہوئے۔ طیارے میں اِس کیس سے متعلق تمام اہم کاغذات اور فائلیں تھیں، وہ تباہ ہو گئیں۔ عام گمان یہی ہے کہ یہ حادثہ بھی اسی سازشِ قتل کی ایک کڑی تھا۔

سکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کی گئیں، لیکن قوم کو اُن کی تحقیق پر اعتبار نہ تھا، کیونکہ اپنی وفات سے قبل لیاقت علی خان حکومتِ برطانیہ کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ نئے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ایف بی آئی (امریکا) کی خدمات حاصل کرنا چاہیں تو گورنر جنرل غلام محمد نے انہیں منع کر دیا؟ کیوں؟ انہوں نے کیوں منع کیا؟ کسی کو علم نہیں، اور جو بتا سکتے تھے، وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان قابلِ اعتناء شکوک و شواہد کے باوجود محمد ایوب خان کو اصرار تھا کہ یہ قتل کسی سازش کا شاخسانہ نہ تھا بلکہ فردِ واحد کا کام تھا۔ قوم کو بہر حال یہ یقین ہے کہ لیاقت علی خان کا قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا جس میں بعض سیاست دانوں کے علاوہ با اثر حکومتی افسر بھی شامل تھے۔ اس خیال کو مندرجہ ذیل حقائق سے تقویت ملتی ہے۔

مثلاً وزیر اعظم لیاقت علی خان کے سیکرٹری صدیق علی خان اپنی تصنیف ''بے تیغ سپاہی'' میں لکھتے ہیں: ''سید اکبر کو شہر کی حدود سے باہر جانے کی ممانعت تھی اور پولیس کو صبح شام اِس امر کا اطمینان کرنا ضروری تھا، لیکن ہوتا کیا ہے کہ اُسے وزیر اعظم کے خفیہ پروگرام کا، جسے حکومت کے چند خاص افسر جانتے تھے، کئی دن پہلے علم ہو جاتا ہے۔'' آخر وہ کون شخص تھا جس نے کئی روز پہلے وزیر اعظم کا خفیہ پروگرام سید اکبر کو بتایا؟

محمود جاوید صاحب کمپنی باغ کے اس جلسے میں شریک تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون روزنامہ ''مشرق'' لاہور، (شمارہ 17 اکتوبر 1968ء) میں لکھا تھا: ''جب سید اکبر ہزارہ سے راولپنڈی پہنچا تو وہاں سی آئی ڈی کو اُس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ سید اکبر جس ہوٹل میں ٹھہرا، وہاں اُس نے اپنے آپ کو سی آئی ڈی کا سپاہی بتایا۔ پھر راولپنڈی سی آئی ڈی کا سپاہی اُس ہوٹل کے منیجر سے یہ تصدیق کرنے بھی گیا کہ وہاں سید اکبر ٹھہرا ہُوا ہے یا نہیں۔ اس کے باوجود سید اکبر کو کھلی چھٹی دی گئی اور وہ جلسے کی پہلی قطار میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گیا، حالانکہ وہاں پولیس کا پہرہ تھا اور پولیس سید اکبر کو جانتی تھی؟''

پولیس سید اکبر کو پہلے سے جانتی تھی۔ سی آئی ڈی کا سپاہی ہوٹل کے منیجر سے یہ تصدیق کرنے بھی گیا وہاں سید اکبر ٹھہرا ہوا ہے یا نہیں؟ یہ اشارے پولیس کی طرف واضح نشان دہی کر رہے ہیں۔

سید اکبر نے جب گولی چلائی تو لوگوں نے اُسے پکڑ لیا، لیکن اتنے میں ایک سب انسپکٹر پولیس محمد شاہ آیا۔ اُس نے ریوالور نکال کر قاتل کو موقع پر قتل کر دیا۔ آخر یہ کیوں ہُوا؟

پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ بقول محمود جاوید: ''16 اکتوبر کو مرکزی کابینہ کے دو اہم وزراء غلام محمد اور مشتاق گورمانی راولپنڈی میں موجود تھے اور یہ اعلان ہو چکا تھا کہ وزیر اعظم اِس جلسے میں انتہائی اہم تقریر کریں گے، اس کے باوجود یہ دونوں وزراء جلسے میں شریک نہیں ہوئے، حالانکہ لیاقت علی خان انتہائی مقبول اور بااثر وزیر اعظم تھے۔''

لیاقت علی خان کا قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا جس میں بعض سیاست دانوں کے علاوہ با اثر حکومتی افسر بھی شامل تھے

بات اصل میں یہ تھی کہ وزیر اعظم نے غلام محمد (خزانہ) اور نواب مشتاق گورمانہ (داخلہ) کو کابینہ سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، حتیٰ کہ خواجہ شہاب الدین کو بھی (وزارتِ اطلاعات و نشریات سے) علیحدہ کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

جب بیگم لیاقت علی خان نے بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ اُن کے خاوند کا قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے جس میں کوئی بیرونی ملک بھی ملوث ہے، تو اُن کا منہ بند کرنے کے لیے انہیں سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔

بعض لوگوں کی تو یہ بھی رائے ہے کہ خود محمد علی بوگرہ کی وزارتِ عظمیٰ سے برطرفی کی ایک وجہ لیاقت علی خان کے مقدمے کی تحقیقات میں غیر معمولی دلچسپی تھی: (بحوالہ: زوالِ مشرقی پاکستان از جیوتی سین گپتا)

اس ساری تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ وزیر اعظم کا قتل بہر حال ایک سازش کا نتیجہ تھا اور اسے فردِ واحد کا کام کہنا، جسے وزیر اعظم سے کسی طرح کی ذاتی پُرخاش بھی نہیں تھی، حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ نواب صدیق علی خان نے اپنی تالیف: ''بے تیغ سپاہی'' میں لکھا ہے: ''جب لوگوں کا غم ذرا ہلکا ہُوا تو وہ سوچ بچار کے بعد اِس نتیجے پر پہنچے کہ شہیدِ ملت کو کسی گہری سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ لوگ کسی مبینہ شہادت کے بغیر، سازشیوں کے نام بھی گنوانے لگے۔ شک وشبے کی بنیاد پر کسی عینی یا کم از کم قرائنی شہادت کے بغیر کسی کو سُولی پر تو نہیں چڑھایا جا سکتا، لیکن اِس مُسلمہ قول کی ہمہ گیری سے بھی کوئی بالکل چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ کہ ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔''

خواجہ ناظم الدین بطور وزیر اعظم

(17 اکتوبر 1951ء تا 17 اپریل 1953ء)

لیاقت علی خان کی وفات کے بعد گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ہوئے اور وزیر مالیات غلام محمد ان کی جگہ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین ایک نیک دل مسلمان تھے، لیکن اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے بطور سربراہِ حکومت زیادہ کامیاب نہ رہے۔ ان کے عہد میں غلے کی کمی پیدا ہوگئی، سرکاری ملازمین سیاست میں دخل دینے لگے اور آئین سازی کی

رفتار سست پڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان کے حصے کا نہری پانی ضرورت کے وقت پھر بند کرنا شروع کر دیا، جس سے فصلوں کو بہت نقصان پہنچا۔

22 دسمبر 1952ء کو خواجہ ناظم الدین نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی، جس میں سفارش کی گئی تھی کہ مرکز میں دوایوانی مقننہ قائم کی جائے، علما کا ایک بورڈ بنایا جائے، جو یہ دیکھے کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہیں یا نہیں اور کابینہ صرف ایوان نمائندگان کے سامنے جوابدہ ہو۔

1953ء کے اوائل میں مجلس احرار نے قادیانی فرقے کے خلاف ایک تحریک چلائی، جس نے پنجاب کے علاقے میں نظم ونسق کی صورت حال بہت خراب کر دی۔ آخر فوج نے حالات پر قابو پایا۔ صوبائی حکومت برطرف ہوگئی اور فیروز خان نون کو نیا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ 17 اپریل کو گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو بھی جبراً برطرف کر دیا۔ حالانکہ انھیں مجلس قانون ساز کے ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ یہ فعل پارلیمانی جمہوریت کے معروف اصولوں کے منافی سمجھا گیا۔

محمد علی بوگرا بطور وزیر اعظم

(17 اپریل 1953ء تا 11 اگست 1955ء)

ملک غلام محمد نے محمد علی بوگرا کو، جو اس وقت واشنگٹن (امریکہ) میں پاکستان کے سفیر تھے، نئی حکومت بنانے کی دعوت دی اور خود ہی وزارتی کونسل کی فہرست تیار کر دی۔ محمد علی بوگرا ملکی حالات پر قابو نہ پا سکے۔ بھارت سے نہری پانی کا تنازع نیا رخ اختیار کر گیا۔ عالمی بنک نے تجویز پیش کی کہ تین مشرقی دریاؤں (ستلج، بیاس اور راوی) پر بھارت کا حق تسلیم کر لیا جائے اور پاکستان میں رابطے کی نہریں بنا کر پانی کی کمی کو پورا کیا جائے۔ پاکستان کے لیے یہ تجویز ناقابل قبول تھی۔ اسی زمانے میں بھارت نے اعلان کر دیا کہ کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ مکمل طور پر ہو چکا ہے۔ یہ سلامتی کونسل کی قراردادوں سے کھلا انحراف تھا۔ شیخ عبداللہ نے بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا۔

محمد علی بوگرا کے زمانۂ وزارت میں پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے خدوخال پوری طرح ابھر آئے۔ مسلمان ممالک کے ساتھ مراسم مزید گہرے ہو گئے اور پاکستان نے اقوام متحدہ میں مسلمان ملکوں کی ہر طرح امداد کی۔ بوگرا نے بھارت جا کر دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر بنانے کی بھی کوشش کی۔ اسی دور میں امریکہ سے فوجی اور اقتصادی معاہدے ہوئے، جن میں Cento (معاہدہ بغداد) اور Seato (جنوب مشرقی ایشیا کا دفاعی معاہدہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی رو سے کمیونسٹ بلاک کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنا رکن ممالک پر لازم تھا۔

1954ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو متحدہ محاذ کے ہاتھوں، جس کے سربراہ فضل الحق تھے، بری طرح شکست ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں ان انتخابات نے مسلم لیگ کا اثر ختم کر دیا اور عوامی لیگ ایک طاقتور سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی، جس کے قائد حسین شہید سہروردی تھے۔ اس جماعت نے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے بنانے اور توڑنے میں اہم حصہ لیا۔ ان انتخابات کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ آئین ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت پر بھی شک کا اظہار کیا جانے لگا۔ گورنر جنرل کی مداخلت سے بچنے کے لیے وزیر قانون مسٹر بروہی نے 3 اگست 1954ء کو ایک مسودۂ قانون پیش کیا، جسے منظور کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں آئین ساز اسمبلی نے ایک اور قرارداد بھی منظور کی، جس کی رو سے گورنر جنرل کے اختیارات میں کمی کر دی گئی۔ اس کے بعد بنیادی اصولوں کی ترمیم شدہ رپورٹ منظور کی گئی اور اسے مسودۂ آئین کی شکل دینے کے لیے ماہرین کے پاس بھیج دیا گیا۔ طے پایا کہ یہ مسودہ 27 اکتوبر کو آئین ساز اسمبلی کے ہاتھوں میں آ جائے۔ عین اس وقت جب اسمبلی دستور سازی کا کام ختم کر چکی تھی، 24 اکتوبر کو گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت اسے برطرف کر دیا اور اعلان کیا کہ یہ اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ مولوی تمیز الدین خان نے، جو اس کے سپیکر تھے، گورنر جنرل کے حکم کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں دعویٰ دائر کر دیا، جس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن بعد میں فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کے حکم ہی کو بحال رکھا۔

محمد علی بوگرا نے گورنر جنرل کی دعوت پر نئی وزارت تشکیل کی، جس میں اسکندر مرزا، سہروردی، ڈاکٹر خان صاحب اور جنرل ایوب خان کمانڈر انچیف کو بھی شامل کر لیا۔ اسی زمانے میں وحدت مغربی پاکستان کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اناج کی کمی کو بیرونی ملکوں سے غلہ منگوا کر پورا کیا گیا۔ حکومت نے سمگلنگ کی روک تھام اور قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔

جولائی 1955ء میں دستور ساز اسمبلی کے نئے انتخابات ہوئے، جن کے بعد محمد علی بوگرا پارٹی کے سربراہ نہ بن سکے اور سفیر بن کر واپس واشنگٹن چلے گئے۔ خیال تھا کہ اب سہروردی کو حکومت تشکیل کرنے کا موقع دیا جائے گا، لیکن اثنا میں غلام محمد، جو انھیں کابینہ میں لائے تھے، بیمار ہو کر رخصت پر چلے گئے اور ان کی جگہ اسکندر مرزا قائم مقام گورنر جنرل بن گئے۔

چوہدری محمد علی کا دور وزارت

(11 اگست 1955ء تا 12 ستمبر 1956ء)

سکندر مرزا نے مولوی فضل الحق سے رشتہ استوار کیا اور سابق وزیر مالیات چوہدری محمد علی کو، جو مسلم لیگ پارٹی سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور جنھیں متحدہ محاذ کی حمایت حاصل تھی، وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اس طرح مسلم لیگ اور متحدہ محاذ کی مخلوط وزارت قائم ہوگئی۔

10 اکتوبر 1955ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ملا دیا گیا اور یوں وحدت مغربی پاکستان وجود میں آئی۔ فروری 1956ء میں پاکستان کا دستور منظور ہوا، جو 23 مارچ 1956ء کو نافذ کر دیا گیا۔ یہ دستور جمہوری اور پارلیمانی طرز کا تھا اور اس میں ملک کو جمہوریہ اسلامیۂ پاکستان کا نام دیا گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین سازی کی تاریخ'')۔

چوہدری محمد علی نے اپنے دور وزارت میں کوشش کی کہ ''سیٹو'' اور ''سنٹو'' کے معاہدات کا اطلاق صرف اشتراکی جارحیت ہی کے خلاف نہیں بلکہ ہر قسم کی جارحیت کے خلاف کیا جائے، لیکن ان معاہدات میں شامل بڑے ممالک، یعنی امریکہ اور برطانیہ، اس موقف کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اس سلسلے میں پاکستان کو صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ''سیٹو'' کے ارکان نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کا اقتدار ''ڈیورنڈ لائن'' تک وسیع ہے۔

1956ء تک پاکستان صنعتی میدان میں خاصی ترقی کر چکا تھا، لیکن افراطِ زر کے باعث ملک کا میزانیہ بھی متاثر ہو رہا تھا، چنانچہ پاکستانی روپے کی قیمت کم کر کے بھارتی روپے کے برابر کر دی گئی۔

نئے آئین کے نفاذ کے بعد میجر جنرل اسکندر مرزا کو صدر منتخب کیا گیا تھا۔ پاکستان کے پہلے صدر کی زندگی انگریزی عہد میں فوج اور محکمہ خارجہ کی ملازمت میں گزری تھی اور انھیں نوآبادیاتی طرز کے نظم ونسق کا بڑا تجربہ تھا۔ ذاتی طور پر وہ صدارتی نظام حکومت کے حق میں تھے اور مرکز کے اختیارات کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے تھے۔ وزیر اعظم نے بھی عمر بھر سرکاری ملازمت ہی کی تھی اور عوام سے ان کا کوئی براہ راست رابطہ نہیں رہا تھا۔ انھوں نے مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کے لیے ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت

کی، جو آزادی سے قبل مشہور کانگریسی رہنما رہ چکے تھے۔ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ارکان نے سردار بہادر خان کو اپنا قائد منتخب کر کے گویا چوہدری محمد علی کے خلاف اعتماد کا اظہار کر دیا۔ ادھر وزیر اعظم کی حمایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ری پبلکن کے نام سے اپنی الگ پارٹی بنالی، جس میں مرکز اور مغربی پاکستان کی اسمبلیوں کے کئی ارکان شامل ہو گئے مزید برآں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ لیاقت علی خان کے زمانے سے وزیر اعظم ہی کے پاس رہتا آیا تھا، لیکن چوہدری محمد علی نے اس روایت کو توڑ دیا۔ لیگ کے نئے صدر عبدالرب نشتر ہو گئے اور چوہدری محمد علی کے تمام مخالفین ان کے پرچم تلے متحد ہو گئے۔ اختلافات بڑھتے گئے، تا آنکہ مسلم لیگ نے ان کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ مرکزی اسمبلی میں اگرچہ وزیر اعظم کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی، تاہم انھوں نے اپنے عہدے سے چمٹا رہنا گوارا نہ کیا اور مستعفی ہو گئے۔

حسین شہید سہروردی

(12 ستمبر 1956ء تا 18 اکتوبر 1957ء)

سکندر مرزا کی دعوت پر عوامی لیگ کے رہنما سہروردی نے ری پبلکن پارٹی کے اشتراک سے وزارت بنالی۔ ان کے عہد میں پناہ گزینوں کی آبادکاری پر خاصی توجہ دی گئی، سرکاری ملازمین کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کیا گیا اور خوراک کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے دس لاکھ ٹن غلہ درآمد ہوا۔ اسی زمانے میں اسمبلی نے مخلوط انتخاب کے حق میں رائے دی۔

سہروردی مغربی بلاک کے ساتھ رہنے کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک فوجی معاہدوں میں شمولیت پاکستان کی بقا کے لیے ضروری تھی اور غیر جانب دار رہنے میں جارحیت کا شکار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ذاتی مقبولیت کی پروا کیے بغیر ہنگری اور اس کے بعد مشرق وسطیٰ کے مسائل میں، خصوصاً سویز کے بحران کے موقع پر، مغربی ممالک کا ساتھ دیا۔ اس موقف کی وجہ سے عرب پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ بایں ہمہ وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے جنھوں نے چین کا دورہ کر کے باہمی تعلقات کی بنیاد رکھی۔

سہروردی کی وزارت بڑی حد تک ری پبلکن پارٹی کی حمایت پر قائم تھی، لیکن دونوں کی پالیسی میں بہت زیادہ فرق تھا، چنانچہ کچھ عرصے کے بعد دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے، جو اتنے بڑھے کہ اسکندر مرزا نے سہروردی کو قانونی تکلفات پورے کیے بغیر برطرف کر دیا۔

آئی۔ آئی۔ چندریگر

(18 اکتوبر 1957ء تا 16 دسمبر 1957ء)

سہروردی کے بعد صدر نے اسماعیل چندریگر کو وزیر اعظم بنا دیا، جو مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ ری پبلکن، کرشک سرمک اور نظام اسلام پارٹیوں کی حمایت سے وزارت بنائی، مگر ان چار سیاسی جماعتوں کا اشتراک عمل ممکن نہ تھا، چنانچہ چھ ہفتے بعد انھیں وزارتِ اعظمیٰ سے الگ ہونا پڑا۔

فیروز خان نون

(16 دسمبر 1957ء تا 7 اکتوبر 1958ء)

ری پبلکن پارٹی کی حمایت سے یکے بعد دیگرے تین وزرائے اعظم (چوہدری محمد علی، سہروردی اور چندریگر) برسرِ حکومت آ چکے تھے۔ اب اس کے اپنے رہنما فیروز خان نون کو وزارت بنانے کا موقع دیا گیا۔

نئے وزیر اعظم نے مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کی تعریف کی، لیکن مغربی پاکستان میں اس کی مخالفت کی گئی۔ ان کے زمانے میں گوادر کا علاقہ، جو کسی زمانے میں سلطان مسقط کو اجارے پر دیا گیا تھا، پاکستان کو واپس مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں بیروباری کا علاقہ مدت سے بھارت اور پاکستان کے درمیان متنازع فیہ چلا آ رہا تھا۔ فیروز خان نون نے دہلی جا کر اس سلسلے میں گفت وشنید کی اور معاہدے کی رو سے بھارت نے اسے پاکستان کا حصہ تسلیم کر لیا (لیکن اس کا قبضہ ابھی تک نہیں مل سکا)۔ اسی زمانے میں کشمیری مہاجرین نے کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے ایک جماعت بنائی تاکہ خط متارکہ پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑی جائے، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

بحیثیت مجموعی فیروز خان نون کا مختصر دور وزارت بے یقینی، جوڑ توڑ اور انتشار کا دور تھا۔ مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ برسر اقتدار تھیں، لیکن اصل طاقت صدر سکندر مرزا کے ہاتھ میں تھی۔ مشرقی پاکستان نے گورنر اے۔ کے۔ فضل الحق نے جب عطاء الرحمٰن کی وزارت کو برطرف کیا تو عوامی لیگ کے دباؤ کے باعث نون حکومت نے فضل الحق کو ان کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کا زور تھا۔ اس کی روک تھام کے لیے فوج طلب کی گئی، لیکن یہ مہم جلد ختم ہو گئی۔ افراطِ زر، غلے کی کمی اور زرمبادلہ کے ضیاع ایسے مسائل نے خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اسی زمانے میں مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کو کسی مخبوط الحواس نوجوان نے ہلاک کر دیا۔ بعض لوگوں نے اسے سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی۔ ادھر عوامی لیگ، جو اب تک مرکزی حکومت میں عہدے قبول کرنے سے گریزاں رہی تھی، وزارت میں حصہ لینے کا مطالبہ کرنے لگی، جو مان لیا گیا۔ اس کے خلاف مسلم لیگ نے جگہ جگہ مظاہرے کیے اور لوگوں میں حکومت کے خلاف بے چینی پھیل گئی۔

مارشل لاء کا نفاذ

حالات اب قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے، چنانچہ 7 اکتوبر 1958ء کی رات کو صدارتی فرمان کے ذریعے دستور کو معطل کر کے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ وزارتیں برطرف کر دی گئیں، قانون ساز اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ صدر سکندر مرزا نے بری فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ بعد میں انھیں اپنے منصب سے علیحدہ ہونا پڑا اور جنرل ایوب خان نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

صدر محمد ایوب خان کا دور

(27 اکتوبر 1958ء تا 25 مارچ 1969ء)

نئی کابینہ فوجی جرنیلوں اور شہری اکابر پر مشتمل تھی۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور صدر ایوب خان کے وزراء نے صدارتی کابینہ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔

ابتدائی اقدامات

نئی حکومت نے معاشرتی اور معاشی برائیوں کے خاتمے کے لیے فوری اقدامات کیے جن کے نتیجے کے طور پر سمگلنگ، جس کے باعث کروڑوں روپے کا ناجائز کاروبار ہوتا تھا، تقریباً ختم ہو گئی اور چور بازاری، قیمتوں میں بے جا اضافے، رشوت ستانی، عہدوں کے ناجائز استعمال اور سرکاری واجبات کی عدم ادائی کے خلاف کامیاب کارروائیوں سے عام فضا بہت بہتر ہو گئی اور حکومت پر لوگوں کا اعتماد بحال ہو گیا۔ حکومت نے مہاجرین کی بحالی اور انھیں بھارت میں چھوڑی ہوئی جائدادوں کا معاوضہ دینے کے لیے موثر کاروائی کی اور مختصر عرصے میں ان کی بحالی اور آبادکاری کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ زرمبادلہ کی صورت حال بہتر بنانے کے لیے بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا اور ناجائز تجارت کی روک تھام کی گئی۔ ان اقدامات سے سرکاری اخراجات میں بھی معتد بہ کمی واقع ہوئی اور تعمیری منصوبوں کے لیے کافی روپیہ بچ رہا۔

سیاست دانوں اور سرکاری ملازمین کی تطہیر

سیاسی انتشار کے دور میں انتظامیہ میں بہت سی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں بلکہ سابقہ حکومتوں کی غلط روی کی بھی بڑی حد تک یہی ذمے دار تھی، چنانچہ نااہلی، خود غرضی اور رشوت کا خاتمہ کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کی بڑے وسیع پیمانے پر تطہیر کی گئی اور ہر درجے کے سینکڑوں ملازمین برخاست کر دیئے گئے۔

7 اکتوبر 1958ء کے اعلان کی رو سے تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے کر ان کی املاک ضبط اور دفاتر سربمہر کر دیئے گئے تھے۔ سابق سیاست دانوں کا اثر ورسوخ ختم کرنے اور سیاست میں ان کے دوبارہ داخلے پر پابندی لگانے کے لیے ''ایبڈو'' (Elective Bodies Disqualifiacation Ordinance) نافذ کیا گیا اور سابق وزراء اور دوسرے عہدیداروں کی دھاندلیوں کی تفتیش اور سماعت کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ جن افراد پر اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور طاقت کے غلط استعمال وغیرہ کے الزامات ثابت ہوگئے انھیں چھ سال کے لیے سیاسی زندگی میں حصہ لینے سے محروم کر دیا گیا۔

دارالحکومت کی تبدیلی

جغرافیائی محل وقوع اور صنعتی وتجارتی مرکز ہونے کے باعث انتظامی اور دفاعی نقطۂ نظر سے کراچی موزوں دارالحکومت نہ تھا اور کسی نئے دارالحکومت کی تلاش عرصے سے کی جارہی تھی۔ چوہدری محمد علی کے دور وزارت میں گڈاپ کو صدر مقام بنانے کی تجویز کسی حد تک منظور ہوگئی تھی، لیکن بعد میں اس پر کوئی عملدرآمد نہ ہوسکا۔ نئی حکومت نے اس مسئلے پر بڑی سرگرمی دکھائی۔ راولپنڈی کے قریب ایک موزوں مقام کے آئندہ دارالحکومت کے لیے پسند کیا گیا۔ اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا، شہر کا نہایت خوبصورت نقشہ تیار ہوا اور بڑی تیزی سے اس کی تعمیر کا کام ہونے لگا۔

طویل المیعاد اصلاحات

نئی حکومت نے تیس کے قریب کمیشن مقرر کیے تاکہ وہ قومی زندگی کے ہر اہم پہلو کی اصلاح کے لیے رپورٹیں مرتب کریں، چنانچہ زراعت، صنعت، تعلیم، عائلی قوانین، مزدوروں کے مسائل اور مالی حکمت عملی وغیرہ کے سلسلے میں اصلاحات نے قومی زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔ تاہم عائلی قوانین میں بہت سی چیزیں اسلامی تعلیمات سے متصادم تھیں۔

زراعت

سابقہ حکومتوں نے صنعتی ترقی کی طرف توجہ کرتے وقت زراعت کو، جسے پاکستان کی اقتصادیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، نظر انداز کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فالتو اناج پیدا کرنے والے ملک کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے باہر سے اناج درآمد کرنا پڑا۔ نئی حکومت نے زرعی اصلاحات نافذ کیں، جن کی رو سے صوبۂ مغربی پاکستان میں ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی (زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایکٹر زیر کاشت یا ایک ہزار ایکٹر بنجر اراضی)، غیر قانونی طور پر حاصل کی ہوئی اراضی اور جاگیریں ضبط اور حد ملکیت سے زیادہ زمین مالکان اراضی کو مناسب معاوضہ دے کر حاصل کی گئی۔ اس طرح تقریباً سوا بائیس لاکھ ایکڑ رقبہ حاصل کر کے اسے ڈیڑھ لاکھ کسانوں میں تقسیم کر دیا گیا، جن کے پاس چپہ بھر زمین بھی اپنی نہیں تھی۔ علاوہ ازیں موروثی مزارعین کو حقوق ملکیت دے دیئے گئے۔ اس سے صوبے کی تقریباً پانچ لاکھ زراعت پیشہ آبادی مستفید ہوئی۔ مزید برآں پانی کی تقسیم کا نظام بہتر بنایا گیا اور بہتر بیج، کھاد اور کھیتی باڑی میں مشینوں کے استعمال کو رواج دے کر ملک کو غلے کے معاملے میں خود کفیل بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔

صنعت

تقسیم برصغیر کے وقت پاکستانی علاقوں میں کوئی قابل ذکر صنعت نہ تھی، اگرچہ یہاں وافر مقدار میں خام مال پیدا ہوتا تھا۔ صنعتی ترقی کے ایکٹ مجریہ 1949ء کی رو سے ملک میں صنعتوں کے قیام کے لیے مرکزی حکومت کی منظوری لازم قرار دی گئی۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (PIDC) کا قیام 1951ء میں عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کا کام یہ تھا کہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے بھاری صنعتیں قائم کر کے بعد میں نجی سرمایہ کاروں کے ہاتھ منتقل کر دے۔ اس ادارے کی کارگردگی شروع ہی سے اچھی رہی ہے، لیکن انقلابی حکومت نے اصلاح احوال کے لیے متعدد اقدامات کر کے ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار کو کافی تیز کر دیا اور پارچہ بافی، کاغذ سازی، سگریٹ سازی، دوا سازی اور پٹ سن کی صنعت وغیرہ میں ملک نہ صرف خود کفیل ہوگیا بلکہ تیار شدہ مال بیرونی ممالک میں بھی جانے لگا۔ سوئی گیس کے استعمال اور نئے بجلی گھروں کے قیام نے صنعتی پیداوار کی صلاحیت کو کافی بڑھا دیا۔

تعلیم

اگست 1959ء میں صدر کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے اپنی ضخیم رپورٹ پیش کی اور اس میں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے بارے میں متعدد بنیادی تبدیلیاں تجویز کی گئیں، جنھیں عملی جامہ پہنانے میں کثیر رقم صرف ہوئی، تاہم اس سے متوقع نتائج برآمد نہ ہوسکے۔

سندھ طاس کا معاہدہ

نہری پانی کا جھگڑا ہندوستان سے بدستور چلا آرہا تھا اور اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ اسے ختم کرنے کے لیے عالمی بنک کے توسط سے ستمبر 1960ء میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا، جس کی رو سے مغربی پاکستان کے تین مشرقی دریاؤں، یعنی ستلج، بیاس اور راوی، پر ہندوستان کا اور تین مغربی دریاؤں پر یعنی چناب، جہلم اور سندھ پر پاکستان کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا اور طے پایا کہ دس سال تک ہندوستان پاکستان کو بدستور پانی مہیا کرتا رہے گا، مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں مغربی دریاؤں کا رخ بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا، 1970ء تک پاکستان دو بند تعمیر کرے گا اور چار سو میل لمبی نہریں کھودے گا تاکہ مستقبل میں وہ ان کی مدد سے اپنی ضروریات پوری کرسکے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس منصوبے کے اخراجات سندھ طاس ترقیاتی فنڈ سے پورے کیے جائیں گے، جسے آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، مغربی جرمنی، امریکہ اور ہندوستان کے تعاون سے قائم کیا جائے گا۔ مسئلے کا یہ حل کئی پہلوؤں سے پاکستان کے لیے خوشگوار نہ تھا، لیکن موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

آئین اور نئے انتخابات

صدر ایوب نے زمام اقتدار سنبھالتے وقت اعلان کیا تھا کہ جمہوری زندگی بحال کردی جائے گی۔ اکتوبر 1959ء میں بنیادی جمہوریتوں کا حکم جاری کیا گیا، جس کے تحت بالغ رائے دہی کے اصول پر دونوں صوبوں سے دس ہزار ارکان منتخب ہوئے۔ اگلے سال صدر نے ان سے اعتماد کا ووٹ لے کر اپنی نمائندہ حیثیت مضبوط کرلی۔ ملک کا نیا آئین مرتب کرنے کی غرض سے سپریم کورٹ کے ایک جج کی سربراہی میں آئین کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا، جس کی رپورٹ میں بہت سی ترمیمات کرنے کے بعد صدر نے یکم مارچ 1962ء کو نئے آئین کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک جمہوری، وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا دستور تھا، جس میں ملک کے دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی، مرکز کو بہت مضبوط رکھا گیا تھا اور صدر مملکت کو انتظامیہ اور قانون سازی کے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے بذیل ''آئین سازی کی تاریخ'')۔ اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے

اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے رکن چنے۔ 8 جون 1962ء کو راولپنڈی میں نئی قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ اسی روز صدر ایوب خان نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا، مارشل لاء ختم کر دیا گیا اور حکومت کا کاروبار عام ملکی قانون کے تحت چلنے لگا۔

نئے آئین کے بعد

مارشل لاء کے زمانے میں سیاسی جماعتوں پر پابندیاں لگ جانے کے باعث ملک میں تمام سیاسی سرگرمیاں ختم ہوگئی تھیں اور اکثر سیاسی رہنما ''ایبڈو'' کے تحت سیاست میں حصہ لینے سے روک دیئے گئے تھے، اس کے باوجود بنیادی جمہوریتوں اور بعد ازاں اسمبلیوں کے انتخابات کے دوران میں یہ بات واضح ہوگئی کہ ابھی تک ملک میں ایک بڑا طبقہ صدارتی طرز حکومت کا مخالف اور پارلیمانی جمہوریت کے حق میں ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں بحال کی جائیں اور بنیادی جمہوریتوں کے بجائے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اسمبلیوں کے انتخابات عمل میں آئیں۔ قومی اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کی بحالی کا قانون منظور کر لیا، لیکن 1962ء میں ہونے والے عام انتخابات کے لیے بنیادی جمہوریتوں کی انتخابی ادارے کی حیثیت برقرار رکھی۔

حزب مخالف کا ایک گروہ سیاسی جماعتوں کی بحالی اور انتخابات کا قائل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ ایک متحدہ کمان کے تحت آئین کو جمہوری بنانے کی مہم شروع کی جائے، لیکن بیشتر سیاست دانوں نے اپنی اپنی جماعتوں کو بحال اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں ایک اچھی خاصی حزب اختلاف اسمبلی کے اندر اور باہر وجود میں آگئی۔ اسی زمانے میں پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی اور اس کی صدارت صدر محمد ایوب خان نے سنبھال لی۔

1964ء میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ حزب اختلاف کی تقریباً تمام اہم جماعتوں نے ایک نو نکاتی پروگرام کے تحت متحدہ محاذ بنایا اور صدارتی انتخابات کے لیے اپنے امیدوار کی حیثیت سے قائد اعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو چنا۔ 1964ء میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابی نتائج کا اعلان ہوا۔ جنوری 1965ء کو صدارتی انتخاب ہوا اور صدر محمد ایوب خان ایک بار پھر منتخب ہوگئے۔ ان انتخابات کا ایک اہم پہلو، جس کے تحت بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے، یہ تھا کہ انتخابی مہم کے دوران میں سرکاری جماعت کو اپنی کارگردگی ظاہر کرنے کا اور مخالف سیاسی رہنماؤں کو حکومت کی غلطیاں اور نظم ونسق کی خرابیاں عوام کے سامنے پیش کرنے کا پورا موقع مل گیا اور وہ تصویر کے دونوں رخوں سے واقف ہوگئے۔ عین ممکن تھا کہ ملک میں پارلیمانی جمہوریت کے لیے کوئی تحریک شروع ہو جاتی، لیکن بھارت کی روز افزوں معاندانہ سرگرمیوں سے قوم کی پوری توجہ دفاع مملکت کی طرف مبذول ہوگئی۔

بھارت سے جنگ

1965ء کے اوائل میں بھارتی فوج نے رن کچھ میں پاکستان کے کچھ علاقے پر فوجی قبضہ کر لیا تو پاکستانی افواج حرکت میں آگئیں اور انھوں نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ ستمبر 1965ء میں بھارت نے اعلان جنگ کیے بغیر مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی سترہ روز تک جاری رہی۔ اس کے دوران میں پاکستانی افواج نے شجاعت، استقلال اور جواں مردی کا اور عوام نے اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کا فقید المثال مظاہرہ کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی حملے میں بھارتی افواج پاکستانی علاقے کے جس محدود رقبے پر قابض ہوگئیں تھیں، وہاں سے نہ صرف یہ کہ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکیں بلکہ پاکستانی فوجوں نے پیش قدمی کر کے ان کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا۔

23 ستمبر کی صبح کو سلامتی کونسل کی ہدایت پر جنگ بندی ہوئی۔ 10 جنوری 1966ء کو روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیجن کی وساطت سے تاشقند کے مقام پر دونوں ملکوں کے سربراہوں نے اس امر پر رضامندی ظاہر کر دی کہ فوجیں 5 اگست 1965ء کو پرانی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی اور باہمی تنازعات گفت وشنید کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔

اعلان تاشقند کے بعد

جنگ کے دوران میں کشمیر کی گتھی کچھ سلجھتی دکھائی دی تھی۔ اعلان تاشقند سے یہ مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا اور مقبوضہ کشمیر کے جو علاقے فتح کر لیے گئے تھے وہ واپس دینے پڑے۔ اس سے عوام میں بڑی مایوسی اور بے دلی پھیلی اور جگہ جگہ اعلان تاشقند کے خلاف مظاہرے ہوئے، جنھیں بڑی سختی سے دبا دیا گیا۔

1958ء کے انقلاب کے بعد ملک کی تمام خرابیوں کا ذمے دار سیاست دانوں کو ٹھہرایا گیا تھا، اگرچہ اس دوران میں زیادہ عرصہ ایسا گزرا تھا جب سربراہ مملکت کے عہدے پر دو ریٹائرڈ سرکاری ملازم، یعنی ملک غلام محمد اور میجر جنرل اسکندر مرزا، فائز رہے تھے اور انھوں نے وقتاً فوقتاً مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ کر، بار بار وزارتیں بدل کر، عام انتخابات کو التوا میں ڈال کر، سرکاری ملازمین کو سیاست میں دخیل بنا کر، کبھی ایک اور کبھی دوسری جماعت کو برسر اقتدار لا کر، حتی الامکان اس امر کی کوشش کی تھی کہ وہ اقتدار اعلیٰ پر قابض رہیں۔ انقلابی حکومت کے ابتدائی اقدامات کو تہ دل سے سراہا گیا اور کچھ عرصے کے لیے یوں نظر آنے لگا کہ اب سابقہ حکومتوں کی بدعنوانیوں کا اعادہ کبھی نہ ہوگا، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حکومت پر صدر مملکت کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور عوامی نمائندوں کی جگہ نوکر شاہی لیتی گئی۔ تمام اختیارات مرکز میں مرکوز کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگوں کو اپنی معمولی سے معمولی تکلیف کے ازالے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آنے لگیں۔ 1964ء کے عام انتخابات ہوئے تو انتخابی جلسوں میں حزب اختلاف نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا اور لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ شخصی حکومت کے ذریعے انھیں جمہوری حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، برسر اقتدار طبقہ اپنے مناصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملکی وسائل کو محدود مفادات کے تحت استعمال کرنے لگا ہے، انتظامیہ میں زراندوزی اور رشوت ستانی زوروں پر ہے اور ملک کی دولت کا ارتکاز معدودے چند گھرانوں میں ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے عوام میں بے چینی روز بروز بڑھنے لگی۔ اعلان تاشقند نے ایک تازیانے کا کام دیا اور حکومت کے خلاف کھلم کھلا مظاہرے ہونے لگے۔ ان کے خلاف حکومت نے امن وضبط کے نام پر جس ردعمل کا اظہار کیا اس سے عوام ایک بار پھر سیاست دانوں سے توقعات وابستہ کرنے لگے۔

1967ء میں پانچ سیاسی جماعتوں (مسلم لیگ کونسل، قومی جمہوری محاذ، نظام اسلام پارٹی، جماعت اسلامی اور عوامی لیگ) نے مندرجہ ذیل آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت تحریک جمہوریت پاکستان کا آغاز کیا:

1۔ وفاقی پارلیمانی طرز حکومت کا قیام اور بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست انتخابات۔

2۔ مکمل علاقائی خودمختاری۔

12 فروری 1969ء کو مجلس عمل کی اپیل پر ملک بھر میں مکمل ہڑتال ہوئی اور دو روز بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے سوا، تمام رہنماؤں کی رہائی اور ہنگامی حالت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ 21 فروری کو صدر ایوب نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے

3۔ وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع، خارجہ امور، کرنسی، وفاقی مالیات، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کے امور رہنے چاہئیں۔
4۔ دس سال کے اندر دونوں صوبوں میں عدم مساوات کا خاتمہ۔
5۔ کرنسی، زرمبادلہ، مرکزی بینکاری، بیرونی تجارت، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کا انتظام کرنے کے لیے دونوں صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان کے منتخبہ بورڈ کا قیام۔
6۔ دس سال کے اندر ملازمتوں میں مساوات۔
7۔ دفاعی معاملات میں مساوات۔
8۔ 1956ء کے آئین کی رو سے سات شقوں کا نفاذ۔

یاد رہے کہ عوامی لیگ آگے چل کر دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ اس کے مشرقی پاکستان کے اکثر ارکان نے شیخ مجیب الرحمٰن (جو اس وقت جیل میں تھے) کی قیادت میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے چھ نکاتی مطالبات پیش کر دیے۔

تحریک جمہوریت پاکستان کے رہنماؤں نے وسیع پیمانے پر دورے کر کے ملک کے دونوں حصوں کے عوام سے رابطہ پیدا کیا اور یوں یہ تحریک آگے بڑھتی گئی۔ 1968ء کی آخری سہ ماہی میں حکومت نے صدر ایوب خان کی حکومت کے دس سال پورے ہونے پر بڑے جوش و خروش سے عشرہ ترقی و اصلاحات منایا اور اس سلسلے میں سرکاری محکموں اور ملازمین نے انتہائی دلچسپی اور سرگرمی دکھائی۔ اسی زمانے میں بنیادی جمہوریت کے بعض اداروں میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ ایوب خان کو تاحیات صدر پاکستان بنا دیا جائے۔ اس کا عوام میں شدید ردعمل ہوا اور مختلف عنوانات سے ملک بھر میں مظاہرے ہونے لگے اور برسر اقتدار جماعت کنونشن مسلم لیگ کے سوا باقی تمام جماعتوں نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات، خودمختار پارلیمنٹ اور اسلامی جمہوری حکومت کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ان پُرامن مظاہروں کو تشدد سے فرو کرنے کی کوشش کی گئی اور بعض مقامات پر خود مظاہرین نے بھی تشدد کا ثبوت دیا۔ 1969ء کے اوائل میں تین اور جماعتیں (نیشنل عوامی پارٹی کا ولی خاں گروپ، جمعیۃ العلمائے اسلام کا ہزاروی گروپ اور چھ نکاتی عوامی لیگ) بھی تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل ہو گئیں۔

10 جنوری کو ان سب جماعتوں کے نمائندوں نے بحالیٔ جمہوریت کی مشترکہ جدوجہد کے لیے جمہوری مجلس عمل قائم کی اور اعلان کیا کہ جب تک ان کی آٹھ شرائط پوری نہیں کی جاتیں وہ انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔

صدر ایوب خان نے شروع شروع میں ان مطالبات کو کوئی اہمیت نہ دی، لیکن جب مظاہروں کی شدت سے حکومت کا نظم و نسق معطل ہونے لگا تو انھوں نے یکم فروری کو اعلان کیا کہ وہ آئینی اور سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے حزب اختلاف سے گفتگو کریں گے۔ مجلس عمل نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لیے یہ شرائط پیش کیں:

1۔ ہنگامی حالت فوراً ختم کر کے ڈیفنس آف پاکستان رولز منسوخ کیے جائیں۔
2۔ تمام سیاسی لیڈروں اور طلبہ کو رہا کیا جائے۔
3۔ پورے ملک سے دفعہ 144 ہٹائی جائے۔
4۔ تحفظ امن عامہ اور پریس کے قوانین کے تحت اخبارات اور سیاسی کارکنوں کے خلاف کارروائیاں کالعدم قرار دی جائیں۔
5۔ طلبہ پر لاٹھی چارج کا سلسلہ ختم کیا جائے۔

12 فروری 1969ء کو مجلس عمل کی اپیل پر ملک بھر میں مکمل ہڑتال ہوئی اور دو روز بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے سوا، جو ان دنوں اگرتلہ سازش کیس میں ماخوذ تھے، تمام رہنماؤں (مثلاً ذوالفقار علی بھٹو، عبدالولی خان، وغیرہ) کی رہائی اور ہنگامی حالت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ 21 فروری کو صدر ایوب نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ اگلے روز اگرتلہ کیس واپس لے کر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کر دیا گیا۔ 26 فروری کو راولپنڈی میں گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا، جس میں تمام مخالف جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ آزاد رہنما ایئر مارشل اصغر خان اور جسٹس محبوب مرشد نے بھی شرکت کی۔ ذوالفقار علی بھٹو (پیپلز پارٹی) اور عبدالحمید خان بھاشانی (نیشنل عوامی پارٹی) نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ 10 مارچ کو عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کے بعد کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ صدر نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات اور پارلیمانی نظام کی بحالی کے مطالبات تسلیم کر لیے اور کانفرنس ختم ہو گئی۔ اسی روز شیخ مجیب الرحمان جمہوری مجلس عمل سے الگ ہو گئے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ”چھ نکات“ کی حمایت نہ کر کے مجلس نے مشرقی پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ 17 مارچ کو بھاشانی نے اعلان کیا کہ انتخابات نہیں ہونے دیے جائیں گے اور ”گھیراؤ اور جلاؤ“ پر عمل کیا جائے گا کیونکہ ہماری منزل پارلیمانی جمہوریت نہیں بلکہ عوامی انقلاب ہے۔ اگلے روز ذوالفقار علی بھٹو نے بھی بائیں بازو کی تمام جماعتوں کو متحد ہو کر موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کی تلقین کی۔ اس انتشار کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخابات کے ذریعے پرامن انتقال اقتدار کی صورت باقی نہ رہی اور ملک بھر میں خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہنگاموں اور بلووں کی ایک رو چل نکلی۔ ہڑتالوں کے علاوہ آتش زنی، لوٹ مار اور قتل و غارت کی بھی وارداتیں ہوئیں، جن کی روک تھام کے لیے 25 مارچ 1969ء کو پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے اور افواج پاکستان کے سربراہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔

جنرل یحییٰ خان کا دور صدارت

(از 25 مارچ 1969ء تا 20 دسمبر 1971ء)

نئی فوجی حکومت کے سامنے پہلا مسئلہ قدرتی طور پر امن کی بحالی اور نظم و نسق کی درستی کا تھا، تاہم جنرل یحییٰ خان نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی اعلان کر دیا کہ پاکستان میں جلد از جلد عوام کی امنگوں کے مطابق آئینی حکومت قائم کی جائے گی اور اقتدار ان کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا۔

صدر ایوب کی حکومت کے خاتمے کے بعد تین نئے نزاعی مسئلے ابھرے:

1۔ وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر کے سابقہ صوبوں کی بحالی۔
2۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کو ان کی آبادی کی اساس پر نمائندگی۔
3۔ صوبائی یا علاقائی خودمختاری۔

مارشل لاء حکومت نے شروع شروع میں ان اختلافات میں پڑنے کی بجائے نظم و نسق کی اصلاح، ضروری اشیاء کی گرانی، پاکستان کی غذائی صورت حال، ملک کے معاشی عدم استحکام، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات اور تعلیم و زراعت جیسے اہم مسائل پر پوری توجہ صرف کی، عوامی مطالبات کے پیش نظر سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کر کے ان پر مشتمل مالاکنڈ ڈویژن تشکیل کی گئی، الیکشن کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا اور انتخابی فہرستوں کی تیاری شروع ہو گئی۔

28 نومبر 1969ء کو صدر یحییٰ خان نے ایک نشری تقریر میں اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات ”ایک فرد، ایک ووٹ“ کی بنیاد پر 5 اکتوبر 1970ء کو منعقد ہوں گے، قومی اسمبلی 120 دنوں کے اندر دستور تیار کرے گی، جس کی منظوری کے بعد آئینی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ یکم جنوری 1970ء سے مکمل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی اور انتخابات سے پہلے مغربی پاکستان کی وحدت توڑ دی جائے گی۔

یکم جنوری 1970ء کو تمام سیاسی جماعتیں انتخابی مہم پر میدان میں نکل آئیں اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا پورے جوش و خروش سے آغاز ہوگیا۔ 28 مارچ کو صدر نے دستور کے بنیادی اصولوں کا اعلان کیا اور 31 مارچ کو انتخابات اور آئین ساز اسمبلی کے سلسلے میں قانونی ڈھانچے کا حکم جاری ہوا۔ اعلان کے مطابق دستور کے بنیادی اصول یہ تھے:

1۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگا۔

2۔ اسلامی نظریے کا، جو قیام پاکستان کی اساس ہے، تحفظ لازمی ہوگا۔

3۔ جمہوریت کے بنیادی اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔

4۔ شہریوں کے بنیادی حقوق متعین کیے جائیں گے۔

5۔ صوبوں کو انتظامی، مالیاتی اور آئین سازی کے امور میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے، لیکن وفاقی حکومت کے پاس اتنے اختیارات ضرور رہیں گے کہ وہ داخلی اور خارجی امور سے متعلق اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کر سکے۔

6۔ پاکستان کے ہر علاقے کو قومی امور میں پورا حصہ لینے کا موقع دیا جائے گا اور ان میں عدم مساوات کو ختم کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں دستور میں مملکت کی پالیسی کے حسب ذیل رہنما اصول بھی تجویز کیے گئے:

1۔ اسلامی نظام کا فروغ۔

2۔ اسلام کی اخلاقی اقدار کی پابندی۔

3۔ پاکستانی مسلمانوں کو قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنا۔

4۔ اس بات کی ہدایت کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔

یہ بھی اعلان کیا گیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 22 اکتوبر 1970ء سے شروع ہوں گے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس دستور کے نفاذ کے بعد ہوسکیں گے، قومی اسمبلی 120 دن کے اندر اندر دستور بنائے گی اور اس میں ناکام رہی تو توڑ دی جائے گی۔ قومی اسمبلی اپنا تیار کیا ہوا دستور توثیق کے لیے صدر کے سامنے پیش کرے گی اور اگر صدر اس کی توثیق نہ کریں تو اسمبلی ٹوٹ جائے گی اور اگر توثیق کر دیں گے تو دستور نافذ ہو جائے گا اور اقتدار قومی اسمبلی کو سونپ دیا جائے گا۔

ان اصولوں کی روشنی میں سیاسی جماعتوں نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے رہنماؤں نے منشور کا اعلان کیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے قوم کو خطاب کیا اور ملک کے دور دراز علاقوں کے دورے کیے۔ اس مہم کی قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ قومی سطح کی قیادت کا فقدان تھا۔ اکثر لیڈروں نے اپنے متعلقہ علاقوں کے مسائل کو اچھالتے ہوئے علاقائیت کا پرچار کیا۔

عوامی لیگ کے 6 نکات

عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان مشرقی پاکستان کے مسائل کے ساتھ پیش پیش تھا۔ ان کا انتخابی پروگرام چھ نکات پر مبنی تھا' جو درج ذیل ہیں:

1۔ حکومت وفاقی اور پارلیمانی ہوگی۔ جس میں انتخابات حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے اور نمائندگی آبادی کی بنیاد پر دی جائے گی۔

2۔ وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کی ذمہ دار ہوگی۔

3۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے لیے دو علیحدہ علیحدہ اور قابل تبادلہ کرنسیاں ہوں گی۔

4۔ مالیاتی پالیسی اور ٹیکس کے نفاذ کا اختیار وفاقی یونٹوں کی ذمہ داری ہوگی۔

5۔ آئینی ضابطے بنائے جائیں گے' تاکہ وفاقی یونٹوں کی متعلقہ حکومتوں کے زیر انتظام ہر ایک وفاقی یونٹ کی زرمبادلہ کی آمدنیوں کے علیحدہ حسابات مرتب دیئے جاسکیں۔

6۔ قومی سلامتی کے موثر تحفظ کے لیے وفاقی یونٹوں کی حکومت کو ملیشیا اور پیرا ملٹری فورس قائم کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے انتخابی منشور میں مرکز کو بہت کمزور اور بے اثر پیش کیا گیا۔ لیکن انھیں مہم میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی اور ان کے خلاف کوئی قانونی ضابطہ نافذ نہ کیا جاسکا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اکثریتی سیاسی طاقت تھی۔ مغربی پاکستان میں کم وبیش 20 سیاسی جماعتیں تھیں۔ بہرحال پاکستان پیپلز پارٹی سیاسی پلیٹ فارم پر ''اسلامی سوشلزم'' پر مبنی ایک نیا نعرہ لے کر آئی۔ اس جماعت نے عوام سے روٹی کپڑا اور مکان کا وعدہ کیا اور دعویٰ کیا کہ اسلام اور جمہوریت کے اصولوں پر مبنی سوشلزم رائج کرے گی۔

عوام کو قومی اسمبلی کو منتخب کرنا تھا۔ جسے آئین بنانا اور مرکزی مقننہ کی حیثیت میں کام کرنا تھا۔ اگر اسمبلی آئین بنانے میں ناکام ہوئی تو معاملہ عوام کے حوالے ہوتا۔ قومی اسمبلی میں نشستوں کی کل تعداد 313 ہونا تھی۔ انتخابات دسمبر 1970ء میں منعقد ہوئے۔ عوامی لیگ نے 167 نشستیں اور پیپلز پارٹی نے 87 نشستیں حاصل کیں۔ عوامی لیگ مغربی پاکستان سے ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکی اور مغربی پاکستان میں سیاسی پارٹیاں بشمول پیپلز پارٹی مشرقی پاکستان میں کوئی نشست نہ جیت سکیں۔ انتخابی نتائج کے مطابق عوامی لیگ مضبوط ترین پارٹی کی حیثیت سے نمودار ہوئی تھی۔

مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈروں نے مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پر اپنی بے چینی کا اظہار کیا جب کہ وہ ایک مضبوط ترین شخصیت کی حیثیت سے نمودار ہوا اور ملک کا آئین بنانے کے اہل تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو نے عوامی لیگ کے لیڈر کے ساتھ مل کر آئین بنانے سے اجتناب کیا جو کہ ملک کے اتحاد کو کمزور کر دیتا۔ انھوں نے عوامی لیگ کے لیڈر سے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے لیے مذاکرات کیے، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

ملک ایک عجیب بحران کا شکار تھا۔ اگر اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوتا اور عوامی لیگ قانون بناتی تو اس پر مغربی حصہ سے تنقید ہوتی۔ یہ صورت حال حکام کی غفلت اور لاپروائی سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر قانونی ڈھانچہ میں مرکز میں نمائندگی کی شق ہوتی کہ وہ آئین مرتب کر سکیں گے تو یہ مسئلہ کبھی کھڑا نہ ہوتا۔ ایک مرکزی آئین بنایا جانا تھا۔ مرکزی یونٹس اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ 1971ء کو منعقد ہونا تھا۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے مابین قابل عمل فارمولا کی غیر موجودگی میں اجلاس کا بائیکاٹ کرے ہوگا۔ یحییٰ خان نے جو مجیب الرحمان کی خواہشات کے بہت خلاف تھا' اجلاس کی آئندہ کوئی تاریخ دیئے بغیر ملتوی کر دیا۔ یہ امر مشرقی پاکستان میں عام ہڑتال اور سول نافرمانی کا باعث بنا۔

اس وقت ہندوستان نے اپنے علاقے سے دونوں بازوؤں کے درمیان پاکستانی پروازوں کو روک دیا اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک جامع پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں لاء اور آرڈر کی صورت حال بدتر ہوگئی۔ یحییٰ خان نے بھٹو اور مجیب الرحمٰن سے کئی ملاقاتیں کیں اور اعلان کیا کہ اسمبلی 25 مارچ کو ہوگی اور شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کا مستقبل کا وزیراعظم ہوگا، لیکن پاکستان دشمن طاقتیں سرگرم عمل تھیں۔ ہندو عناصر نے دونوں حصوں کے کسی صحیح سمجھوتے پر پہنچنے کو پسند نہ کیا۔ 23 مارچ کو مجیب الرحمٰن کی رہائش گاہ پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا گیا اور عوامی لیگ کے انتہا پسندوں نے پاکستانی جھنڈے کی توہین کی اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے غیر بنگالی مسلمانوں کے اخراج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس مقام پر

فوج نے مداخلت کی۔

فوج کو امن وامان بحال کرنے کے لیے کہا گیا۔ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا گیا۔ عوامی لیگ کی جیتی ہوئی بہت سی نشستوں کو خالی قرار دے دیا گیا۔ فوج امن وامان کی صورت حال بحال کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن اس اقدام کے نتیجے میں دونوں بازوؤں کے درمیان سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ ہندوستان حالات کا بغور مشاہدہ کررہا تھا۔ ہندوستان کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے روس کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ پر دستخط کیے اور فرانس، برطانیہ اور امریکا کے دورے کیے۔ ان دوروں کے دوران اس نے رائے عامہ میں پاکستان کے خلاف زہر افشانی کی۔

انڈیا نے بھی دعویٰ کیا کہ لاکھوں مہاجرین نے اس کے علاقے میں پناہ حاصل کرنے کے لیے سرحدوں کو عبور کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عوامی لیگ کے انتہا پسند اپنے مقصد کی خاطر انڈیا گئے تھے۔ مہاجرین اکثر ہندو تھے جو فوجی تربیت حاصل کرنے کے لیے خاص مقصد کے ساتھ ہندوستان گئے تھے۔ ہندوستان نے ان کو تربیت دی تھی اور مکتی باہنی کے نام پر ان کو منظم کیا تھا۔ اس وقت بھارت نے مہاجرین کو پناہ اور خوراک مہیا کرنے کے لیے لاکھوں ڈالر بطور امداد دیئے۔ ہندوستان کے پراپیگنڈا نے نہ صرف پاکستان کو بدنام کیا بلکہ اس نے غیر ملکی امداد سے اپنے خزانے بھرے۔ نومبر کے آخر تک انڈیا پاکستان کے خلاف جنگ کی تمام تیاریاں مکمل کرچکا تھا۔

پاکستانی قیادت نے نہ سفارتی مہارت کا ثبوت دیا اور نہ ہی منظم پراپیگنڈا مشینری کام آئی جو ان کی پوزیشن عالمی سطح پر واضح کرسکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دو ممالک کے درمیان مخالفانہ روش کا آغاز ہوا تو انڈیا نے مختلف ممالک میں نام نہاد ''پروپاکستانی لابیز'' کو غیر جانبدار رکھنے کا فائدہ اٹھایا۔

دسمبر کے پہلے ہفتے میں انڈیا نے دونوں اطراف سے پاکستان پر حملہ کردیا۔ پاکستانی فوج جنگجویانہ صلاحیت رکھتی تھی، لیکن باصلاحیت اور تجربہ کار اور فوری اقدام کرنے والی قیادت سے محروم تھی۔ بھارت کی بحری ناکہ بندی سے خلیج بنگال کو مغربی بازو سے جدا کردیا گیا۔ اس طرح وہ فوجیں اس علاقے میں مقید ہوکر رہ گئیں اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ بے شک ہماری افواج بے جگری سے لڑیں، مگر انھیں بھارتی فوجیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، جنھوں نے 16 دسمبر کو ڈھاکہ پر قبضہ کیا تھا۔ صدر یحییٰ نے استعفیٰ دے دیا۔ بھٹو باقی پاکستان کے لیڈر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ جس نے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے 20 دسمبر 1971ء کو حلف اٹھایا۔

سقوط ڈھاکہ کے اسباب

''سقوط ڈھاکہ'' کی داستان بہت طویل اور تکلیف دہ ہے۔ اِس داستان کا خلاصہ ڈاکٹر اسرار احمد (بانی تنظیم اسلامی) نے یوں بیان کیا ہے:

''سقوط ڈھاکہ نہ تو کسی فوری سبب کا نتیجہ تھا اور نہ ہی صرف چند لوگوں کے کرتوتوں کے باعث یہ حادثہ پیش آیا، بلکہ ہمارے قومی اور اجتماعی گناہوں کی سزا تھی جو ہمیں ملی، البتہ کچھ افراد یقیناً ایسے تھے جو اس وقت زیادہ نمایاں ہوگئے۔

''میری نظر میں پہلی غلطی وہ تھی جس کی بنیاد 1946ء میں 1940ء کی قرار داد لاہور میں موجود ''سٹیٹس'' (States) کے لفظ کو ''سٹیٹ'' (State) میں تبدیل کرکے رکھی گئی تھی اور مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک ملک بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ حالانکہ جغرافیائی لحاظ سے دونوں خطے ایک ملک بن ہی نہیں سکتے تھے۔ میں مانتا ہوں کہ انسانی جذبات جغرافیہ کو شکست دے سکتے ہیں لیکن وہ جذبہ صرف اسلام کے حوالے سے پیدا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہم نے قیام پاکستان کے بعد اس جذبے کی نفی کردی بلکہ اس کا گلا گھونٹ دیا' جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ قیام کے فوراً بعد پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا اعلان کیا جاتا اور یہاں نظام خلافت قائم کرتے بلکہ اس سے بھی آگے ''پان اسلام ازم'' کی طرف پیش قدمی ہوتی۔

12 مارچ 1949ء کو بڑی رد وقدح کے بعد اور بڑے ہی بادل نخواستہ انداز میں قرار داد مقاصد منظور ہوئی لیکن اس سے پہلے جذبات پر خاصی اوس پڑ چکی تھی۔ اس سے دوسرا بہت بڑا نتیجہ یہ نکلا کے ہمارے لیے مغربی جمہوری اصولوں کے مطابق بھی ملکی دستور بنانا مشکل ہوگیا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک اس ملک کا کوئی دستور ہی نہ بن سکا، اس خلا سے آخر کوئی تو نتیجہ برآمد ہونا تھا۔

تیسری بڑی غلطی قومی زبان کے تعین میں ہوئی۔ تحریک کے دوران اردو کا مقابلہ ہندی کے ساتھ تھا۔ اس لیے متفقہ زبان رہی لیکن پاکستان کے قیام کے بعد اردو کو قومی اور سرکاری زبان کے طور پر ٹھونسنا بہت بڑی غلطی تھی۔ اگر اس وقت عربی زبان کی تعلیم لازمی قرار دے کر اسے قومی زبان کا درجہ دے دیا جاتا تو کم از کم زبان کے حوالے سے ایک رشتہ قائم ہوجاتا جو سب کے لیے قابل قبول ہوتا۔

چوتھی بڑی غلطی مارشل لاء کا نفاذ تھا جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا، کیونکہ فوج صرف مغربی پاکستان کی تھی اور مشرقی پاکستان والوں کے نزدیک مغربی پاکستان سے مراد پنجاب تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مارشل لاء کی اہم وجہ یہ تھی کہ پاکستان بننے کے بعد خود مسلم لیگ ہی کھڑی نہ رہ سکی۔ لہٰذا کچھ عرصہ سول بیوروکریسی نے عیش کیے۔ اس کے بعد آرمی نے نظم ونسق سنبھال لیا لیکن اس سے لوگوں میں بہرحال احساس محرومی پیدا ہوا جو ایک قدرتی امر تھا۔

میرے نزدیک پانچویں غلطی دارالحکومت کا کراچی سے اسلام آباد منتقل کرنا تھا۔ کراچی ایک کاسموپولیٹن اور ساحلی شہر تھا اور مشرقی پاکستان کے ساتھ اس کے بحری روابط بھی تھے۔ جب کہ اسلام آباد کے ساتھ صرف ہوائی رابطہ تھا جو گراں ہونے کے سبب صرف سرمایہ داروں کے لیے کارآمد تھا۔

ہماری آخری اور ہمالیہ جیسی غلطی جس نے باقی ساری غلطیوں کو مات دے دی، حقائق کے برعکس طاقت کا بھونڈا استعمال تھا۔ جب ہم نے کسی معاملے میں کہیں بھی سمجھ داری کا ثبوت نہ دیا اور غلطی پر غلطی کرتے چلے گئے تو پھر ''شامت اعمال ماصورت نادر گرفت''۔ اب ''صورت نادر'' میں بھٹو کو شمار کرلیں یا مجیب کو یا دونوں کو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ہماری شامت اعمال تھی۔

اب سو باتوں کی ایک بات عرض کرتا ہوں کہ قرآن کی تشخیص کی رو سے ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ سورۃ التوبہ کی آیت 75 تا 77:

(ترجمہ) ''ان میں سے کچھ لوگ وہ بھی تھے جنھوں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا تو خوب صدقہ خیرات کریں گے اور صالح بن جائیں گے۔ پھر جب اللہ نے اپنے فضل سے غنی کردیا تو انھوں نے بخل کیا اور پیٹھ موڑلی اور اعراض کیا۔ چنانچہ اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق پیدا کردیا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے''۔

نفاق پاکستانی معاشرے کا شناختی نشان بن چکا ہے۔ ایک طرف اخلاقی کردار کا دیوالیہ نکل چکا ہے اور دوسری طرف اتفاق واتحاد ختم ہوگیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ عیدین اور اجتماعات جمعہ میں گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتیں تھیں کہ اے اللہ! ہمیں ہندو اور انگریزوں کی دہری غلامی سے نجات عطا فرما، تاکہ ہم تیرے دین کا بول بالا کرسکیں۔ پورا برعظیم ''پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ الا اللہ'' کے نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ لیکن جب اللہ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے نواز دیا تو ہم نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو بھلا دیا اور بنگلے

کوٹھیاں بنانے میں لگ گئے۔

بہرحال یہ اللہ سے بدعہدی کی سزا تھی جو ہمیں ملی اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہم نے توبہ نہ کی اور اللہ کی طرف رجوع نہ کیا تو اللہ کی سنت ہے کہ ''اگر تم نے پھر اعادہ کیا (یعنی وہی کچھ کیا) تو ہم بھی پھر وہی کریں گے (جو ہم نے پہلے کیا تھا)۔ (سورۃ بنی اسرائیل: 8)

اس وقت جو فوری کرنے کا کام ہے وہ یہ ہے کہ ہم کسی ایک قیادت میں منظم ہو کر حکومت کو مجبور کریں کہ وہ پاکستان کے آئین میں ترمیم کر کے قرآن وسنت کی مکمل اور غیر مشروط بالادستی کا اہتمام کرے تاکہ خلافت کے نظام کی راہ ہموار ہو اور یہاں اسلام کا حقیقی نظام عدل قائم ہو۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت

17 دسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد 20 دسمبر 1971ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان کی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔ جنرل یحییٰ خان نظر بند ہوئے۔ 1972ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ''شملہ معاہدہ'' ہوا، جس کی رو سے 93 ہزار قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ 1973ء کو نیا آئین منظور ہوا۔ چودھری فضل الٰہی کو صدر مملکت اور بھٹو کو وزیراعظم منتخب کیا گیا۔ 1974ء میں لاہور میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ 1975ء میں صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ حیات شیر پاؤ کا قتل ہوا جس کے نتیجے میں نیشنل عوامی پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ 1976ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان دوبارہ سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ مارچ 1977ء میں عام انتخابات ہوئے جس پر حزب اختلاف کی نو جماعتوں ''قومی متحدہ محاذ'' (پی این اے) نے دھاندلیوں کے سنگین الزامات عائد کیے۔ حکومت کے خلاف زبردست تحریک چلی۔ خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بھٹو اور حزب اختلاف میں دوبارہ انتخابات کرانے کے لیے سعودی عرب اور لیبیا وغیرہ کی حکومت نے مذاکرات کرائے۔

جنرل ضیاء الحق کی حکومت

یہ مذاکرات ابھی جاری تھے اور کوئی سمجھوتہ ہونے کا قوی امکان تھا کہ 5 جولائی 1977ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور 90 دن کے اندر اندر انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ بعد ازاں انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی کر دیئے گئے۔ 1978ء میں بھٹو کے خلاف چار سال پہلے نواب محمد احمد خان قصوری کو قتل کرانے کے ضمن میں مقدمہ چلا۔ ہائی کورٹ نے پھانسی کی سزا سنائی۔ بھٹو صاحب نے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جسے سپریم کورٹ کے فل بینچ نے 24 مارچ 1979ء کو مسترد کرتے ہوئے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ جنرل ضیاء الحق نے تمام ملکی وغیر ملکی اپیلوں کو مسترد کر دیا۔ 4 اپریل 1979ء کو بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ اب جنرل صاحب صدر مملکت بھی بن گئے۔ چنانچہ صدر ضیاء الحق نے 17 نومبر کو منعقد ہونے والے انتخابات بھی غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیئے۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ مخالف سیاسی لیڈروں کو گرفتار یا نظر بند کر دیا گیا۔ فوجی عدالتوں کا دائرہ اختیار بڑھا دیا گیا۔ اخبارات پر کڑی سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ مجلسِ شوریٰ قائم کی گئی۔ نفاذ اسلام کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے، مثلاً سرقہ، ڈکیتی، زنا، امتناع شراب، تہمت زنا اور تازیانے کی سزاؤں سے متعلق ''قانون حدود'' جاری کیا گیا۔ زکوٰۃ آرڈی نینس نافذ کر کے پہلی مرتبہ زکوٰۃ کی وصولی کا نظام رائج کیا گیا۔ عشر کا نظام قائم کیا گیا۔ وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا اختیار بڑھایا گیا۔ قاضی عدالتیں قائم کی گئیں۔

1980ء میں افغانستان پر روسی حملے کی وجہ سے لاکھوں افغان مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے جن کا اقتصادی بوجھ برداشت کرنے کے لیے اقوام متحدہ بالخصوص امریکہ سے خصوصی امداد دی گئی۔

4 اگست 1983ء کو صدر ضیاء الحق نے بحالی جمہوریت کا منصوبہ پیش کیا۔ 19 دسمبر 1984ء کو انھوں نے نفاذ اسلام کی پالیسی جاری رکھنے کی بنیاد پر ریفرنڈم منعقد کرایا جس میں وہ مزید پانچ سال کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ 25 فروری 1985ء کو قومی اسمبلی اور 28 فروری کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات غیر جماعتی بنیاد پر منعقد ہوئے۔ ان انتخابات کے فوراً بعد مجلسِ شوریٰ کو توڑ دیا گیا۔

نو منتخب اسمبلیوں کے آغاز کار سے پہلے صدر نے ایک آرڈی نینس کے ذریعے 1973ء کے آئین کو بعض ترامیم کے ساتھ بحال کیا۔ ان ترامیم کا مقصد 1973ء کے آئین کے ڈھانچے میں تبدیلیاں لانا تھا۔ ان ترامیم کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ آئین کے مطابق صدر مملکت بالکل بے بس ہے جب کہ سارے اختیارات وزیراعظم کی ذات میں جمع ہو گئے ہیں، اس لیے آئین کو زیادہ قابل قبول اور حقیقت پسند بنانے کے لیے ضروری ہے کہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کیا جائے۔ آٹھویں ترمیم کے ذریعے 1990ء تک وزیراعظم نامزد کرنے کا اختیار صدر مملکت کے پاس رہا۔ نیز صدر مملکت کو اسمبلی برطرف کرنے کا بھی اختیار حاصل رہا تاکہ وہ سنگین بحران کی صورت میں اس اختیار کے ذریعے اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کروا سکیں اور فوج کو دخل اندازی کا موقع نہ ملے۔

اس وقت جو فوری کرنے کا کام ہے وہ یہ ہے کہ ہم کسی ایک قیادت میں منظم ہو کر حکومت کو مجبور کریں کہ وہ پاکستان کے آئین میں ترمیم کر کے قرآن وسنت کی مکمل اور غیر مشروط بالادستی کا اہتمام کرے تاکہ خلافت کے نظام کی راہ ہموار ہو اور یہاں اسلام کا حقیقی نظام عدل قائم ہو

جونیجو حکومت کی برطرفی

فروری 1985ء میں جو غیر جماعتی انتخابات ہوئے تھے، آٹھویں ترمیم سے حاصل شدہ اختیار کے تحت صدر ضیاء الحق نے 23 مارچ 1985ء کو محمد خان جونیجو کو وزیراعظم منتخب کر دیا۔ 30 دسمبر 1985ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر صاحب نے 5 جولائی 1977ء کا فرمان منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء ختم کر دیا گیا اور جمہوریت بحال کر دی گئی، لیکن 29 مئی 1988ء کو وجہ بتائے بغیر جناب جونیجو اور ان کی حکومت اور قومی اسمبلی کو برخواست کر دیا۔ صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور پنجاب کے میاں محمد نواز شریف کے علاوہ تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ تبدیل کر دیئے گئے۔ وزیراعظم کی معزولی اور قومی اسمبلی توڑنے کے بعد صدر ضیاء الحق غیر معمولی طور پر مشکل حالات میں گرفتار ہو گئے۔ دریں اثنا سپریم کورٹ نے بے نظیر بھٹو کی ایک درخواست پر غیر جماعتی انتخابات کو 1973ء کے آئین کے تحت دیئے گئے بنیادی حقوق کی روح کے خلاف قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے باوجود صدر نے اعلان کیا کہ آئین میں صرف انتخابات کا ذکر ہے اور جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کی کوئی پابندی موجود نہیں ہے اور یہ کہ انتخابات 16 نومبر 1988ء کو غیر جماعتی بنیاد پر منعقد ہوں گے۔ لیکن خدا کو ایسا منظور نہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو بہاول پور میں ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔

غلام اسحٰق خان کا عہد صدارت

ضیاءالحق کی وفات کے بعد سینٹ کے چیئر مین غلام اسحاق خان صدر مملکت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ انتخابات پہلے سے اعلان شدہ شیڈول کے مطابق ہوں گے اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق جماعتی بنیاد پر ہوں گے۔ انتخابات ہوئے۔ صدر اسحاق نے پیپلز پارٹی کی شریک چیئر پرسن بے نظیر بھٹو کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ محترمہ نے 2 دسمبر 1988ء کو پاکستان کی تاریخ کی پہلی خاتون وزیر اعظم کے طور پر اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ بیس ماہ بعد 6 اگست 1990ء کو صدر غلام اسحاق خان نے آٹھویں ترمیم کے تحت قومی اسمبلی کو توڑ دیا اور وزیر اعظم بینظیر بھٹو کو معزول کر دیا۔ سابق وزیر اعظم کے شوہر آصف علی زرداری اور متعدد ارکان اسمبلی پر بدعنوانیوں کے مقدمات دائر ہوئے۔ صدر اسحاق نے نیشنل پیپلز پارٹی کے چیئر مین غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا جو 6 اگست سے 6 نومبر 1990ء تک اپنے عہدے پر فائز رہے۔

اکتوبر 1990ء کے انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کے نمائندوں کو اکثریت حاصل ہوئی۔ صدر اسحاق نے آٹھویں ترمیم کے تحت 6 نومبر کو میاں محمد نواز شریف کو وزیر اعظم نامزد کیا اور 18 اپریل 1993ء کو آٹھویں ترمیم کے تحت ان کو اور اسمبلی کو معطل کر دیا۔ بلخ شیر مزاری کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا۔ وہ صرف 39 دن اس عہدے پر فائز رہ سکے، کیونکہ 26 مئی 1993ء کو سپریم کورٹ نے ایک آئینی درخواست پر اپنا فیصلہ سنایا کہ میاں نواز شریف کی برطرفی غیر آئینی تھی۔ چالیس بیالیس دن کے بعد 8 جولائی 1993ء کو ایک معاہدے کے تحت غلام اسحاق خان اور میاں نواز شریف دونوں مستعفی ہو گئے۔ سینٹ کے چیئر مین وسیم سجاد کو قائم مقام صدر مملکت بنایا گیا۔ معین قریشی کو امریکا سے بلا کر نگران وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

اکتوبر 1993ء میں عام انتخابات ہوئے۔ پیپلز پارٹی اور اس کی حلیف جماعتوں کو اکثریت حاصل ہوئی۔ آٹھویں ترمیم کے تحت بے نظیر بھٹو کو وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔ 14 نومبر کو سردار فاروق احمد خان لغاری صدر مملکت منتخب ہوئے۔ 5 نومبر 1996ء کو صدر فاروق لغاری نے آٹھویں ترمیم کے تحت بے نظیر بھٹو، ان کی حکومت اور اسمبلی کو برطرف کر دیا اور ان کے شوہر اور متعدد ارکان اسمبلی پر سنگین نوعیت کی بدعنوانیاں کے الزامات عائد کر کے احتساب کا عمل شروع کیا۔

میاں نواز شریف کی دوسری حکومت

(17 فروری 1997ء تا 12 اکتوبر 1999ء)

آٹھویں ترمیم کے تحت ملک معراج خالد کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ 3 فروری 1997ء کو عام انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ اور حلیف جماعتوں کو بھاری اکثریت (دو تہائی سے بھی زائد) حاصل ہوئی۔ صدر فاروق لغاری نے آٹھویں ترمیم کے تحت میاں نواز شریف کو نامزد کیا۔

میاں صاحب نے ابتدائی اقدام کے طور پر صدر مملکت سے صلاح ومشورہ کے بعد آٹھویں ترمیم کو باقاعدہ اسمبلی میں پیش کر کے ختم کرا دیا۔ بعد ازاں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب سجاد علی شاہ سے عدلیہ کے اختیارات کے ضمن میں وزیر اعظم سے اختلافات پیدا ہونے کے باعث صدر فاروق لغاری عہدہ صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ جناب محمد رفیق تارڑ صدر مملکت کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔

پاکستان نے بھارت کے پانچ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں 28 مئی اور 30 مئی 1998ء کو سات ایٹمی دھماکے کیے۔ اپریل 1999ء میں پاکستان نے بھارت کے پرتھوی میزائل کے جواب میں ''غوری میزائل'' کے کامیاب تجربے کیے۔ مئی میں کشمیر میں کارگل کی پہاڑیوں پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ بھارت نے مجاہدین پر فضائی حملے کیے اور الزام عائد کیا کہ مجاہدین کے بھیس میں دراصل پاکستانی فوج قابض ہے۔ امریکا نے بھی بھارت کی ہم نوائی کی۔ وزیر اعظم میاں نواز شریف نے امریکی دباؤ میں آ کر کارگل میں مجاہدین کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔

جنرل پرویز مشرف کا عہد حکومت

(12 اکتوبر 1999ء تا حال)

12 اکتوبر 1999ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف جب کولمبو سے ایک سرکاری میٹنگ میں شرکت کے بعد واپس پاکستان آ رہے تھے تو وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے ایک طرف تو ان کی برطرفی کا نوٹس جاری کر کے ان کے منصب پر جنرل ضیاء الدین کو فائز کر دیا، دوسری طرف ان کا طیارہ کراچی نہ اترنے کا حکم صادر کر دیا، لیکن فوج نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھال کر خود کو ''چیف ایگزیکٹو'' کہلوایا اور مارشل لاء نافذ کیے بغیر فوج کو ہر شعبے میں دخیل کر دیا اور اس طرح ان کی حکومت فی الحقیقت ''فوجی آمریت'' ہی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی۔

اپریل 2002ء میں ریفرنڈم کے ذریعے جنرل پرویز مشرف نے مزید پانچ سال اقتدار میں رہنے کے لیے عوام سے رجوع کیا۔ حزب اختلاف کی جماعتوں نے اس ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ اکتوبر میں پارلیمانی انتخابات فوجی حکمرانوں کی لیے مایوس کن ثابت ہوئے، کیونکہ وہ مسلم لیگ (ق) کی پشت پر تھے اور وہ پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ اس کے علاوہ دینی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل بھی انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بہر حال مسلم لیگ (ق) کے امیدوار میر ظفر اللہ خان جمالی معمولی اکثریت کے ساتھ وزیر اعظم بن گئے۔ اپریل 2004ء میں جنرل پرویز مشرف نے ''نیشنل سیکیورٹی کونسل'' بنائی۔ جون میں جمالی صاحب کو رخصت کیا۔ چودھری شجاعت حسین کو عبوری وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔ وزیر خزانہ شوکت عزیز کو وزیر اعظم بنانے کے لیے انھیں قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں کامیاب کرایا گیا۔

جنرل پرویز مشرف نے جنرل ایوب خان کی طرح ''بنیادی جمہوریتوں'' کی طرز پر ضلعی حکومت کا نظریہ دیا اور بزعم خود ''عوام کو زیادہ سے زیادہ با اختیار'' بنانے کے لیے 14 اگست 2000ء کو ضلعی حکومتوں کے نظام کا اعلان کیا جس پر آج تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔ لیکن تا حال مثبت نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

11 ستمبر 2001ء کو ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کے انہدام کے بعد امریکا نے پوری دنیا میں نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کی اقتصادی، خارجہ، داخلہ اور ہر طرح کی پالیسی کو امریکا کے سپرد کر دیا، یہاں تک کہ طالبان اور القاعدہ کے خلاف براہ راست عسکری طاقت استعال کی۔ حتیٰ کہ پاکستان کے ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو امریکا کے اس الزام پر نظر بند کر دیا کہ انھوں نے ایٹمی معلومات دوسرے ممالک کو منتقل کی ہیں۔

مارچ 2004ء سے اب تک وزیرستان میں طالبان اور القاعدہ کے کارکنوں کے علاوہ غیر ملکیوں کے خلاف فوجی آپریشن جاری ہے۔ صدر مشرف کی امریکا نوازی، کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ کے زیر نگرانی استصواب کے بین الاقوامی فیصلے سے روگردانی، وردی اتارنے کے معاملے میں وعدہ خلافی اور آمرانہ طرز حکومت کے خلاف اب اپوزیشن کی جماعتوں نے متحد ہو کر اور مطالبہ کیا کہ ملک میں عبوری حکومت قائم کر کے، اس کی نگرانی میں صاف شفاف اور غیر جانبدارانہ الیکشن کرائے جائیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف اپنے خلاف ایسی تحریک کا سخت مقابلہ کریں گے اور اپنے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی پوری کوشش کریں گے۔

مارچ 2007ء میں عدلیہ کا تنازعہ پیش آیا، جب

صدر مملکت نے اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزام کے تحت چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو ''غیر فعال'' کرتے ہوئے اُن کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک ریفرنس دائر کر دیا۔ اِس اقدام پر پوری قوم سراپا احتجاج بن گئی۔ وکلاء نے عدلیہ آزادی کے لئے منظم اور پر امن تحریک چلائی۔ صدارتی ریفرنس پر چند ماہ عدالت میں بحث وتمحیص ہوئی، بالآخر 20 جولائی کو عدالت نے صدارتی ریفرنس کے خلاف فیصلہ دے دیا اور چیف جسٹس کو بحال کر دیا۔

ماہ جولائی میں لال مسجد کا المناک سانحہ پیش آیا جس نے پرویز مشرف کی بدترین آمریت کو اور بھی آشکارا کیا۔ لال مسجد انتظامیہ کا مطالبہ تھا کہ حکومت اسلام آباد میں گرائی گئی مساجد دوبارہ تعمیر کرے، اور فحاشی وعریانی کا خاتمہ اور اسلامی نظام نافذ کرے۔ حکومت نے اِن مطالبات پر عمل درآمد کی بجائے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف بہیمانہ آپریشن کر ڈالا، جس سے سینکڑوں طلبہ وطالبات شہید ہو گئے۔ عوام اِس ظلم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

بقیہ: یہ 47 والا پاکستان نہیں

مرکز کی بنیاد رکھنا ہی نسل پرستی کی بنیاد پر دوسری غیر قوموں پر جینے کے حق پر سوالیہ نشان لگانا ہے۔

8- اسرائیل میں رہنے کا حق اس بات سے مشروط کئے جانے کا امکان ہے کہ جنیاتی طور پر کوئی شخص یہودی ہے بھی یا نہیں۔

9- اکتوبر 2005ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن (لندن) میں یہودی النسل Ronnie Kasinls نے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ فلسطینی عربوں کی حالت زار جنوبی افریقہ میں نسلی منافرت کی شکار سیاہ فام اکثریت سے کہیں بدتر ہے۔

ہم یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ پرویز مشرف ان حقائق سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ دراصل ابن الوقت ہونے کے ساتھ صیہونی دباؤ کا شکار ہیں۔ وہ صیہونیوں کے سامنے ایسے بے بس ہیں جیسے قوم ان کے سامنے۔ افسوس کہ مستقبل میں صیہونی پنجۂ استبداد سے ان کے نکلنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

یہ 1947ء والا پاکستان نہیں ہے۔ اُس جذبے نے پاکستان بنایا تھا۔ بزدلی، منافقت، خودغرضی اور ہوس پاکستان کو گنوا دیں گی۔

یہ اقتباس عابد اللہ جان کی کتاب The Musharaf Factor..... سے لیا گیا ہے۔

قرآن فہمی کے طالبان کے لیے عظیم خوشخبری

شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے سابق چیئرمین اور قرآن اکیڈمی کے استاذ الاساتذہ

پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم ومغفور

کی صرفی و نحوی تشریح پر مبنی

مکمل ترجمہ قرآن مجید

تقریباً 300 گھنٹے کے کلاس روم لیکچرز

اب صرف ایک DVD میں دستیاب ہیں

ہدیہ: 70 روپے + ڈاک خرچ 30 روپے

(بذریعہ ڈاک منگوانے کے خواہش مند حضرات 100 روپے کا منی آرڈر ارسال کریں!)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

email : maktaba@tanzeem.org

website : www.tanzeem.org

النصر لیب

مستند اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ادارہ

ایک ہی چھت کے نیچے تمام اقسام کے معیاری لیبارٹری ٹیسٹ، ایکسرے، ای سی جی اور الٹراساؤنڈ کی سہولیات

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی نگاہ میں قابلِ اعتماد ادارہ

خصوصی پیکج خصوصی میڈیکل چیک اپ ☆ الٹراساؤنڈ ☆ ای سی جی ☆ ہارٹ ☆ ایکسرے چیسٹ ☆ لیور ☆ کڈنی ☆ جوڑوں سے متعلقہ متعدد ٹیسٹ اہپاٹائٹس بی اور سی Elisa Method کے ساتھ ☆ بلڈ گروپ ☆ بلڈ شوگر ☆ مکمل بلڈ اور مکمل پیشاب ٹیسٹ صرف 2000 روپے میں کروائیں۔

ISO 9001:2000
QMS CERTIFIED CLINICAL LAB
BY MOODY INTERNATIONAL

تنظیم اسلامی کے رفقاء اور ندائے خلافت کے قارئین اپنا ڈسکاؤنٹ کارڈ لیبارٹری سے حاصل کریں۔ ڈسکاؤنٹ کارڈ کا اطلاق خصوصی پیکج پر نہیں ہوگا۔

النصر لیب: 950۔ بی، مولانا شوکت علی روڈ، فیصل ٹاؤن (نزد راوی ریسٹورنٹ) لاہور

فون 5162185-5163924 موبائل 0300-8400944

E-mail: alnasar@brain.net.pk Website: www.alnasar.com.pk

مختصر تاریخ: دستور سازی

آئین سازی کا کام آسان نہیں تھا۔ قائداعظمؒ کے الفاظ میں "یہ نہایت غیر معمولی کام ہے اور میرا قیاس ہے کہ اس کی تکمیل میں اٹھارہ ماہ سے دو سال کا عرصہ درکار ہوگا"۔ قائداعظم جب اس قیاس کا اظہار کر رہے تھے تو شاید وہ مسلم لیگ کی قیادت کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہم تھے۔ ان کی یہ پیشن گوئی پاکستان کے بارے میں تو درست ثابت نہ ہو سکی۔ البتہ ہندوستان نے اپنا آئین 1949ء تک بنالیا

دستور قوم کی تمناؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس کی سوچ وفکر کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں جہاں عوام کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے وہاں آئین کو قوم کی آزادی کا پروانہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ دستور ملک کے انتظامی ڈھانچے، عدلیہ کے نظام، سیاسی اداروں کی شکل وصورت کی وضاحت کرتا ہے اور قوم کی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے قوموں کی زندگی میں دستور سازی اہم ترین اور مشکل ترین فریضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دستور سازی عام حالات میں بھی پیچیدہ اور صبر آزما کام ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان نے دستور کے تعاقب میں تقریباً چھبیس (26) سال صرف کر دیئے جو شاید عالمی ریکارڈ ہے۔

پاکستان کی تاریخ وسیاست کا تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ پاکستان میں قومی انتشار یکے بعد دیگرے سیاسی بحرانوں کا سلسلہ، صوبائی تعصب اور دوسرے قومی مسائل کی ذمہ داری جہاں اور بہت سے عناصر پر ہے وہاں ان میں ایک اہم عنصر دستور سازی کی ناکامی ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر پاکستان بھی بھارت کی مانند پہلے دو تین سالوں میں اپنا آئین مرتب کر لیتا تو پاکستانی عوام کو ان بہت سے سیاسی مصائب سے نجات مل جاتی جو بعد ازاں یہاں آفت بن کر نازل ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو عارضی طور پر آئینی اساس قرار دیا گیا اور یہ طے پایا کہ نئے دستور کی تکمیل تک ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت اس ایکٹ میں ترمیمات کے ذریعے حکومت چلائی جائے گی۔ یہ انتظام بالکل عارضی تھا۔ کیونکہ نئے آئین کی تشکیل کے لیے آئین ساز اسمبلی قائم کر دی گئی تھی۔ آئین سازی کا کام آسان نہیں تھا۔ قائداعظمؒ کے الفاظ میں "یہ نہایت غیر معمولی کام ہے اور میرا قیاس ہے کہ اس کی تکمیل میں اٹھارہ ماہ سے دو سال کا عرصہ درکار ہوگا"۔ قائداعظم جب اس قیاس کا اظہار کر رہے تھے تو شاید وہ مسلم لیگ کی قیادت کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہم تھے۔ ان کی یہ پیشن گوئی پاکستان کے بارے میں تو درست ثابت نہ ہو سکی۔ البتہ ہندوستان نے اپنا آئین 1949ء تک بنالیا۔ آئین سازی عام حالات میں بھی بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان میں اس نے دنیا بھر سے زیادہ وقت لیا۔ آئین سازی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ اولاً ہندوستان کی تقسیم بھارت اور پاکستان پر منتج ہونے کے ساتھ پاکستان کو بھی مشرقی اور مغربی پاکستان میں منقسم کر گئی تھی۔ دونوں کے درمیان گیارہ سو میل کا طویل فاصلہ تھا جو بھارت کا حصہ تھا۔ آئین سازی کی تکمیل میں یہ امر بھی بہت اہم تھا کہ مغربی پاکستان چار صوبوں شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل تھا۔ قبائلی علاقے اور ریاستیں جنھوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تھا ان کے علاوہ تھیں۔ مشرقی پاکستان، مشرقی بنگال اور آسام کے ضلع سلہٹ جس کا الحاق ریفرنڈم کے ذریعے ہوا تھا' پر مشتمل تھا۔ 1951ء کی رائے شماری کے مطابق مغربی پاکستان کی آبادی تقریباً تین کروڑ افراد اور مشرقی پاکستان کی چار کروڑ نفوس پر مشتمل تھی۔ فاصلہ کی طوالت دونوں حصوں کے عوام کی رفاقت میں حائل تھی۔ علاوہ ازیں آب وہوا اور جغرافیائی حالات بھی مختلف تھے اور ان عوامل نے ان دونوں حصوں کے عوام کی زندگیوں پر بھی جدا جدا اثرات مرتب کیے۔ پھر زبان کی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب باہمی افہام وتفہیم میں بڑی مشکلات درپیش تھیں۔ ان حالات میں مرکزی قانون ساز ادارے میں نمائندگی، ایوان بالا اور زیریں میں اختیارات کا تعین اور صوبوں کو کس قدر خود مختاری دی جائے، جیسے اہم اور بنیادی مسائل ابھر کر سامنے آگئے۔ مسائل بے حد پیچیدہ تھے اور اعلیٰ قیادت کا فقدان تھا۔ اس لیے سالہا سال تک ان کا حل تلاش نہ کیا جاسکا۔

ثانیاً' پاکستان کی جدوجہد میں مسلم لیگ نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوری مملکت ہوگی جس کی اساس اسلام کے معاشرتی عدل پر رکھی جائے گی اور مسلمان قانون خداوندی کے تحت اپنی زندگیاں بسر کر سکیں گے اور غیر مسلموں سے بھی مساوی سلوک برتا جائے گا۔ آئین سازی کا کام شروع ہوا تو اسلامی آئین کے مختلف تصورات پر اختلاف پیدا ہو گیا جس نے مختلف گروہوں کو جنم دیا۔ چنانچہ آغاز ہی سے کش مکش اور رسہ کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے آئین سازی کے کام کو مشکل تر بنا دیا۔

آئین سازی کی تاریخ میں یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ اس کے لیے آئین سازوں کو بے حد محنت اور خلوص کی ضرورت تھی، تاکہ وہ الجھے ہوئے مسائل کو اس طرح سلجھائیں کہ مختلف مکتبہ ہائے فکر کسی ایک فارمولے پر راضی ہو جائیں۔ یہ کام کوہ کنی کے مترادف تھا کیونکہ لوگوں کی اکثریت نہ صرف علم سے عاری بلکہ سیاسی تجربوں سے بھی محروم تھی۔ ان حالات میں خود غرض سیاستدان آسانی سے ان کے گہرے مذہبی جذبات کو برافروختہ کر سکتے تھے۔

تاہم 12 مارچ 1949ء کو دستور سازی کے لیے آئین ساز اسمبلی نے کام شروع کر دیا۔ آئین سازی کی ابتداء قرارداد مقاصد کی منظوری سے کی گئی۔ اس قرارداد کا متن حسب ذیل ہے۔

قرارداد مقاصد

1۔ اللہ تعالیٰ کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیارات حکمرانی اپنی مقررہ کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمائے ہیں۔ چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ

نمائندہ کے ذریعے سے استعمال کرے گی۔

2۔ جس کی رو سے اصول جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری، عدل اور حکمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔ جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کو اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن و سنت رسول ﷺ میں متعین ہیں تربیت دے سکیں۔

3۔ جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقیدوں پر قائم رہ سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

4۔ جس کی رو سے وہ علاقے، جواب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہوگئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں، ایک وفاقیہ بنائیں گے جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ و متعینہ اختیارات کے ماتحت آزاد ہوں گے۔ جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون اور اخلاق عامہ کے ماتحت مساوات، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل، اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہے۔

5۔ جس کی رو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ جس کی رو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

6۔ جس کی رو سے وفاقیہ کے علاقوں کی ضمانت اور اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں برو بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا جائے گا۔

7۔ تاکہ پاکستان کے عوام فلاح و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ وہ اقوام عالم میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں اضافہ کر سکیں۔

اس قرارداد کو مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے ہندو اراکین کے سوا سب نے قبول کرلیا۔ ہندو اراکین کا کہنا تھا کہ اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے مذہب پر اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے پاکستان کو لادینی حکومت قرار دیا جائے۔ پاکستان کا وجود اس کی سب سے بڑی تردید تھا اس لیے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی بھاری اکثریت نے ان کے اعتراض کو رد کر دیا اور قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کرلی گئی۔

تاریخ پاکستان کے ہر دور میں اس قرارداد کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1985ء میں پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اسے آئین کا حصہ بنا دیا۔ یہ قرارداد بلاشبہ لیاقت علی خان علمائے کرام اور مسلم ارکان اسمبلی کا عظیم کارنامہ ہے۔

12 مارچ 1949ء کو اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کرتے ہوئے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ایک یادگار تقریر کی تھی، جس کا ایک اقتباس یہ ہے۔ انھوں نے فرمایا:

''جناب والا! میں آج کے دن کو اس ملک کی زندگی کا اہم ترین دن سمجھتا ہوں۔ اس دن پر اگر کسی اور دن کو فوقیت حاصل ہے تو صرف یوم آزادی کو اور آزادی کا مطلب بھی یہی تھا کہ ہمیں ایک ایسا موقع ملا ہے کہ ہم وطن عزیز اور اس کے سیاسی نظام کی تعمیر اپنے نظریات اور مقاصد کے مطابق کرسکیں اور جناب والا! میں ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر بابائے قوم قائداعظم کئی مرتبہ اظہار خیال کر چکے ہیں اور پوری قوم ان کے خیالات کی واضح طور پر تائید کر چکی ہے۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ قیام پاکستان اس لیے ضروری ہے کہ برصغیر کے مسلمان اسلام کی تعلیمات اور روایات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں اور وہ پوری دنیا پر واضح کرسکیں کہ آج بھی اسلام ان تمام بیماریوں کے لیے تریاق کا درجہ رکھتا ہے جو بنی نوع انسان کو لاحق ہو چکی ہیں۔ لہٰذا جناب والا! آپ دیکھیں گے کہ قرارداد مقاصد کے ابتدائیے میں اس حقیقت کا واضح طور پر یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ تمام حاکمیت احکام خداوندی کے تابع ہونی چاہیے اور ہم پاکستان کے عوام اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی حاکمیت اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق استعمال کی جانی چاہیے تاکہ اس حاکمیت کا غلط استعمال نہ ہوسکے۔ یہ حاکمیت درحقیقت ایک مقدس امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے تاکہ ہم اس کے بندوں کی خدمت کے لیے اسے استعمال کر سکیں۔''

اللہ تعالیٰ کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیارات حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمائے ہیں

قرارداد مقاصد میں آئین پاکستان کے اغراض و مقاصد کی مختصراً وضاحت کی گئی تھی۔ اس میں جمہوری اصولوں، آزادی، مساوات اور معاشرتی اقدامات کے ساتھ اسلامی اصولوں پر یقین دہانی کرائی گئی اور مسلمانوں کو نوید دی گئی تھی کہ وہ اپنی زندگیاں اسلامی اصولوں کے مطابق بسر کرسکیں گے۔ اس میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ پوری کائنات کی حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس کی طرف سے پاکستان کے عوام کو جو اختیارات تفویض ہوئے ہیں وہ ایک مقدس فریضہ ہیں۔ اس میں مزید وضاحت کی گئی تھی کہ اقلیتوں کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور ہر شہری کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ عدلیہ انتظامیہ سے علیحدہ ہوگی اور پاکستان کی مملکت وفاقی اصولوں پر قائم ہوگی۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ

قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد 12 مارچ 1949ء کو مولوی تمیز الدین خان کی زیر صدارت 24 ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی، جس کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی کو قرارداد مقاصد کی روشنی میں پاکستان کے لیے آئین کے بنیادی اصول طے کرنے کا فرض سونپا گیا۔ یہ کمیٹی اپنے کام میں سہولت کی غرض سے زیادہ سے زیادہ مزید دس آدمیوں کو اپنے کام میں شامل کر سکتی تھی، جن کا آئین ساز اسمبلی کا رکن ہونا ضروری تھا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے آئین کے بنیادی ڈھانچے کی تیاری کے لیے تین ذیلی کمیٹیاں قائم کیں:

1۔ ذیلی کمیٹی برائے وفاق اور تقسیم اختیارات۔
2۔ ذیلی کمیٹی برائے عدلیہ۔
3۔ ذیلی کمیٹی برائے حق رائے دہی۔

اس کے علاوہ ایک خاص کمیٹی بھی قائم کی گئی، جس کو ''تعلیمات اسلامیہ بورڈ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بورڈ اسلامی قانون سے واقفیت رکھنے والے جید علماء پر مشتمل تھا۔ ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، پروفیسر عبدالخالق، مفتی جعفر حسین، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور مولانا ظفر احمد انصاری جیسے علمائے دین شامل تھے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ قرارداد مقاصد اور ذیلی کمیٹیوں کی طرف سے پیش کردہ مسائل پر اپنی رائے دے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے 7 ستمبر 1950ء کو اپنی عبوری رپورٹ پیش کی جو 28 ستمبر 1950ء کو آئین ساز اسمبلی میں پیش کی گئی۔

اس رپورٹ کی بڑی بڑی دفعات حسب ذیل تھیں:

مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی جن کے اختیارات مساوی ہوں گی۔ مقننہ کی معیاد پانچ سال ہوگی مگر وزیر اعظم کی ہدایت پر اسے قبل از وقت بھی توڑا جاسکے گا۔ ایوان بالا میں بلوچستان سمیت تمام صوبوں کی نمائندگی مساوی ہوگی اور ایوان زیریں میں نمائندگی آبادی کے مطابق ہوگی۔ مملکت کے سربراہ کا انتخاب دونوں ایوانوں کے مشترکہ

اجلاس میں پانچ سال کے لیے عمل میں آئے گا اور کوئی شخص بھی اس عہدہ پر دو بار سے زائد منتخب نہیں ہو سکے گا۔ اسے کل ممبروں کی دو تہائی اکثریت سے علیحدہ کیا جا سکے گا۔ وہ کسی عدالت میں جواب دہ نہیں ہوگا اور نہ ہی اسے مورد الزام گردانا جا سکے گا۔ کسی قسم کی مجرمانہ کاروائی بھی اس کے خلاف نہیں ہو سکے گی۔ اس کی ایک وزارتی کونسل ہوگی جس کا سربراہ وزیر اعظم ہوگا۔ یہ کونسل اسے مشورے دے گی اور فرائض کی ادائیگی میں معاون ہوگی۔ وزارتی کونسل کے لیے قانون ساز اداروں کی اکثریت کا اعتماد ضروری ہوگا اور وزراء قانون سازی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

صوبائی انتظامیہ کے اختیارات صوبہ کے سربراہ کے پاس ہوں گے۔ اس کا تقرر صدر مملکت کرے گا اور وہ صدر مملکت کی خوشنودی اور رضامندی کے دوران ہی اپنے عہدہ پر برقرار رہ سکے گا۔ صوبائی سربراہ کو انتظامی اختیارات حاصل ہوں گے۔ صدر مملکت کی طرح وہ بھی کسی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے خلاف کسی عدالت میں چارہ جوئی ہو سکے گی۔ اس کی معاونت کے لیے وزراء کی کونسل ہوگی جس کا سربراہ وزیر اعلیٰ ہوگا' جو قانون ساز ادارے کی اکثریت سے منتخب ہوگا۔ وزراء کی کونسل مشترکہ طور پر اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ صوبہ کے سربراہ کو وزراء کے تقرر اور برخاست کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس کے اقدامات کو نہ کسی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا اور نہ ہی اسے عدالت میں طلب کیا جائے گا۔

صوبوں میں قانون ساز ادارے ایک ایوانی ہوں گے جبکہ مرکز میں قانون ساز اسمبلی کے دو ایوان ہوں گے۔ صوبائی مقننہ کی معیاد پانچ سال ہوگی۔ صوبائی اور وفاقی قانون میں تصادم کی صورت میں صوبائی قانون پر وفاقی قانون کو فوقیت حاصل ہوگی۔ قانون کی تاویل پر جھگڑے کی صورت میں وفاقی عدالت کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ آئین میں ترمیم کرنے کا طریق کار طے کر دیا گیا تھا' جو درحقیقت بہت مشکل تھا۔ جس کی وجہ سے آئین عملی طور پر جامد ہو کر رہ جاتا تھا۔

بہر حال اس رپورٹ کو نامکمل قرار دیا گیا اور تنقید سے خوفزدہ ہو کر اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے تجویز پیش کی کہ اس رپورٹ پر غور ملتوی کر دیا جائے تاکہ اس کو زیادہ بہتر اور مکمل صورت میں پیش کیا جا سکے۔ اس التواء کا سبب یہ تھا کہ اخبارات میں اس رپورٹ پر کڑی تنقید کی گئی۔ مشرقی پاکستان کے نمائندوں کا خیال تھا کہ ان کی عددی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف مغربی پاکستان کے عوام نے بھی اس کی کھل کر حمایت نہ کی۔ اسمبلی کے ایک ممبر نے اس پر یوں تبصرہ کیا کہ یہ غیر جمہوری، غیر اسلامی اور رجعت پسندانہ رپورٹ ہے۔ اس سے صوبائی خود مختاری ختم ہو جائے گی اور مرکز وفاقی کی بجائے وحدانی طرز حکومت کا حامل ہو کر رہ جائے گا۔ قبل ازیں کہ اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں یہ رپورٹ غور کے لیے پیش ہو' وزیر اعظم لیاقت علی خان شہید ہو گئے اور ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بنے اور وزیر خزانہ غلام محمد، خواجہ صاحب کی جگہ گورنر جنرل کے عہدہ پر براجمان ہو گئے۔ چوہدری محمد علی نے سیکرٹری جنرل کے عہدہ سے استعفیٰ دے کر وزارت خزانہ کا قلمدان سنبھالا۔

علماء کے بائیس نکات

پاکستان کے آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے 12 تا 15 ربیع الثانی 1370ھ بمطابق 21 تا 24 جنوری 1951ء کراچی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں ہر طبقۂ فکر اور مسلک کے مندرجہ ذیل علمائے دین کا ایک چار روزہ طویل اجتماع ہوا:

مولانا شمس الحق افغانی' مولانا محمد بدر عالم' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا عبدالحامد بدایونی' مولانا مفتی محمد شفیع' مولانا محمد ادریس کاندھلوی' مولانا خیر محمد' مولانا مفتی محمد حسن' پیر امین الحسنات' پیر مانکی شریف' مولانا محمد یوسف بنوری' خلیفہ حاجی ترنگ زئی' قاضی عبدالصمد سربازی' مولانا اطہر علی' مولانا محمد صالح' مولانا راغب احسن' مولانا حبیب الرحمٰن' مولانا محمد علی جالندھری' مولانا داؤد غزنوی' مفتی جعفر حسین' مولانا کفایت حسین' مولانا محمد اسماعیل' مولانا حبیب اللہ' مولانا احمد علی' مولانا محمد صادق' پروفیسر عبدالخالق' مولانا شمس الدین فرید پوری' مفتی محمد صاحب داد' پیر محمد ہاشم مجدد' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' مولانا ظفر احمد انصاری۔

ان علماء نے دستور پاکستان کی اساس کے لیے بائیس اصول پیش کیے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

1۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے رب العالمین ہے۔

2۔ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا' نہ کوئی ایسا حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر ممنوع یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں گے۔

3۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

4۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ کتاب و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے' منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلام کے احیاء و اعلاء اور متعلقہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

5۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

6۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کا لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور قیام کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگار ہوں، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

7۔ باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادئ مذہب و مسلک، آزادئ عبادت، آزادئ ذات، آزادئ اظہار رائے، آزادئ نقل و حرکت، آزادئ اجتماع، آزادئ اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارت سے استفادے کا حق۔

8۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقع صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

9۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان کے قاضی یہ فیصلے کریں گے۔

10۔ غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

11۔ غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شریعت کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہیں، ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن شہری حقوق کا ذکر دفعہ نمبر 7 میں کیا گیا ہے ان میں

غیر مسلم باشندگان ملک برابر کے شریک ہوں گے۔

12۔رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جن کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے مختلف نمائندوں کو اعتماد ہو۔

13۔رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا' البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کرسکتا ہے۔

14۔رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے سکتا ہے۔

15۔رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزواً معطل کرکے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

16۔جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہ کثرت آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

17۔رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

قرارداد مقاصد کو مشرقی پاکستان کے ہندو اراکین کے سوا سب نے قبول کرلیا۔ ہندو اراکین کا کہنا تھا کہ اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے مذہب پر اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے پاکستان کو لادینی حکومت قرار دیا جائے

18۔ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایسا ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

19۔محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

20۔ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

21۔ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی وحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی۔ جنھیں انتظامیہ اختیارات کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

22۔دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ ترمیمات کے بعد

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے بہت سی ترمیمات کے ساتھ 22 دسمبر 1952ء کو اسمبلی میں پیش کی تاکہ اختلافی حلقے بھی اس سے اتفاق کرسکیں، اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے۔

ملک کا سربراہ وفاقی مقننہ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں منتخب کیا جائے گا۔ اور اس کی میعاد پانچ برس ہوگی۔ سربراہ کا مسلمان ہونا ضروری تھا۔

پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی ، ایوانِ بالا اور ایوانِ زیریں۔ اول الذکر میں ایک سو بیس نشستیں ہوں گی، جن میں سے 60 مشرقی پاکستان کے لیے اور ساٹھ مغربی پاکستان کے لیے مخصوص ہوں گی۔ ریاستوں اور مرکزی انتظامیہ کے علاقوں کو نمائندگی آبادی کے لحاظ سے ملے گی۔

ایوانِ زیریں چار سو نشستوں پر مشتمل ہوگا۔ جن میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی برابر برابر نشستیں ہوں گی۔ مغربی پاکستان کا حصہ صوبوں میں آبادی کے لحاظ سے منقسم ہوگا۔ ممبروں کا انتخاب جداگانہ انتخاب کے ذریعہ بالغ رائے دہی کی بنا پر عمل میں آئے گا۔ دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہوں گے۔ اختلاف کی صورت میں دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس بلایا جائے گا اور کثرت رائے کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

انتخابات حق بالغ رائے دہی کی بناء پر ہوں گے۔

سربراہ مملکت پانچ جید علماء پر مشتمل ایک بورڈ قائم کرے گا۔ جو اس بات کا ضامن ہوگا کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے منافی نہ بن سکے۔ اسی قسم کے بورڈ گورنر صوبوں میں قائم کریں گے۔

ایک سپریم کورٹ ہوگی جس کے ججوں کا تقرر صدر مملکت کرے گا اور کسی جج کو ججوں کے بورڈ کی سفارش پر برخاست بھی کرسکے گی۔ اسی طرح ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر گورنر کریں گے اور گورنر انھیں سپریم کورٹ کے مشورے پر علیحدہ بھی کرسکیں گے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی اس رپورٹ کو خواجہ ناظم الدین نے آکاش پر چمکتے ہوئے سورج کی پہلی کرن قرار دیا۔ ان کی رائے میں یہ رپورٹ نہ صرف پاکستانی عوام کی تمناؤں سے ہم آہنگ تھی بلکہ اس کی ضرورتوں اور تقاضوں کو بھی پورا کرتی تھی۔

رپورٹ میں مساوات کا جو طریق کار وضع کیا گیا تھا اسے قانون ساز اسمبلی کے بہت سے نمائندوں بالخصوص پنجاب کے ارکان نے تسلیم نہ کیا۔ مشرقی پاکستان کے اکثر نمائندوں نے بھی اس کی مخالفت کی، کیونکہ اس میں انھوں نے دونوں حصوں کے درمیان مساوات (Parity) کے اصول کے تحت اپنی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل ہوتے محسوس کیا۔ اس فارمولے پر عمل درآمد کی صورت میں ان کی دیرینہ خواہش کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں، اس لیے انھیں غالب حیثیت ملنی چاہیے، پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس رپورٹ پر تنقید کا سلسلہ شروع کردیا۔ ڈھاکہ، چٹاگانگ اور مختلف مقامات پر سیمینار ہوئے، جن میں اس رپورٹ کو ناقابلِ قبول قرار دیا گیا۔ دوسری طرف پنجاب میں ردِعمل اس رپورٹ کے خلاف تھا۔ یہاں اس خطرے کا اظہار کیا گیا کہ مغربی پاکستان میں صوبوں کو نمائندگی دیتے وقت پنجاب کی اکثریتی حیثیت کو غیر موثر بنا دیا گیا ہے اور اب مشرقی پاکستان کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے صوبے کے نمائندوں کو ساتھ ملا کر مرکزی پارلیمنٹ میں من مانی کرسکتا ہے۔ ان بدگمانیوں کی بناء پر اسے ''بنگالی ، پنجابی بحران رپورٹ'' کا نام دیا گیا۔

علاوہ ازیں اس رپورٹ میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جائے گا' جو اس امر پر کڑی نگاہ رکھے گا کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ بننے پائے۔ اس تجویز کو بعض حضرات نے پارلیمنٹ کے اختیارات کے ماورا خیال کیا۔

جہاں تک اسلامی علوم سے واقفیت کا تعلق ہے۔ ایک اسلامی مملکت میں یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ مجلس قانون ساز کے ممبروں کی اکثریت اسلامی روح سے آشنا ہو اور قرآن و سنت کو سمجھتی ہو۔ اس لیے قرآن و سنت کی تاویلات پر مخصوص علماء کی اجارہ داری کا تصور ناپسند کیا۔

اگرچہ اس رپورٹ میں مرکز کا تصور ایک مضبوط مرکز کا تھا۔ لیکن یہ مضبوطی صوبوں کی خود اختیاری غصب کرکے بخشی گئی تھی ۔ اس پر صرف پنجاب کے ارکان اسمبلی نے اظہار ناراضی کیا اور مشرقی پاکستان کے نمائندوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ صوبائی خود مختاری کے زیادہ خواہاں تھے۔ پنجاب کے ارکان نے محسوس کیا کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مشرقی پاکستان مرکز میں اپنی عددی اکثریت کے بل پر مغربی پاکستان پر حکومت کرے۔

رپورٹ کے متذکرہ صدر نقائص کے باعث ملک کے دونوں حصوں میں اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس سے قبل کہ اسمبلی میں رپورٹ پر بحث ہوتی' مشرقی پاکستان میں بلوے شروع ہوگئے اور امن و امان کی صورت حال ابتر ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں 16 اپریل 1953ء کو گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی دفعہ 10 کے تحت منسوخ کردیا اور محمد علی بوگرہ کو جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، نئی وزارت بنانے کی دعوت دی۔

مولوی تمیز الدین خان نے' جو منسوخ شدہ اسمبلی کے

صدر تھے' گورنر جنرل کے اقدام کو سندھ چیف کورٹ میں چیلنج کر دیا اور کورٹ نے مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن حکومت نے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جس نے حکومت کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ اسمبلی سات سال کی طویل مدت میں آئین بنانے میں ناکام رہی ہے' لہٰذا یہ غیر نمائندہ بن چکی ہے۔ اب گورنر جنرل نئی آئین ساز اسمبلی قائم کرے۔

نئی آئین ساز اسمبلی کے لیے اسی 80 نشستیں مخصوص کی گئیں جن میں سے 40 مشرقی پاکستان کو دی گئیں اور ان میں سے 9 مشرقی پاکستان کی اقلیتوں کے لیے مخصوص کی گئیں۔ مغربی پاکستان کے لیے نشستوں کا تناسب حسب ذیل مقرر کیا گیا۔

پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نمائندوں کا انتخاب صوبائی مجالس قانون ساز کے نمائندوں کی وساطت سے ہوا۔ بلوچستان اور کراچی کے نمائندوں کے لیے خاص انتظامات کیے گئے اور باقی علاقوں کے نمائندوں کا مسئلہ آئین ساز اسمبلی پر چھوڑ دیا گیا۔

مغربی پاکستان میں نئے انتخابات کے نتیجہ میں مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ لیکن مشرقی پاکستان سے اس کو صرف ایک نشست ملی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئین ساز اسمبلی میں مسلم لیگ اپنی بھاری اکثریت سے تو محروم ہوگئی لیکن پھر بھی سب سے بڑی جماعت وہی رہی۔ چوہدری محمد علی سابق وزیر خزانہ اب محمد علی بوگرہ کی جگہ وزیر اعظم منتخب ہوگئے۔ اسی دوران میں میجر جنرل اسکندر مرزا غلام محمد کی جگہ گورنر جنرل بن گئے تھے۔ انھوں نے چوہدری صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ جسے انھوں نے قبول کر لیا اور مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کے ساتھ مل کر وزارت بنائی۔

نئی حکومت نے سب سے پہلے وحدت مغربی پاکستان کا بل منظور کیا۔ جس کی رو سے تمام صوبوں کو ختم کر کے مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ اس سے آئین سازی میں بہت سی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ کیونکہ پیچیدہ اور مشکل مسئلہ اسمبلی میں یونٹوں کی نمائندگی اور ایوانوں کے اختیارات کا تھا۔ چنانچہ وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے ساتھ یونٹوں کی نمائندگی کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ لیکن ان صوبوں کے مابین جو ماضی میں خصوصی طور پر الگ تھے' اتحاد اور وحدت کا احساس پیدا کرنے کے لیے بھی ایک تحریک کی ضرورت تھی جو کمزور پڑ چکی تھی۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق تھا' اسے بھی اس وحدت سے فائدہ تھا کیونکہ قبل ازیں وہ پانچ صوبوں میں سے ایک صوبہ تھا اور اسے اپنے مطالبات کے لیے باقی صوبوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب صرف دو صوبے اور دو صوبائی حکومتیں تھیں۔ لہٰذا مشرقی اور مغربی پاکستان کے مطالبات پر یکساں توجہ دی جا سکتی تھی۔

1956ء کے آئین کی منظوری

چوہدری محمد علی نے وزیر اعظم بننے کے بعد اپنی پہلی پریس کانفرنس میں قوم سے وعدہ کیا کہ آئین سازی کے مسئلے کو سب پر فوقیت دی جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ وحدت مغربی پاکستان کے بعد آئین سازی کا کام آسان ہوگیا۔ لیکن اب بھی بہت سی پیچیدگیاں ایسی تھیں، جنھیں رفع کرنا ضروری تھا۔ چوہدری محمد علی نے رات دن کی محنت سے بالآخر ایسا فارمولا بنا لیا، جس پر تمام گروپ راضی ہوگئے۔

آئین کا بل 9 جنوری 1956ء کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا اور 29 فروری 1956ء کو مسودہ دستور پاس ہوگیا۔ 2 مارچ 1956ء کو بل گورنر جنرل کی منظوری کے لیے بھیجا گیا اور 23 مارچ 1956ء سے دستور نافذ ہوگیا۔ جس کی رو سے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔ دستور بنا تو قوم نے سوچا کہ شاید سیاہ رات کٹ گئی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا لیکن ابھی دو ہی برس گزرے تھے کہ قوم کو ایک بار پھر سیاسی بحران سے گزرنا پڑا جس نے ملک کو پھر اسی راہ پر لا کھڑا کیا' جسے اس نے بمشکل 1947ء سے 1956ء تک طے کیا تھا۔

1962ء کا آئین

صدر ایوب نے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا جس نے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے ایک سوالنامہ جاری کیا اور ملک کے ہر حصہ میں آئینی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے بہت سے لوگوں سے تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ طویل غور و خوض کے بعد اس کمیشن نے 6 مئی 1961ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ میں پارلیمانی حکومت کی ناکامی کی وجہ ملک میں ہر دلعزیز اور مخلص قیادت کا فقدان بتائی گئی تھی۔ کمیشن کے مطابق قیادت کے فقدان کا نتیجہ یہ نکلا کہ کما حقہ منظم اور ضبط کی خوگر سیاسی پارٹیاں معرض وجود میں نہ آ سکیں اور ملک میں جمہوریت کی ناکامی و انتشار کا سب سے بنیادی سبب سیاسی رہنماؤں میں ایمان و اخلاص کا فقدان تھا۔

کمیشن کی رپورٹ کا کئی کمیٹیوں نے جائزہ لیا۔ اگرچہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق نیا آئین مرتب کیا گیا ہے لیکن یہ بات درست نہیں تھی۔ اوائل 1962ء میں جب نئے کمیشن کی تفصیلات کا اعلان کیا گیا تو جسٹس شہاب الدین نے ایک مختصر دوٹوک اخباری بیان میں اس آئین سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن ایوب خان کی مارشل لاء حکومت نے اس بیان کی اشاعت روک دی۔ 1962ء کا آئین ایوب خان کے مقرر کردہ چند افراد نے مرتب کیا تھا۔ یہ سارا کام صیغۂ راز میں کیا گیا تھا اور پھر یک بیک اسے ملک پر مسلط کر دیا گیا۔ جمہوری روایات و معمولات کے برعکس اس آئین کو رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے عوام کے سامنے نہیں لایا گیا۔ بلکہ جب اس آئین کی اشاعت پر بعض اخبارات نے اس کے غیر جمہوری پہلوؤں کی محتاط نشاندہی شروع کی تو مارشل لاء کے ضوابط کے تحت کارروائی کی دھمکی دے کر یہ سلسلہ بند کرا دیا گیا۔ اس زمانہ میں فرانس میں بھی انھی خطوط پر آئین مرتب ہوا تھا۔ لیکن فرانسیسی آئین میں نہ صرف جمہوری روایات کا احترام کیا گیا تھا، اسے عام استصواب کے ذریعے عوام کی منظوری کے لیے بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کے عوام کو اوپر سے آئین دیا گیا تھا۔

اس آئین میں پاکستان میں عاملہ کے سربراہ کو ''صدر'' کا نام دیا گیا تھا۔ وہی رسوم و تقاریب کے علاوہ عاملہ کے سلسلہ میں فرائض سرانجام دیتا تھا اور ملک کے انتظام و انصرام کے لیے تن تنہا خود ذمہ دار تھا۔ 35 سال اور اس سے زائد عمر کا پاکستانی شہری جو قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل ہو، عہدۂ صدارت کا بھی امیدوار بن سکتا تھا۔ تاہم صدر مجلس قانون ساز کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ صدر کے عہدہ کے لیے انتخاب اس وقت ہو سکتا تھا جب صدر اپنے عہدہ کی میعاد پانچ سال پوری کر چکا ہو، صدر کے خلاف عدم اعتماد و ملامت کی قرارداد منظور کی گئی ہو اور اسے سزا دی گئی ہو یا اسے معذور قرار دے دیا گیا ہو یا اس کے اپنے منصب کا حلف نہ اٹھایا ہو اور قومی اسمبلی توڑی جا چکی ہو۔ صدر کا انتخاب بالواسطہ طور پر بنیادی جمہوریتوں کے وہ 80 ہزار ارکان (بعد میں یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک بڑھا دی گئی) کرتے تھے، جن کا انتخاب بہت مختصر حلقوں میں عوام براہ راست بالغ رائے دہی کی اساس پر کرتے تھے۔ صدر اپنی میعاد کے دوران میں مستعفی بھی ہو سکتا تھا اور پھر دوبارہ اس عہدہ کے لیے انتخاب میں حصہ لے سکتا تھا۔ البتہ اس عہدہ کے لیے تیسری مرتبہ امیدوار بننے کا انحصار اسمبلی کی منظوری پر تھا۔ اس سلسلہ میں دونوں صوبائی اسمبلیوں کی منظوری ضروری تھی۔ صدارتی عہدہ کے امیدواروں کی تعداد تین (اور برسر اقتدار صدر کے دوبارہ انتخاب میں حصہ لینے کی صورت میں چار) سے زائد ہوتی تو پھر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے مشترکہ اجلاس میں زائد امیدواروں کو مسترد کرنے کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ ووٹوں کی گنتی کے سلسلہ میں کوئی اختلاف و نزاع ہو تو چیف الیکشن کمشنر یہ الجھن دور کرتا تھا۔ منتخب صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے سامنے اپنی منصبی ذمہ داریوں کو ایمانداری سے ادا کرنے کا حلف اٹھاتا تھا۔ ایک مرتبہ صدر حلف اٹھا لیتا تو پھر اسے

قومی اسمبلی ہی اس منصب سے ہٹا سکتی تھی۔ عدم اعتماد اور ملامت کی قرارداد کے نوٹس پر قومی اسمبلی کے کل ارکان کی ایک تہائی کے دستخط ضروری تھے اور تعزیری قرارداد کی منظوری کے لیے تین چوتھائی ارکان کے ووٹ ضروری تھے۔ اگر کل ارکان اسمبلی میں سے نصف سے کم اس قرارداد کی حمایت کرتے تو عدم اعتماد اور ملامت کی قرارداد پیش کرنے والے ارکان اپنی نشستوں سے محروم ہو جاتے تھے۔ صدر کو معذور قرار دینے کے لیے من وعن یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔

وزیروں کی مرکزی کونسل

صدر چند افراد پر مشتمل وزارتی کونسل مقرر کرتا تھا۔ اگرچہ نظری اعتبار سے وہ ہر شخص کو اس کونسل کے لیے چننے کا مجاز تھا جو قومی اسمبلی کا رکن بننے کا اہل ہو، لیکن عملاً اسے انتخاب میں جغرافیہ، مختلف گروہوں کی تالیفِ قلب اور ان سے مصالحت، سیاسی حکمتِ عملی، انتظامی اہلیت، ذاتی روابط اور شخصی پسند کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔ وزیر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شامل ہونے اور بحث وغور میں حصہ لینے کے مجاز تھے، لیکن انھیں رائے شماری میں حصہ لینے کا حق نہیں تھا۔ ایوان میں سرکاری اقدامات وزیروں کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ وزیر صرف صدر کے سامنے جوابدہ تھے اور وہ انھیں برطرف بھی کر سکتا تھا۔ وزارتی کونسل کے ارکان کی تعداد مقرر نہیں تھی۔ اس منصب پر تقرر کے بعد ہر وزیر کو یہ حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ایمانداری سے ادا کرے گا۔ وزیر کی تنخواہ 3,000 روپے ماہانہ تھی۔ علاوہ ازیں اسے بعض الاؤنس اور مراعات بھی حاصل تھیں۔ وزارتی کونسل بہ حیثیت مجموعی ایک مشاورتی ادارہ تھی اور صدر اس کی عمومی رائے سے اتفاق رائے کرنے کا پابند نہیں تھا۔ انفرادی طور پر وزیر مختلف محکموں کے سربراہ تھے۔ وزارتی کونسل کے اجلاس کی صدارت عام طور پر صدرِ مملکت ہی کرتا تھا۔ اہم فیصلے صدر وزارتی کونسل کے مشورے سے کرتا تھا۔

قومی اسمبلی

آئین 1962ء کے تحت مرکزی مجلس قانون ساز صدر اور قومی اسمبلی پر مشتمل تھی۔ قومی اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد 156 تھی۔ اُن میں سے چھ نشستیں عورتوں کے لیے مخصوص تھیں۔ تمام نشستیں مساوی طور پر دونوں صوبوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔ بعد میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قومی اسمبلی کے ارکان کی تعداد 156 سے بڑھا کر 218 کر دی گئی تھی۔ اس کے مطابق 200 ارکان منتخب کیے جانے تھے۔ دس دانشوروں کو حکومت نے نامزد کرنا تھا اور 8 نشستیں عورتوں کے لیے مخصوص تھیں۔ اسمبلی کی عام میعاد پانچ سال تھی۔ اسمبلی کا اجلاس صدر کی ہدایت یا ایک تہائی ارکان کی درخواست پر سپیکر طلب اور ملتوی کر سکتا تھا۔ بعض آئینی حدود کے اندر رہ کر صدر قومی اسمبلی کو توڑ بھی سکتا تھا۔

قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے والے امیدوار کے لیے ضروری تھا کہ وہ پاکستان کا شہری ہو۔ اس کی عمر 25 سال سے کم نہ ہو اور وہ متعلقہ انتخابی حلقے میں کم از کم چھ ماہ سے رہائش پذیر ہو، بشرطیکہ وہ حکومت پاکستان کا باتنخواہ ملازم نہ ہو، اسے دیوالیہ نہ قرار دیا گیا ہو۔ پچھلے پانچ سال کے عرصہ میں اسے کسی ایسے جرم میں سزا نہ ملی ہو، جس کی پاداش میں سزائے قید دو سال سے کم نہ ہو۔ سرکاری ملازمین کی بیویاں انتخاب میں حصہ لینے کی اہل ومجاز نہیں تھیں۔ کسی اعتراض اور خامی کی صورت میں چیف الیکشن کمشنر کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔ جو رکن اسمبلی کے 130 اجلاسوں میں مسلسل غیر حاضر رہتا تھا یا وزارتی کونسل کا رکن بن جاتا تھا یا حلف اٹھانے سے قاصر رہتا تھا اس کی رکنیت بھی ختم ہو جاتی تھی۔ رکن کسی وقت بھی اپنی رکنیت سے مستعفی ہو سکتا تھا۔ قومی اسمبلی کے رکن کو ایوان میں مکمل آزادیٔ اظہار حاصل تھی۔ ارکان کو اسمبلی کے اجلاس کے دوران اور اجلاس سے چودہ دن پہلے اور چودہ دن بعد تک نہ نظر بند کیا جا سکتا تھا اور نہ کسی مقدمہ کی سماعت میں حاضر ہونے کے لیے پابند کیا جا سکتا تھا۔ تاہم ان معاملات میں سپیکر کو کسی رکن کی مراعات وتحفظات میں کمی کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

قومی اسمبلی کی کارروائی سپیکر اور اس کے غیر حاضری میں ڈپٹی سپیکر کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ یہ کارروائی کسی بھی عدالت میں زیر بحث نہیں لائی جا سکتی تھی۔ اسمبلی میں فیصلے حاضر ارکان کی اکثریت کرتی تھی۔ سوائے ان معاملات کے جن کے لیے دو تہائی یا تین چوتھائی اکثریت ضروری تھی۔ رائے شماری میں مخالفت وموافقت میں مساوی ووٹ ہونے کی صورت میں سپیکر بھی ووٹ دے سکتا تھا۔ اسمبلی میں کسی غیر مجاز رکن کی شمولیت سے کارروائی کالعدم قرار نہیں پاتی تھی۔ کورم 40 ارکان پر مشتمل تھا۔ اسمبلی کا اجلاس سال میں دو مرتبہ ہونا لازمی تھا۔

سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا انتخاب ارکانِ اسمبلی میں سے عام انتخابات کے فوراً بعد ہوتا تھا۔ سپیکر مستعفی ہو سکتا تھا اور اسے نصف سے زیادہ ارکان کی حمایت سے علیحدہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ سپیکر سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ جماعتی وابستگی سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض سرانجام دے گا۔ سپیکر کی تنخواہ مرکزی وزیر کے برابر مقرر تھی۔ سپیکر اور ڈپٹی سپیکر دونوں غیر حاضر ہوں تو سپیکر نے جن چار ارکان کو چیئرمین بنایا ہوتا تھا ان میں کوئی ایک ترتیب کے مطابق اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرتا تھا۔

قومی اسمبلی کو پاکستان کے مرکزی معاملات میں قانون سازی کا خصوصی اور بلاشرکت غیرے اختیار حاصل تھا۔ وہ حسب خواہش وضرورت صوبائی فہرست میں شامل معاملات کے بارے میں بھی قانون بنانے کی مجاز تھی۔ کسی قومی اور صوبائی قانون میں عدم مطابقت کی صورت میں اول الذکر کو فوقیت حاصل ہوتی تھی۔ امتناع نظر بندی کے کسی معاملہ میں قانون سازی کے لیے صدر سے پیشگی اجازت لینا ضروری تھا۔

گورنر

صوبائی عاملہ کے سربراہ، (گورنر) کو صدر نامزد کرتا تھا۔ صدر اسے کسی وقت بھی علیحدہ کر سکتا تھا۔ مزید برآں جب اسے نامزد کرنے والا صدر اپنے منصب سے ہٹ جاتا تھا تو گورنر بھی اپنے عہدہ پر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ گورنر مستعفی ہو کر بھی اپنے منصب سے سبکدوش ہو سکتا تھا۔

ہر اس شخص کو گورنر مقرر کیا جا سکتا تھا جو قومی اسمبلی کا رکن بننے کا اہل ہو۔ اگر صدر کے خیال میں گورنر کسی سنگین بدعنوانی کا مرتکب ہو تو وہ اسے علیحدہ کرنے کے ساتھ سزا بھی دے سکتا تھا۔ سزا کی توثیق کے لیے ایک خاص ٹریبونل کی طرف سے صدر کے فیصلہ کی توثیق ضروری تھی، جسے صدر اور سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کرتا تھا۔ سزا یافتہ گورنر کو پانچ سال کے لیے عوامی مناصب کے لیے نااہل قرار دیا جا سکتا تھا۔

گورنر کو اپنے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے سامنے یہ حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ اپنے فرائض وفاداری سے ادا کرے گا۔

گورنر کی تنخواہ صدر مقرر کرتا تھا۔ جب ایک مرتبہ تنخواہ مقرر ہو جاتی تھی، اسے گورنر کی میعاد میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گورنر بھی صدر کے مساوی ''مراعات'' سے بہرہ مند ہوتا تھا۔

صوبہ میں گورنر کو بھی عاملہ، قانون سازی، مالیاتی اور دیگر معاملات میں وہی اختیارات حاصل تھے جو مرکزی حکومت میں صدر کو حاصل تھے۔ تاہم گورنر اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں صدر کے سامنے جوابدہ تھا۔

وزیروں کی صوبائی کونسل

وزیروں کی صوبائی کونسل کو گورنر صدر کی منظوری سے مقرر کرتا تھا، جس کی حیثیت محض مشاورتی ہوتی تھی۔ گورنر کسی بھی وزیر کو کسی وقت بھی سبکدوش کرنے کا مجاز تھا۔ اگر گورنر کے نزدیک کسی وزیر نے سنگین بدعنوانی کا ارتکاب کیا ہو تو وہ اسے برطرفی کے علاوہ سزا بھی دے سکتا تھا۔ لیکن اس کی سزا کی توثیق ایک ٹریبونل کرتا تھا، جسے گورنر ہائی کورٹ چیف جسٹس کے مشورہ سے قائم کرتا تھا۔ سزا یافتہ وزیر کو پانچ سال کے لیے عوامی مناصب کے لیے نااہل قرار دیا جا سکتا تھا۔

وزیر اسی شخص کو مقرر کیا جا سکتا تھا، جو صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کا اہل ہو۔ وزیر کوئی دوسرا باتنخواہ

عہدہ قبول نہیں کرسکتا تھا۔ جب تک وہ کسی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی نہیں ہوسکتی تھی۔

خالص منصبی الاؤنسوں اور دوسری مراعات کے علاوہ وزیر کو اپنی ساری میعاد میں 2500 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

مرکزی وزارتی کونسل' صدر اور قومی اسمبلی پر جن اصولوں کا اطلاق ہوتا تھا' صوبائی وزارتی کونسل' گورنر اور صوبائی اسمبلی بھی ان کے پابند تھے۔

صوبائی مقننہ

ہر صوبہ میں صوبائی مقننہ گورنر اور صوبائی اسمبلی پر مشتمل ہوتی تھی۔ صوبائی اسمبلی کی عام نشستوں کی تعداد 150 تھی اور عورتوں کے لیے پانچ نشستیں مخصوص تھیں۔ مغربی پاکستان میں آٹھ سال کے لیے سابق صوبہ پنجاب کے لیے صرف 60 نشستیں مقرر کی گئی تھیں۔ اس پابندی کا اطلاق آئین کے نفاذ (8 جون 1962ء) سے ہونا تھا۔ بعد میں آئین میں ترمیم کے ذریعے صوبائی اسمبلی کے ارکان کی تعداد 218 تک بڑھا دی گئی، جن میں 10 نشستیں دانشوروں کے لیے مخصوص تھیں۔ انھیں حکومت نے نامزد کرنا تھا۔ علاوہ ازیں عورتوں کے لیے 8 نشستیں تھیں۔ قومی اسمبلی کا رکن بننے کا اہل شخص صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کا مجاز تھا۔ جس بنیاد پر قومی اسمبلی کے رکن کی رکنیت کالعدم قرار پائی تھی' اس کا اطلاق صوبائی اسمبلی کے ارکان پر بھی ہوتا تھا۔ صوبائی اسمبلی کی عاممیعاد پانچ سال تھی' لیکن گورنر یا صوبائی اسمبلی کے سپیکر کی سفارش پر قومی اسمبلی اور صدر اتفاق رائے سے اسے میعاد پوری ہونے سے پہلے بھی توڑ سکتے تھے۔ صوبائی اسمبلی کا اجلاس گورنر اور سپیکر 43 ارکان کی درخواست پر، طلب اور ملتوی کرسکتا تھا۔ البتہ جس کی طرف سے اجلاس بلایا جاتا تھا، وہی اسے ملتوی کرسکتا تھا۔

قومی اور صوبائی اسمبلی کے قواعد وضوابط' سپیکر کا کردار اور ایوان میں قانون سازی کا طریق کار یکساں تھے۔ مرکز میں صدر جس طرح قومی اسمبلی سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ وہی طریقہ صوبائی اسمبلی میں گورنر اختیار کرتا تھا۔ مرکزی وصوبائی قانون سازی میں کسی عدم مطابقت کی صورت میں اوّل الذکر کو فوقیت حاصل ہوتی تھی۔

دوسرا مارشل لاء مارچ 1969ء

1962ء کے آئین اور ایوب حکومت کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف بے اطمینانی کے باعث ملک بھر میں مظاہروں کی آگ بھڑک اٹھی اور 1968ء کے آخری مہینوں میں انھوں نے یکایک طوفانی شکل اختیار کرلی۔ مظاہرین سابق صدر ایوب خان کی آمرانہ حکومت کے خلاف شدید احتجاج کرنے لگے۔ عوام کے احتجاج کا بنیادی ہدف غلط اقتصادی پالیسیاں، آئین، ون یونٹ اور نوکر شاہی تھے۔ اقتصادی منصوبہ بندی نے ملک بھر میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑا دی تھی۔ کیونکہ ان کی وجہ سے دولت اور اقتصادی طاقت محدود سے چند ہاتھوں میں مرتکز ہوگئی تھی۔ مزید برآں قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ لوگوں کی آمدنی کی صلاحیت میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ سیاسی محاذ پر آئین 1962ء کو منسوخ کرنے اور پارلیمانی نظام حکومت کی بحالی کا بیک زبان مطالبہ کیا جارہا تھا۔ چھوٹے صوبے ایک یونٹ کو توڑنے کا مطالبہ کررہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں صوبائی خودمختاری اور قومی مقننہ میں آبادی کی اساس پر نمائندگی کے دیرینہ مطالبہ کی صدائے بازگشت سنی جانے لگی۔ ان سب باتوں نے ملک میں سیاسی بحران پیدا کردیا اور مفاہمت ومصالحت پر مبنی کسی ایک ایسے فارمولا کی تشکیل ممکن نہ رہی جس سے بحران پر قابو پایا جاسکتا۔

رائے عامہ کو سخت اور ہمہ گیر دباؤ کے تحت ایوب خان کو مستعفی ہونا پڑا۔ آئین منسوخ کردیا گیا اور 22 سال کے بعد پاکستان ایک مرتبہ پھر سرزمین بے آئین بن گیا۔ ایک مرتبہ پھر ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا اور جنرل یحییٰ خان نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔ سیاسی لیڈروں کے مابین آئندہ آئین کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور آزادی کے 22 سال بعد ملک ایک مرتبہ پھر آئینی مخمصہ میں مبتلا ہوگیا تھا۔

یحییٰ خان نے آئینی اور سیاسی مسائل کے سلسلہ میں سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے تبادلۂ خیال کیا۔ لیکن ان کے نظریات میں بنیادی اور شدید اختلافات تھے۔ ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اس نے بعض اہم سیاسی مسائل مثلاً ایک یونٹ، آبادی کی اساس پر نمائندگی وغیرہ کا خود ہی فیصلہ کردیا۔ لیکن صوبائی خودمختاری اور وفاقی مرکز میں دوسرے ایوان کو نظرانداز کردیا۔ اپنی مقتدر حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک یونٹ کو توڑ دیا اور مغربی پاکستان میں سابق صوبے پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ بحال کردیئے۔ یہ صوبے جولائی 1970 میں پوری طرح معرضِ وجود میں آگئے۔ اس نے ''ایک آدمی ایک ووٹ'' کا اصول بھی تسلیم کرلیا اور مساوی نیابت کو ختم کردیا۔ یہ تمام بنیادی مسائل ایک ایسی غیر نمائندہ حکومت نے طے کیے تھے جسے ان کے سلسلہ میں عوام نے کوئی حق واختیار نہیں دیا تھا۔ مغربی پاکستان میں پرانے صوبوں کی بحالی سے صوبوں کی مضبوط اور واحد حیثیت کو دھچکا لگا۔ دوسری طرف ''ایک آدمی ایک ووٹ'' کا اصول منظور ہونے سے مشرقی پاکستان کو سارے ملک پر غلبہ اور فوقیت حاصل ہوگئی۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن حلقوں کے پرزور مطالبہ، بلکہ شدید اصرار کے باوجود یحییٰ خان نے صوبائی خودمختاری کی نوعیت اور حدود طے کرنے سے گریز کیا اور متذکرہ صدر کے دونوں اقدامات سے شیخ مجیب الرحمان کی آمادۂ بغاوت شخصیت کو ابھرنے میں بڑی مدد ملی۔

یحییٰ خان نے جو آئینی فارمولا پیش کیا۔ اس کے مطابق قومی اسمبلی 313 ارکان پر مشتمل ہوتی تھی اور اس میں مختلف صوبوں کو حسب ذیل نمائندگی دی تھی:

عام انتخابات بالغ رائے دہی کی اساس پر دسمبر 1970ء میں ہوئے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے انتخابی مہم میں بڑا سرگرم حصہ لیا۔ منشور اور پروگرام چھاپے اور تقسیم کیے گئے۔ اس انتخابی مہم کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ پہلی مرتبہ تمام سیاسی پارٹیوں نے عام لوگوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے جامع ومبسوط اقتصادی پروگرام مرتب کیے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیاسی لیڈروں نے برادری قبیلہ کے تعصّبات کو ابھارنے کے پرانے ہتھیار بھی آزمائے۔

انتخابی نتائج سے معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے بڑی بھرپور، بلکہ محیر العقول کامیابی حاصل کی ہے۔ 169 میں سے 167 نشستیں اس کے امیدواروں نے جیت لیں۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی 86 نشستیں جیت کر اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری۔ لیکن اس نے صرف دو صوبوں پنجاب اور سندھ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یحییٰ خان نے دونوں بڑی پارٹیوں کے لیڈروں شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی اور اوّل الذکر کو مستقبل کا وزیر اعظم قرار دیا۔ کافی تاخیر کے بعد 3 مارچ 1971ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا گیا۔ لیکن فروری کے عین آخر میں یحییٰ خان نے یک لخت اسمبلی کا اجلاس یہ بہانہ بنا کر ملتوی کردیا کہ آئندہ آئین کے بارے میں بڑی پارٹیوں کے لیڈروں میں عمومی اتفاق نہیں ہوسکا۔

مملکت بلاامتیاز مذہب ونسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور قیام کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگار ہوں، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں

مشرقی پاکستان میں پہلے ہی مغربی پاکستان کے خلاف منافرت کے جذبات بہت شدید تھے۔ کیونکہ عوامی لیگ نے اپنی انتخابی مہم میں سب سے زیادہ زور مغربی پاکستان کے خلاف زہریلے پروپیگنڈہ پر دیا تھا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں التواء کا اچانک اعلان اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور وہاں تشدد سے لبریز ہنگامہ آرائی اور ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ عوام سڑکوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ امن وامان یکسر تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ یہ صورت حال پاکستان کے ان مخالف عناصر کے لیے بہت سازگار، بلکہ خداداد موقع تھا جو پہلے ہی علیحدگی کا پرچار کر رہے تھے اور علیحدگی پسند عناصر کی سرپرستی کر رہے تھے۔ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مشرقی پاکستان کے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مغربی پاکستان کی قیادت مشرقی پاکستان کو اختیار و اقتدار سے محروم رکھنے کے درپے ہے۔ چنانچہ لوگوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ ان کے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔ یہ تحریک بتدریج تقویت حاصل کرتی گئی اور بالآخر حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ اس کے بعد مغربی پاکستانیوں اور مشرقی پاکستان میں بہاری مسلمانوں کے بے دریغ قتلِ عام اور کھلی لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر شیخ مجیب الرحمٰن کی سربراہی میں ایک متوازی حکومت قائم ہو گئی اور اس کے اعلانات اور ہدایات پر صوبائی اور مرکزی محکمے حتیٰ کہ عدالتی ادارے بھی عمل کرنے لگے۔

اس دوران میں یحییٰ خان خاموش مبصر بنا رہا تھا۔ لیکن جب حالات پوری طرح قابو سے باہر ہو گئے تو اس نے فوج کو کارروائی کرنے کا حکم دے دیا۔ فوج نے ایک ماہ کے مختصر عرصہ میں مشرقی پاکستان کے ہر حصہ کو باغیوں اور تخریب کاروں سے بڑی حد تک صاف کر دیا۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان سے لوگ بالخصوص ہندو بڑی تعداد میں بھارت چلے گئے تھے اور بھارت نے ان تارکین وطن کو پاکستان کے خلاف ایک مسئلہ بنا دیا، یحییٰ خان نے فوجی کارروائی کے بعد اصل مسئلہ کے سیاسی حل کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ چنانچہ باغی عناصر اور تخریب کار پھر سرگرمِ عمل ہو گئے اور بالآخر 1971ء میں بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا اور وسط دسمبر تک مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔

1973ء کا آئین

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد یحییٰ خان نے 20 دسمبر 1971ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو عنانِ حکومت منتقل کر دی اور وہ صدر مملکت کے ساتھ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی بن گئے۔ قومی اسمبلی کا اجلاس 14 اپریل کو ہوا اور ایک عبوری آئین کی منظوری کے ساتھ مارشل لاء 21 اپریل 1972ء کو اٹھا لیا گیا۔

قومی اسمبلی نے پاکستان کے مستقل دستور کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی 17 اپریل 1972ء کو تشکیل دی، جس کی سوچ بچار کے نتیجے کے طور پر موجودہ مسودہ آئین تیار ہوا۔ مسودہ دستور پہلی مرتبہ 2 فروری 1973ء کو قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا، جس پر بحث ہوتی رہی اور اپوزیشن اور حکومت نے افہام و تفہیم کے ذریعے مسودۂ دستور پاس کر دیا اور 12 اپریل کو صدر مملکت نے اس کی منظوری دے دی۔ 14 اگست 1973ء کو یہ دستور ملک میں نافذ کر دیا گیا اور صدر مملکت، وزیراعظم، گورنرز اور صوبائی کابینہ کے ارکان نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھا لیے۔

یہ آئین پاکستان کے عوام کو 26 سال کے بعد ملا ہے اور عوام کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہے۔ اس لحاظ سے اس آئین کو گزشتہ دساتیر پر فوقیت حاصل ہے کہ اسے عوام کے صحیح منتخب نمائندوں پر مشتمل دستور ساز اسمبلی نے تشکیل دیا اور متفقہ طور پر پوری قوم نے اسے قبول کیا۔ تین ارکان اسمبلی کے علاوہ جنھوں نے کارروائی میں حصہ نہ لیا، دستور ساز اسمبلی کے تمام ارکان بشمول حزبِ اختلاف نے متفقہ طور پر آئین کی حمایت کی اور مسودہ پر دستخط کیے۔ یہ ایک عظیم الشان آغاز تھا۔

آئین سازی بلاشبہ پیپلز پارٹی کا عظیم کارنامہ تھا۔ لیکن اصل کام اسے کامیابی سے نافذ کرنا اور عملی جامہ پہنانا تھا اور یہ راہ بہرحال بہت کٹھن تھی اور اسی راہ پر عوامی حکومت نے ٹھوکر کھائی۔ اول تو دستور کو اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہ کیا گیا۔ صوبائی خودمختاری محض دستور کے اوراق کے ساتھ محدود رہی۔

14 اگست 1973ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء کے آئین کا نفاذ کیا۔ اس پر تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے دستخط کیے۔ اس لیے اس آئین کو پاکستان کے لیے مستقل اور متفقہ آئین کی حیثیت حاصل ہوئی۔

1973ء کی آئینی ترمیمات

1973ء کے آئین میں اب تک سترہ ترامیم ہو چکی ہیں، ان میں زیادہ اہم اور قابل ذکر یہ ہیں:

تیسری ترمیم

(ا) آئین میں ترمیم کا تیسرا بل فروری 1975ء میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا جس کی رو سے ہنگامی حالات سے متعلق آئین کی شقوں میں ردوبدل کیا گیا۔

چوتھی ترمیم

(ا) قومی اسمبلی کے غیر مسلم اقلیتوں کی نشستوں میں اضافہ۔
(ب) امتناع نظر بندی کے قوانین میں مزید ردوبدل۔

پانچویں ترمیم

(ا) صوبائی گورنروں کے تقرر اور میعادِ عہدہ میں ردوبدل۔
(ب) سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے کی میعاد اور ریٹائرمنٹ کی شرائط میں تبدیلی۔
(ج) ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان کے عہدے کی میعاد اور ریٹائرمنٹ کی شرائط میں تبدیلی۔
(د) امتناع نظر بندی کے سلسلے میں ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار میں مزید کمی۔
(ر) ہائی کورٹ کے ججوں کی تبدیلی، میعادِ عہدہ اور ریٹائرمنٹ کے قوانین میں ردوبدل۔
(س) عدلیہ اور مقننہ میں علیحدگی کرنے کی میعاد میں اضافہ۔

چھٹی ترمیم

(ا) سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی ریٹائرمنٹ کی عمر میں تبدیلی۔
(ب) ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان کی ریٹائرمنٹ کی عمر، قومی اسمبلی نے اس ترمیم کی منظوری 22 دسمبر 1976ء کو دی۔

ساتویں ترمیم

(ا) صدر کی طرف سے ریفرنڈم کا انعقاد اور اس کا طریقہ کار۔
(ب) فوجی کارروائی کی صورت میں ہائی کورٹ کے دائرہ اختیارات میں کمی۔

آٹھویں ترمیم

آٹھویں ترمیم کی منظوری غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آنے والی قومی اسمبلی نے 11 نومبر 1985ء کو دی۔ چونکہ بڑی سیاسی جماعتوں نے بالعموم غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا، اس لیے اسمبلی سے باہر اس ترمیم کی زبردست مخالفت کی گئی جبکہ اسمبلی کے اندر بھی آزاد گروپ نے اس کی مخالفت کی۔ تاہم اس اسمبلی پر صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کا سخت دباؤ تھا اس لیے اسمبلی نے یہ ترمیم منظور کر لی۔ اس ترمیم کا بنیادی مقصد صدر مملکت کے اختیارات میں اضافہ کرنا تھا۔ نیز جنرل صاحب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے جتنے بھی اقدامات کیے تھے، اس ترمیم کے تحت ان سب کو آئینی تحفظ دے دیا گیا۔ اس ترمیم کی رو سے آئین کی 19 دفعات میں تبدیلیاں کی گئیں۔

تاہم اس ترمیم کے دفعہ 58اابی کا اثر آئندہ آنے والی سیاست پر بہت گہرا ہوا۔ اس کے تحت صدر مملکت کو یہ

اختیار مل گیا کہ جب وہ دیکھے کہ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ وفاق پاکستان کا نظم ونسق آئین کے مطابق نہیں چلایا جاسکتا تو وہ قومی اسمبلی توڑ سکتا ہے۔ قومی اسمبلی توڑنے کے بعد صدر اپنی صوابدید پر 90 دن کے اندر اندر نئے انتخابات کرائے گا۔ آٹھویں ترمیم کی منظوری سے پہلے وزیراعظم کا انتخاب قومی اسمبلی کرتی تھی۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ صدر قومی اسمبلی کے کسی بھی رُکن کو اپنی صوابدید پر بطور وزیراعظم ''نامزد'' کرے گا جو 60 دن کے اندر اندر ارکان اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لے گا۔

آٹھویں ترمیم کا پہلی بار استعمال 29 مئی 1988ء کو جونیجو حکومت اور قومی اسمبلی کو توڑ کر کیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے طیارے کے حادثے کے بعد عام انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی جماعت پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی تو وہ وزیراعظم بن گئیں۔ وزیراعظم بنتے کے فوراً بعد بے نظیر بھٹو اور صدر غلام اسحاق خان کی آپس میں ٹھن گئی۔ بالآخر 6 اگست 1990ء کو صدر غلام اسحاق خان نے بے نظیر پر بدعنوانی اور آئینی خلاف ورزیوں کے الزامات لگا کر اسے چلتا کیا جس کے بعد انتخابات کے نتیجے میں میاں محمد نواز شریف کو وزارت عظمیٰ ملی مگر صدر اسحاق کے ان کے ساتھ بھی اختلافات پیدا ہوئے اور اس وقت کی اپوزیشن لیڈر بے نظیر بھٹو نے صدر کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ چنانچہ ایک بار پھر آٹھویں ترمیم کی اس متنازعہ شق 58 (2بی) کو حرکت میں لایا گیا اور نواز شریف کی حکومت اور قومی اسمبلی 1993ء میں توڑ دی گئی۔ نواز شریف نے سپریم کورٹ سے رجوع کیا جس پر سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت بحال کر دی مگر صدر اور وزیراعظم کے باہمی تعلقات معمول پر نہ آ سکے، جس پر نہ صرف نواز شریف حکومت کو استعفیٰ دینا پڑا بلکہ صدر کو بھی مستعفی ہونا پڑا اور 58(2بی) کو ایک بار پھر حرکت میں لانا پڑا۔ دوبارہ انتخابات ہوئے تو بے نظیر بھٹو کو اقتدار مل گیا۔ جنہوں نے سردار فاروق لغاری کو صدر مملکت منتخب کر دیا' فاروق لغاری چونکہ پیپلز پارٹی کے سرگرم رکن رہ چکے تھے، اس لیے ملک بھر میں اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ اب پیپلز پارٹی کی حکومت اور اسمبلی پانچ سال پورے کرے گی کیونکہ صدر بھی اس کی اپنی پارٹی کا تھا مگر ؏ میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی کے مصداق 5 نومبر 1996ء کو صدر فاروق لغاری نے 58 (2بی) کا استعمال کیا اور اس طرح بے نظیر بھٹو کی حکومت کو کرپشن اور آئین کے خلاف ورزیوں کے الزام میں گھر بھیج دیا گیا۔ چاروں مرتبہ قومی اسمبلیوں کے ساتھ صوبائی اسمبلیاں بھی توڑی گئی تھیں جنرل محمد ضیاء الحق نے جب یہ ترمیم کی تھی تو دعویٰ کیا تھا کہ اس ترمیم کے نافذ العمل ہونے پر صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن قائم ہو جائے گا۔ مگر اس ترمیم نے بہتری کی بجائے ہمیشہ خرابیاں پیدا کیں۔

انتخابی مہم کے دوران پاکستان مسلم لیگ کے صدر میاں نواز شریف نے کہا تھا کہ برسراقتدار آنے کی صورت میں وہ آٹھویں ترمیم کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ فروری 1997ء کے عام انتخابات میں جب ان کی پارٹی نے نمایاں اکثریت حاصل کی۔ چنانچہ اپنے وعدے کے مطابق انہوں نے 31 مارچ 1997ء کو چاروں اسمبلیوں کی قاتل آئینی ترمیم ختم کرنے کا اعلان کیا۔

16 اپریل 1953ء کو گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی دفعہ 10 کے تحت منسوخ کر دیا اور محمد علی بوگرہ کو جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، نئی وزارت بنانے کی دعوت دی

بارھویں ترمیم

آئین کا (بارھواں ترمیمی) بل 1991ء حکومت کو گھناؤنے جرائم میں ملوث مجرموں پر مقدمہ چلانے اور بروقت انصاف فراہم کرنے کے لیے فوری ساعت کی عدالتوں کے قیام کے ضمن میں خصوصی اختیارات دینے کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں (قومی اسمبلی اور سینٹ) میں بھاری اکثریت سے 18 جولائی 1991ء کو منظور ہوا۔

ملک میں لاقانونیت کے خاتمے کے لیے حکومت نے جو اقدامات کیے وہ درج ذیل تھے:

1۔ حکومت نے دہشت گردی کا خاتمہ کرنے (فوری ساعت کی عدالتیں) ترمیمی بل 1991ء نافذ کیا۔ اغواء خصوصاً تاوان کی وصولیوں کے لیے سزائے موت کو رائج کیا گیا۔

2۔ مہلک ہتھیاروں کے بے پناہ پھیلاؤ نے صورت حال کو اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ اس کی طرف فوری توجہ مبذول کرنے کی ضرورت تھی۔ کلاشنکوف کلچر کے قلع قمع کرنے اور دہشت زدہ علاقوں میں امن بحال کرنے کے لیے ایک آرڈی نینس نافذ کیا، جو ناجائز ہتھیاروں سے دست برداری کا آرڈی نینس 1991ء کہلاتا ہے۔

3۔ بڑے شہروں بشمول اسلام آباد میں چوکیداری نظام کو پھر سے رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مزید برآں ایک اعلیٰ سطح ادارہ وفاقی کونسل تشکیل دی گئی تا کہ قومی تحفظ کے تمام پہلوؤں کی نگرانی کی جا سکے۔

تیرھویں ترمیم

آٹھویں ترمیم کے متنازعہ حصوں کو ختم کرنے کے لیے آئین میں تیرھویں ترمیم کی گئی جس کے تحت وفاقی کابینہ نے آئین کے آرٹیکل 58، 101، 112 اور 243 کی شقوں میں ترمیم کے متنازعہ حصوں کو ختم کرنے کے لیے صدر سے بھی ملاقات کی اور ان کی اجازت سے اسے ختم کرنے کا اعلان کیا۔

وفاقی کابینہ نے آئین میں ترمیم کے جس مسودے کی منظوری دی، اس کے تحت آئین کے آرٹیکل 58 (دو بی) کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ آئین کے اس آرٹیکل کے تحت صدر اپنے صوابدیدی اختیار کے تحت اسمبلی اور حکومت کو برطرف کر سکتا تھا۔ اس کے تحت صدر سے یہ اختیارات واپس لے لئے گئے۔ آئین کے آرٹیکل 101 کی کلاز (1) میں لفظ مشورے کی جگہ ''ایڈوائس'' کا اضافہ کیا گیا۔ اس کلاز کے تحت صدر مملکت وزیراعظم سے مشورے کے بعد صوبائی گورنروں کا تقرر کرتا تھا مگر اب صدر صرف وزیراعظم کی ''ایڈوائس'' پر گورنر مقرر کر سکے گا۔ آئین کے آرٹیکل 243 کی شق (2) کی ذیلی شق (سی) میں سے لفظ ''اپنی صوابدید پر'' ختم کر دیا گیا۔ آئین کے اس آرٹیکل 243 کی شق (2) کی ذیلی شق سی کے تحت صدر اپنی صوابدید پر چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف اور تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کا تقرر کرتا تھا۔ وفاقی کابینہ کی جانب سے اس شق میں ترمیم کر کے فوجی سربراہوں کے تقرر کا صوابدیدی اختیار صدر مملکت سے واپس لے لیا گیا۔ اسی طرح آئین کے آرٹیکل 112 کی کلاز (2) بی کو ختم کر دیا گیا۔ اس کلاز کے تحت اگر صوبائی حکومت کو آئین اور قانون کے مطابق چلانا ممکن نہ رہے تو گورنر رائے دہندگان سے رجوع کر سکتا ہے۔ قانونی ماہرین کے مطابق اب گورنر سے صوبائی اسمبلی توڑ کر دوبارہ الیکشن کرانے کا اختیار واپس لے لیا گیا ہے۔

پارلیمنٹ نے اس ترمیم کی منظوری یکم اپریل 1997ء کو دی۔ آئین میں تیرھویں ترمیم پر ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا گیا تھا۔ مثلاً:

1- آٹھویں ترمیم کے متنازعہ حصے کو ختم کرنے سے پارلیمنٹ کی بالادستی بحال ہوگئی ہے جس سے عوام کے اختیارات عوام کو واپس ہو گئے ہیں۔

2- تیرھویں ترمیم کے تحت پارلیمنٹ کا وقار بلند ہو گیا ہے اور جمہوریت کے خلاف سازشوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ نیز سیاسی افہام وتفہیم میں اضافہ ہو گیا ہے۔

3- تیرھویں ترمیم سے جمہوریت کوفروغ حاصل ہوگا اور جمہوری اداروں کو آزادانہ اپنا کام کرنے کا موقع ملے گا کیونکہ آٹھویں ترمیم کی موجودگی میں حکومت کے ہاتھ پاؤں بندھے رہتے۔

4- قبل ازیں خواہ مخواہ یہ ہوّا کھڑا کیا جاتا رہا کہ 58(2بی) نہ ہوتو مارشل لاء آ جائے گا۔ اب ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

5- آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے بعد صدر اور وزیراعظم کے اختیارات کے مابین قائم ہونے والا توازن ختم ہوگیا ہے۔ یہ شق مارشل لاء سے بچنے کا راستہ اور اس حوالے سے سیفٹی والو کا کام دیتی تھی لہٰذا اسے ختم نہیں کرنا چاہئے تھا۔

چودھویں ترمیم

اس ترمیم کا تعلق فلور کراسنگ سے تھا۔ وزیراعظم نے اپنے سابقہ دور سے سبق حاصل کرتے ہوئے کہ کہیں قومی اسمبلی کے ارکان ان کی جماعت کو چھوڑ کر دوسری بڑی جماعت پیپلز پارٹی میں نہ چلے جائیں اور اس کے نتیجے میں تنہا رہ جانے کی وجہ سے کہیں ان کا اقتدار نہ چھن جائے آئین میں یہ ترمیم کی۔

یہ بل قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا۔ 14ویں ترمیم عدالتوں کو کارروائی کا حق بھی نہیں دیتی تھی اور نہ ہی اس بل کے تحت اٹھائے گئے قدم کے بارے میں کوئی حکم جاری کرنے کی مجاز تھی۔ دونوں ایوانوں سے منظور ہونے کے بعد اور صدر کی رضا مندی سے آئین میں ایک نئے آرٹیکل 63اے کا اضافہ کر دیا گیا۔

چودھویں ترمیم نے سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے پر رکن کو اسمبلی سے باہر کرنے کے لامحدود اختیارات دے دیئے۔ اس کے خلاف کوئی اپیل نہ کی جاسکتی تھی۔

24اکتوبر 1997ء کو نوابزادہ نصراللہ خان نے 14ویں ترمیم کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا، جس کے نتیجے میں یہ ترمیم 30اکتوبر 1997ء کو معطل کر دی گئی۔

سترھویں ترمیم

10/اکتوبر 2002ء کو منعقد ہونے والے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل جنرل پرویز مشرف نے 21اگست اور 9اکتوبر 2002ء کو آئین میں 29 ترامیم کردیں۔ اُن کا موقف تھا کہ 14اکتوبر 1999ء کو ہنگامی حالت کے اجراء' عبوری آئینی حکم نمبر 1 مجریہ 1999ء اور سپریم کورٹ کے 12مئی 2000ء کے فیصلے کے مطابق اُنہیں یہ ترامیم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) مجریہ 21اگست 2002ء ابتدا ہی سے حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان زبردست نزاع کا سبب بن گیا۔ جس کے ذریعے آئین میں دوررس ترامیم کی گئیں۔ متحدہ مجلس عمل اور اے آر ڈی کا متفقہ موقف تھا کہ ایل ایف او آئین کا حصہ نہیں۔ یہ ترامیم کرنے کا چیف ایگزیکٹو کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ ہم اُسی آئین کے پابند ہیں جیسا کہ وہ 12اکتوبر 1999ء کو تھا جب فوج نے چوتھی بار اقتدار پر قبضہ کیا۔ یہی موقف سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کی بارایسوسی ایشن اور پوری وکلاء برادری کا تھا۔

دو سال کی مسلسل کشمکش' طویل ملاقاتوں اور مذاکرات کے نتیجے میں بالآخر 24دسمبر 2003ء کو حکومتی جماعت کے چودھری شجاعت حسین' جناب ایس ایم ظفر ایڈووکیٹ اور متحدہ مجلس عمل کے مولانا فضل الرحمٰن، جناب لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد نے آئینی ترامیم سے متعلق ایک معاہدہ کیا' جس کی بنیاد پر 30اگست 2003ء کو قومی اسمبلی نے دوتہائی اکثریت سے سترھویں ترمیم کی منظوری دی۔ اس ترمیم کے ذریعے نہ صرف جنرل پرویز مشرف کے تین سالہ دورِ اقتدار کے اقدامات کو تحفظ فراہم کیا گیا' بلکہ چند معمولی ترامیم کے ساتھ ایل ایف او کو بھی آئین کا حصہ بنا دیا گیا' جس کے تحت جنرل پرویز مشرف نہ صرف مزید ایک سال (31دسمبر 2004ء) تک وردی میں' اور مزید تین سال تک (31دسمبر 2006ء) وردی کے بغیر ملک کے صدر رہیں گے بلکہ اُنہیں قومی اسمبلی توڑنے کا اختیار ہوگا اور وہ وزیراعظم کی مشاورت سے فوجی سروسز کے چیف کا تقرر کریں گے۔ نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام اور ججوں کی مدتِ ملازمت کا اختیار بھی جنرل صاحب کو مل گیا۔

(لیکن جنرل صاحب نے 31دسمبر 2004ء کو وردی اتارنے کا وعدہ پورا نہیں کیا' اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جیتے جی کرسی صدارت سے کسی صورت بھی الگ ہونے کے لیے تیار نہیں)۔

.... انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی کے زیراہتمام ....

30 روزہ رہائشی کورس

قرآن اور ہم

آیئے! اس بار رمضان کا بابرکت مہینہ قرآنی تعلیمات کو سیکھنے کے لیے وقف کریں!

.... کورس کی خصوصیات ....

ان شاء اللہ! یہ کورس آپ کو درج ذیل مقاصد حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوگا:

(1) تعلق بالقرآن (2) روحانی ترقی (3) قواعد تجوید
(4) نظریاتی تربیت (5) فکری اصلاح (6) تعمیر سیرت

.... دیگر تفصیلات ....

☆ دورانیہ : 30دن (29 شعبان تا چاند رات)

☆ زرِتعاون بسلسلہ طعام وقیام: تین ہزار (3,000) روپے
(مستحق افراد کے لیے زرِتعاون میں گنجائش کی سہولت)

☆ داخلے کا طریقہ کار: آپ اپنا نام، عمر، تعلیم، فون نمبر، ای میل اور پتہ بذریعہ ڈاک، ای میل یا ٹیلیفون مندرجہ ذیل پتے پر 30/اگست 2007ء تک فراہم کردیں۔

محدود انتظامات کی وجہ سے داخلہ پہلے آیئے اور پہلے پایئے کی بنیاد پر دیا جائے گا۔

قرآن اکیڈمی DM-55' خیابانِ راحت، فیز 6، ڈیفنس، کراچی-75500، پاکستان

[زبیر اقبال] فون: 5340022-4 موبائل: 0334-3517275

ای میل: karachi@quranacademy.com ویب سائٹ: www.quranacademy.com

مزید تفصیلات مندرجہ بالا ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کریں

مختصر تاریخ: اسمبلی کی برطرفیاں

اقتدار و اختیار کی کشمکش کے تناظر میں
تاریخ پاکستان کا ایک تاریک باب

قیام پاکستان کے بعد ہماری قومی سیاست کو جس ابتری کا سامنا کرنا پڑا، اس کا بڑا سبب ملک کے لیے آئین کی تیاری میں ناکامی تھا۔ ظاہر ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ہمارے پاس کوئی آئین موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آزادی ہند کے ایکٹ 1947ء کے تحت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو بعض ترامیم کے بعد نوزائیدہ مملکت کے لیے عارضی طور پر آئین کے طور پر اختیار کرلیا گیا۔ متحدہ ہندوستان کے لیے جاری کیا گیا یہ فرسودہ ایکٹ ایک آزاد اور جدید ریاست کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ نئی مملکت کے لیے قومی امنگوں پر مبنی آئین کی تیاری کے لیے نئی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ یہ اجلاس 10 اگست 1947ء کو یعنی اعلان آزادی سے چار روز قبل منعقد ہوا۔ اسمبلی کو آئین کے ساتھ ساتھ عبوری دور میں ملک کی وفاقی پارلیمنٹ کے طور پر کام کرنے کا فریضہ بھی سونپا گیا تھا تاکہ آئین سازی کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی قوانین بنائے جاسکیں۔ اس طرح ایک ہی اسمبلی آئین ساز اور قانون ساز اسمبلی کے طور پر کام کرتی رہی۔

آزادی کا پہلا برس مہاجرین کی بحالی اور انتظامی ڈھانچے کی تشکیل جیسے مسائل کی نذر ہوگیا۔ اس کے بعد 11 ستمبر 1948ء کو بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح قوم کو داغ مفارقت دے گئے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد آئین سازی کی ذمہ داریاں لیاقت علی خان کے کندھوں پر آپڑیں۔

آئین سازی کے دوران نظریات کے تصادم، مفادات کے ٹکراؤ اور بعض اوقات لسانی اور گروہی سوالات کا سر اٹھانا ایک فطری امر ہوتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کے دساتیر کی تاریخ بھی اسی صورت حال سے مستثنیٰ نہیں رہی۔ تاہم پاکستان میں دستور سازی کے کام نے جتنا طویل وقت لیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پاکستان میں آئین سازی کی راہ میں متعدد عوامل مختلف النوع اور خاصے پیچیدہ مسائل حائل ہوتے رہے، جن میں سے درج ذیل عوامل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

1۔ آئین میں اسلام کے کردار کا تعین
2۔ ملک کی جغرافیائی تقسیم اور وفاقی پارلیمنٹ میں نمائندگی کا مسئلہ۔
3۔ وفاقی حکومت اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم
4۔ زبان کا مسئلہ
5۔ انتظامیہ اور پارلیمنٹ میں تعلق، یعنی یہ کہ پاکستان کو پارلیمانی نظام اختیار کرنا چاہیے یا صدارتی
6۔ صوبائی اور گروہی اختلافات

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی

16 اپریل 1953ء کو گورنر جنرل ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کردیا، حالانکہ انھیں اسمبلی کا اعتماد حاصل تھا اور انھوں نے چند ہی روز قبل اسمبلی سے بجٹ پاس کروایا تھا۔ یہ ایک طرح سے آئینی انقلاب (Coup) تھا، جس کے پاکستان کی تاریخ پر خطرناک اثرات مرتب ہوئے۔

گورنر جنرل غلام محمد نے 17 اپریل 1953ء کو خواجہ ناظم الدین کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے برطرف کیا تو اُن کے بنیادی دلائل یہ تھے:

1۔ انہوں نے جتنی پالیسیاں بنائیں، وہ سب کی سب غلط تھیں اور اس کی وجہ سے ملک میں سیاسی انتشار اور لاقانونیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔
2۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام کی بھاری اکثریت نے اتفاق نہ کیا اور ملک میں افراتفری کا بازار گرم رہا۔
3۔ مشرقی پاکستان کے لوگ مسلم لیگ کی پالیسی سے نفرت کرنے لگے تھے۔
4۔ مغربی پاکستان میں اینٹی قادیانی تحریک نے لاقانونیت اور بدامنی کا موقع دیا اور خواجہ صاحب حالات پر قابو نہ پاسکے اور مارشل لا لگانا پڑا۔
5۔ ملک اقتصادی مشکلات، خوراک کی سخت قلت سے دوچار ہوگیا تھا اور حکومت نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہ کی۔
6۔ افسروں کی بدعنوانی، بددیانتی، رشوت خوری اور سمگلنگ اپنے عروج کو پہنچ گئی، لیکن حکومت نے نوٹس نہیں لیا۔
7۔ مختلف صوبوں میں افراتفری کی صورت پیدا ہوگئی، اُس کے سدِباب کے لیے کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے، کہ دونوں حضرات کے عہدہ سنبھالتے ہی اقتدار اور اختیارات کی کشمکش شروع ہو گئی تھی اور اس وقت تک رسہ کشی جاری رہی، جب تک غلام محمد نے خواجہ صاحب کی موٹر کار اور رہائش گاہ سے پاکستانی پرچم اور جھنڈی نہ اُتروالی، ٹیلیفون نہ کٹوا دیا اور اُن کو نظر بند نہ کردیا۔

خواجہ ناظم الدین کی جگہ محمد علی بوگرا کو بلا کر، جو اس وقت امریکہ میں پاکستانی سفیر تھے، وزیراعظم مقرر کردیا گیا اور یوں ملک کو بظاہر سیاسی جمود سے نجات حاصل ہوگئی، لیکن امر سے سفیر کو بلا کر وزیراعظم بنانے سے یہ تاثر ابھرا کہ گویا امر پاکستان کے اندرونی معاملات میں ملوث ہے۔

گورنر جنرل کی طرف سے خواجہ ناظم الدین برطرفی کے اقدام سے عوام کی حیرت اس وقت دو چند ہو جب مسلم لیگ کی اس پارلیمانی پارٹی نے، جس کے لی خواجہ ناظم الدین تھے، بغیر کسی پس و پیش کے محمد علی بوگر

وزیراعظم کی حیثیت سے قبول کر کے انھیں کمال خوش دلی سے اپنا لیڈر چن لیا۔ دراصل مسلم لیگ گورنر جنرل کے سامنے بے بس تھی اور اسی صورت حال نے ملک غلام محمد کی حوصلہ افزائی کی کہ اس نے ایک جمہوری وزیراعظم کو بلاوجہ برطرف کر دیا۔ بہر حال اکتوبر 1953ء یعنی اقتدار میں آنے کے بعد چھ ماہ سے بھی کم عرصے میں محمد علی بوگرا نے آئین ساز اسمبلی میں اپنا آئینی فارمولا پیش کیا۔ انھوں نے اس فارمولے کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ ملک کے دونوں حصوں کے نمائندوں کے لیے قابل قبول ہے۔

محمد علی بوگرا کے فارمولے کو ملک بھر میں تقریباً تمام مکاتب فکر اور حلقوں کی جانب سے سراہا گیا۔ عام تاثر یہ تھا کہ ان تجاویز کے ذریعے ملک کے دونوں حصوں میں یکجہتی اور تعاون کو فروغ حاصل ہوگا اور مرکز گریز رجحانات کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

اسمبلی کی برطرفی

آئین ساز اسمبلی نے ان تجاویز پر اکتوبر کے دوران 13 روز تک اس کے بعد 14 نومبر 1953ء کو غور کیا۔ اسمبلی کے توثیق شدہ شعبوں کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے ایک مسودہ کمیٹی تشکیل دی۔ اس مقصد کے لیے عالمی شہرت کے حامل آئینی ماہر آئیور جیننگز کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ ابھی یہ کام جاری تھا کہ ملک غلام محمد نے 24 اکتوبر 1954ء کو آئین ساز اسمبلی ہی کو برطرف کر دیا۔

گورنر جنرل ملک محمد نے آئین ساز اسمبلی کو برطرف کرنے کے بعد محمد علی بوگرا ہی کو نئی کابینہ بنانے کی دوبارہ دعوت دی۔ اس کابینہ میں بعض نئے وزراء مثلاً جنرل محمد ایوب خان، میجر جنرل سکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب شامل تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی کمانڈر ان چیف کو کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس طرح سیاست میں فوج کے لیے راہ ہموار کر دی گئی اور شیر کے منہ کو خون لگا دیا گیا، جس کی چاٹ اور چسکے نے بعد ازاں وہ گل کھلائے کہ قوم کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

پاکستان میں آئین کے ارتقاء کی داستان اس تاریخی واقعے کے اسباب کے تذکرے کے بغیر مکمل نہ ہوگی، کیونکہ یہ واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسا دھماکہ تھا جس نے پاکستان میں، جمہوری اداروں اور آئین سازی کی عمارت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ایک سرکاری ملازم کے ہاتھوں منتخب اسمبلی کی برطرفی ایسا اقدام تھا، جس کی سزا قوم کو مدتوں بھگتنی پڑی۔ اگر غلام محمد اپنی مجروح انا کی تسکین کے لیے اتنا بڑا اقدام نہ کرتا تو ملک و قوم کو جلد آئین میسر آ جاتا اور پاکستان ان سیاسی آفات سے بچ جاتا جن کا بعد ازاں اسے سامنا کرنا پڑا۔

اسمبلی برطرفی کے مقدمے میں سپریم کورٹ نے گورنر کے اقدام کو درست قرار دیا۔ چیف جسٹس منیر نے قرار دیا: "وہ واحد بنیاد جس پر غیر قانونی امور کو قانونی قرار دیا جا سکتا ہے وہ حالات کا تقاضا یا ضرورت ہے..... گورنر جنرل نے ایک فوری تباہی کو روکنے کے لیے ریاست اور معاشرے کو سقوط سے بچانے کے لیے یہ عمل کیا

نظریۂ ضرورت کی ابتدا

برطرف کی جانے والی دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین خان نے گورنر جنرل کے اس اقدام کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ انہوں نے اپنی درخواست میں موقف اختیار کیا کہ آزادی ہند ایکٹ مجریہ 1947ء کی دفعہ 6 کی ذیلی دفعہ 3 کی رُو سے قانون سازی کے لیے گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت نہیں۔ مولوی تمیز الدین نے برطانیہ کے ایک وکیل مسٹر ڈی این پرٹ کو بھی اپنی معاونت کے لیے بلایا۔ چیف کورٹ آف سندھ کے فل بنچ نے مقدمے کی سماعت کی اور متفقہ طور پر گورنر جنرل کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ فل بنچ نے اپنے فیصلے میں لکھا:

''دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اور یہ کہ اسے اُس وقت تک نہیں توڑا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ مقصد، جس کے لیے اسمبلی وجود میں آئی تھی، حاصل نہ کر لیا جائے۔''

چیف کورٹ آف سندھ کے فل بنچ کے فیصلے کے خلاف وفاق پاکستان نے فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی، جس نے طویل سماعت کے بعد گورنر جنرل کے اقدام کو درست قرار دیتے ہوئے اُس کی حمایت میں فیصلہ دیا۔ چیف جسٹس منیر نے قرار دیا: ''وہ واحد بنیاد جس پر غیر قانونی امور کو قانونی قرار دیا جا سکتا ہے، وہ حالات کا تقاضا یا ضرورت ہے..... گورنر جنرل نے ایک فوری تباہی کو روکنے کے لیے ریاست اور معاشرے کو سقوط سے بچانے کے لیے یہ عمل کیا۔'' جسٹس منیر نے قرار دیا: ''یہ امر واضح ہے کہ آزادیٔ ہند ایکٹ مجریہ 1947ء اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی رُو سے پاکستان کو جو عبوری آئین ملا، دستور ساز اسمبلی کو ایک قانون کے ذریعے اُسے عبوری آئین میں تبدیل کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ لہٰذا یہ استدلال بے معنی ہیں کہ دستور ساز اسمبلی کو غیر معینہ مدت تک فرائض انجام دینے کا اختیار مل گیا ہے۔ اس ادارے کو مستقل حیثیت حاصل نہیں اور وہ قابلِ تحلیل ہے۔ آزادی ایکٹ کی دفعہ 8 کی ذیلی دفعہ (i) کے تحت دستور ساز اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایکٹ کی رُو سے عائد ہونے والے فرائض انجام دے۔ اِس ایکٹ میں اسمبلی کو مستقل اور دائمی حیثیت نہیں دی گئی۔ گورنر جنرل کو جب یہ یقین ہو گیا کہ دستور ساز اسمبلی ملک کو دستور دینے میں ناکام ہو گئی ہے تو اسمبلی توڑنے کا اختیار، جو اِس سے پہلے التوا میں رکھا گیا تھا، دوبارہ موثر ہو گیا۔ آزادی ایکٹ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ دستور ساز اسمبلی، دستور کی تیاری کی آڑ میں ریاست کی مقننہ کے طور پر، غیر معینہ عرصے کے لیے فرائض انجام دیتی رہے، یہاں تک کہ اُسے انقلاب کے ذریعے ہٹانا ضروری ہو جائے۔

وفاقی عدالت سے فیصلہ لینے کے بعد 23 جون 1955ء کو دوسری دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ یہ انتخاب بالواسطہ تھا۔ یعنی اِس کے ارکان صوبائی اسمبلیوں سے لئے گئے تھے۔ نئے ایوان میں کسی جماعت کو اکثریت حاصل نہیں تھی، چنانچہ اس صورت حال نے سیاست میں عدم استحکام کے بیج بو دیئے اور یہاں سے سیاست میں کئی امراض کا آغاز ہوا۔ چونکہ کوئی گروہ بھی اکثریت میں نہیں تھا، اس لیے نئی کابینہ کے لیے اتحاد اور معاہدے ناگزیر تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ کے تعاون سے نئی مخلوط کابینہ تشکیل دی گئی جس کے سربراہ چوہدری محمد علی تھے۔ محمد علی بوگرا سفیر کا عہدہ سنبھالنے کے لیے پھر واپس امریکا چلے گئے۔

چوہدری محمد علی نے پورے خلوص نیت اور لگن سے کام کرتے ہوئے آئین سازی کو اولین ترجیح دی۔ ان کا تیار کردہ مسودہ آئین 8 جنوری 1956ء کو آئین ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اسمبلی نے 29 فروری کو اسے حتمی منظوری دے دی اور 2 مارچ 1956ء کو گورنر جنرل نے اس کی توثیق کر دی۔ 23 مارچ کو پاکستان کے بانی اور عوام کی خواہشات کے مطابق یوم ''یوم اسلامی جمہوریہ'' قرار دے دیا گیا۔ اس طرح آئینی انتشار اور مایوسی کا ایک دور وقتی طور پر ہی سہی، اپنے اختتام کو پہنچا۔ 1956ء کے آئین کا مقصد پاکستان میں اسلامی اصولوں پر مبنی ایک وفاقی اور پارلیمانی حکومت قائم کرنا تھا۔ یہ پاکستان کا پہلا مکمل آئین تھا۔

23 مارچ 1956ء کو آئین کی منظوری پر عوام نے غیر معمولی مسرت اور جوش وخروش کا اظہار کیا، مگر سیاست کے انداز اور اہل سیاست کے طرز عمل سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ غیر یقینی صورت حال اور سیاسی عدم استحکام ملک کا مقدر بن چکا ہے۔ اگرچہ 1956ء کے آئین کے نفاذ کے فوری بعد پاکستان کی پہلی قومی اسمبلی کے سامنے دیگر مسائل کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ نئے دستور کے مطابق پاکستان کے پہلے قومی انتخابات کرائے جائیں۔ اس وقت کا ایک خاص اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں ری، پبلکن پارٹی بن چکی تھی جو نئے گورنر جنرل سکندر مرزا کے دماغ کی اختراع تھی اور جو سازش اور جوڑ توڑ کا بادشاہ تھا۔ وزیر اعظم چوہدری محمد علی شریف آدمی تھے۔ دستور کے مطابق نئے انتخابات سے قاصر رہے اور محلاتی سازشوں سے مایوس ہو کر 8 ستمبر 1956ء کو وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے۔

ون یونٹ کے قیام کے بعد ری پبلکن پارٹی مغربی پاکستان اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں مغربی پاکستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس پارٹی کو عوامی حمایت حاصل نہیں تھی اور نہ ہی وہ عام انتخابات میں مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتی تھی، کیونکہ یہ پارٹی سکندر مرزا کے ایماء پر محلاتی سازشوں کے نتیجے میں بنی تھی، چنانچہ عوامی سطح پر اس کی کوئی سیاسی بنیاد موجود نہیں تھی۔ سیاسی جوڑ توڑ اور مختلف ترغیبات کے ذریعے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے متعدد نمائندوں کو ری پبلکن پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔ ایک طرح سے ری پبلکن پارٹی پاکستان کے سیاسی لیڈروں کے اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت تھی۔

ری پبلکن پارٹی سکندر مرزا کے ایماء پر محلاتی سازشوں کے نتیجے میں بنی تھی، مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے متعدد نمائندوں کو اس پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔ ایک طرح سے یہ پارٹی پاکستان کے سیاسی لیڈروں کے اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت تھی۔

حسین شہید سہر وردی کی سرکردگی میں ایک مخلوط وزارت قائم ہوئی۔ یہ بھی انتخابات کرانے میں ناکام رہے اور اکتوبر 1957ء تک صرف تین ماہ تک مسلم لیگ کی حکومت رہی۔ اس کے بعد ملکی سیاست میں جوڑ توڑ اور عدم استحکام کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ سیاست دانوں نے راتوں رات اپنی وفاداریاں تبدیل کرنا شروع کر دیں۔ فلور کراسنگ کا چلن اتنا عام ہو گیا کہ ہر نئی وزارت کچھ عرصے کے بعد عدم استحکام کا شکار ہو کر دم توڑ جاتی۔

1957ء میں اکتوبر تا دسمبر صرف تین ماہ آئی آئی چندریگر کی سربراہی میں مسلم لیگ کی حکومت رہی۔

دسمبر میں پھر ری پبلکن پارٹی نے ملک فیروز خان نون کی سربراہی میں اقتدار پر قبضہ کیا۔ سیاست کی اس غیر یقینی فضا نے ترقیاتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ امن عامہ کی صورتحال کو بھی متاثر کیا، کیونکہ ملکی قیادت عوام کے مسائل کی جانب توجہ دینے کی بجائے ہر وقت اپنی بقا کے چکر میں مبتلا رہتی۔ دوسری طرف ون یونٹ اور علاقائی خود مختاری کی حمایت میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ زور پکڑ گیا۔ الغرض قومی سیاست کی فضا پر جذبات پوری طرح غالب آ چکے تھے۔ ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ ان نازک حالات میں ملک میں کوئی بھی ہر دلعزیز، قابل اعتماد اور اعلیٰ قیادت موجود نہ تھی، جو صورت حال پر قابو پا سکتی اور ملک کو سیاسی بحران سے نکال سکتی۔

1958ء کا مارشل لاء

چنانچہ 8 اکتوبر 1958ء کو ملک فیروز خان نون کی وزارتِ عظمیٰ، ان کی کابینہ اور اسمبلی کو برطرف کر کے سکندر مرزا کی صدارت میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے جب کہ سکندر مرزا بدستور صدر پاکستان تھے۔ 27 اکتوبر 1958ء کو کمانڈر انچیف محمد ایوب خان نے ملک کی زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی اور سکندر مرزا کو نکال کر خود ہی صدر بن گئے۔

بظاہر سیاسی، غیر یقینی اور عدم استحکام کی بناء پر مارشل لاء لگایا گیا، کیونکہ کوئی حکومت بھی چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مارشل لاء لگانے کا کوئی جواز نہیں تھا اور جو کچھ ہوا، وہ سازش کا نتیجہ تھا۔ اوّل تو سیاسی عدم استحکام سکندر مرزا اور ان کے ساتھیوں نے جان بوجھ کر پیدا کیا تھا۔ دوم سیاسی عدم استحکام کا علاج مارشل لاء نہیں بلکہ عام انتخابات تھے، جنہیں بلا وجہ عرصے سے ملتوی کیا جا رہا تھا۔ اب انتخابات مارچ 1959ء میں ہونے والے تھے جن کے لیے سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اگر چند ماہ انتظار کر لیا جاتا تو انتخابات کے بعد سیاسی استحکام لازم تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ سکندر مرزا اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انتخابات کے بعد آنے والی حکومت اسے صدر منتخب نہیں کرے گی۔ چنانچہ سکندر مرزا نے مارشل لاء لگا کر اپنی بقا کا سامان کیا، لیکن جب اس نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایوب خان کے خلاف سازش کی تو فوج نے اسے چھٹی کروا دی۔ یوں ملک ایک چھوٹے سے سیاسی بحران سے مارشل لاء کے سمندر میں پھنس گیا۔ سول بیورو کریسی کی جگہ فوجی بیورو کریسی نے لے لی اور پاکستان کا جمہوری مستقبل ختم ہو کر رہ گیا۔ ایوب خان عام انتخابات کروا دیتے تو ان کا ملک وقوم پر احسان ہوتا، لیکن اقتدار کو آسانی سے کون چھوڑتا ہے۔

صدر ایوب نے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا۔ طویل غور وحوض کے بعد کمیشن نے 6 مئی 1961ء کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ میں ہر دلعزیز اور مخلص قیادت کے فقدان کو پارلیمانی نظام کی ناکامی کا باعث قرار دیا تھا۔ یہ بات کافی حد تک درست تھی، لیکن سوال یہ ہے کہ جب طویل عرصے تک انتخابات ہی نہ کروائے گئے تو ہر دلعزیز اور مخلص قیادت کہاں سے اور کیسے سامنے آتی۔

کمیشن کی رپورٹ کا کئی کمیٹیوں نے جائزہ لیا، جس کے بعد سفارشات کی روشنی میں صدر کی طرف سے نامزد کیے گئے افراد کے گروپ نے نیا آئین تیار کیا۔ آئین سازی کا فریضہ انجام دینے والے یہ افراد نہ تو منتخب نمائندے تھے اور نہ ہی انہیں عوامی حمایت حاصل تھی۔ خفیہ انداز میں تیار کیے جانے والے اس آئین کو عوام پر یک طرفہ تھوپ دیا گیا۔ جمہوری روایات کے برعکس آئین پر عوام کی رائے حاصل کرنے کے لیے کوئی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

گویا ایوب خان کا بنیادی جمہوریتوں والا 1962ء کا آئین پاکستانی عوام کو اوپر سے عطا کیا گیا تھا اور عوام کو اس پر رائے دینے کا اہل نہیں سمجھا گیا تھا، کیونکہ حکمران عوام کی اہلیت اور سمجھ بوجھ کے بارے میں شاکی تھے۔

صدر ایوب کے آئین اور غیر جمہوری پالیسوں کے خلاف عوام کے جذبات شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔ 1968ء کے اواخر میں احتجاجی مظاہروں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جمہوری حلقوں کی طرف سے پیش کیے جانے والے مطالبوں میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ 1962ء کا آئین منسوخ کر کے ملک میں صدارتی نظام کی بجائے پارلیمانی نظام بحال کیا جائے۔ چھوٹوں صوبوں کی طرف سے ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ بھی پوری شد ومد کے ساتھ کیا جانے لگا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں آئین میں دی گئی صوبائی خود مختاری اور قومی اسمبلی میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی دی جائے۔ مظاہروں کے نتیجے میں ملک کی سیاسی صورت حال

ابتری کا شکار ہوگئی اور بحران پر قابو پانے کے لیے کسی مصالحتی فارمولے کی تشکیل ممکن نہ رہی۔

یحییٰ خان کا مارشل لاء

بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ کے پیشِ نظر ایوب خان نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ اسمبلی کو برطرف کر دیا گیا۔ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور حکومت یحییٰ خان کے حوالے کر دی گئی۔ دوسری طرف سیاسی رہنماؤں میں مستقبل کے آئین کے بارے میں کوئی اتفاق رائے موجود نہیں تھا۔

دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یحییٰ خان نے عنانِ اقتدار پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دی۔

ضیاء الحق کا مارشل لاء

روز افزوں عوامی احتجاج، مسلسل ہنگاموں اور سیاسی جماعتوں کے نفاق سے فائدہ اٹھا کر فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے جولائی 1977ء میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ آئین میں فوجی حکومت یا مارشل لاء کی کہیں گنجائش موجود نہیں تھی۔ لہٰذا نصرت بھٹو نے آئین کی خلاف ورزی پر سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ سپریم کورٹ نے 10 نومبر 1977ء کے فیصلے میں مارشل لاء کے نفاذ کو ''نظریہ ضرورت'' کا تحفظ دیتے ہوئے ''موثر العمل'' قرار دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اٹارنی جنرل نے عدالت کو یقین دلایا کہ عام انتخابات آٹھ ماہ میں منعقد کر دیے جائیں گے۔ سپریم کورٹ نے اسے مارشل لاء حکومت کا وعدہ تصور کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا: ''عدالت کو توقع ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اپنے وعدوں کو پورا کریں گے''۔

گویا 1977ء میں مارشل لاء نے قوم کی ساری آئینی جدوجہد کی نفی کر دی اور ملک ایک بار پھر بے آئین ہو کر لاقانونیت کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ آئین بنانے کا مقصد ہی غیر آئینی قوتوں کی روک تھام ہوتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ چنانچہ ایک بار پھر قوم بنیادی حقوق، سیاسی آزادی اور اظہار کے حق سے محروم ہوگئی۔ مارشل لاء کے اس طویل دور میں جہاں سیاست دان کا ناطقہ بند رہا اور قید و بند کے بازار سجے رہے، وہاں مارشل لاء نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت سیاست دانوں اور جمہوری اداروں کی کردار کشی کی مہم جاری رکھی، تاکہ لوگوں کو جمہوریت سے بدظن کیا جاسکے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر انتخابات کے وعدے ہوتے رہے اور ٹوٹتے رہے۔ چنانچہ مارشل لاء کے جبر نے چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی کو جنم دے کر پاکستان میں صوبائیت کا زہر پھیلا دیا، جس سے ملک کی یک جہتی کو خطرات لاحق ہوگئے۔ 1983ء میں چلنے والی تحریک بحالیٔ جمہوریت (ایم۔آر۔ڈی) جہاں مارشل لاء کے خلاف ایک کھلی بغاوت تھی، وہاں پاکستان میں جمہوریت بحال کرنے کا عزم بھی تھی، لیکن اسے بھی کچل دیا گیا۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی اور پاکستان کو غیر مہذب ممالک کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔

1977ء سے لے کر 1983ء تک ملک کے تمام آئینی، سیاسی اور انتظامی اختیارات بلاشرکت غیرے جنرل ضیاء الحق کی ذات میں مرکوز رہے۔ انھوں نے 1982ء میں 350 اراکین پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ بھی قائم کی، مگر 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے فوراً بعد مجلسِ شوریٰ کو توڑ دیا گیا۔

صدر ضیاء الحق طویل عرصے تک تنہا ملک کے مقدر پر قابض رہے۔ بالآخر انتقال اقتدار کے لیے ان پر دباؤ بڑھنے لگا جو بہرحال ایک قدرتی بات تھی۔ مصنوعی نظام آخر کب تک چلتا۔ آخر سیاسی دباؤ نے صدر کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ اختیارات ایک منتخب حکومت کے سپرد کر دیے جائیں۔ انھوں نے ایک منصوبہ تجویز کیا، جس کے تحت جہاں ایک طرف تبدیلی کا عمل آئندہ ڈیڑھ سال سے بھی زیادہ عرصے پر محیط تھا وہاں اس کا منتہائے مقصود انتقال اقتدار کی بجائے اشتراک اقتدار تھا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 1973ء کے آئین میں بعض بنیادی تبدیلیاں تجویز کی گئیں۔ وہ ایک بادشاہ گر کی حیثیت سے اقتدار کے عمل پر اپنی گرفت بہر صورت مضبوط رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں انھوں نے یکم دسمبر 1984ء کو ریفرنڈم کا صدارتی حکم جاری کیا۔ اس ریفرنڈم میں عوام کے سامنے ایک دلچسپ سوال پیش کیا گیا۔ سوال کی عبارت کچھ یوں تھی:

''کیا آپ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے اس عمل کی تائید کرتے ہیں جو انھوں نے پاکستان کے قوانین کو قرآن حکیم اور سنت رسولؐ کے مطابق اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے لیے شروع کیا ہے اور آپ اس عمل کو جاری رکھنے، مزید استوار کرنے اور منظم اور پُر امن طریقے سے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کی حمایت کرتے ہیں''۔

سرکاری اعلان کے مطابق تقریباً 62 فیصد رائے دہندگان نے ریفرنڈم میں حصہ لیا تھا، جب کہ صحافیوں کے اندازے کے مطابق ریفرنڈم میں دس فی صد ووٹروں نے حق رائے دہی استعمال کیا تھا۔ ریفرنڈم کے نتیجے میں جنرل محمد ضیاء الحق سے صدر منتخب ہوگئے۔

اپنے مستقبل کو یقینی بنانے کے بعد صدر ضیاء الحق نے 25 فروری کو قومی اور 28 فروری 1985ء کو صوبائی انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ نو منتخب اسمبلیوں کے آغاز کار سے پہلے صدر نے ایک صدارتی حکم کے ذریعے 1973ء کے آئین کو بعض ترامیم کے ساتھ بحال کیا۔ ان ترامیم کا مقصد 1973ء کے آئین کے ڈھانچے میں تبدیلیاں لانا تھا۔ ان ترامیم کا جواز یہ دیا گیا کہ آئین کے مطابق صدر مملکت بالکل بے بس ہے، جبکہ سارے اختیارات وزیر اعظم کی ذات میں جمع ہوگئے ہیں، اس لیے دستور کو زیادہ قابل قبول اور حقیقت پسند بنانے کے لیے ضروری ہے کہ صدر مملکت اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کیا جائے۔ ان ترامیم کے ذریعے 1990ء تک وزیر اعظم نامزد کرنے کا اختیار صدر مملکت کے پاس رہا۔ نیز صدر مملکت کو اسمبلی کو برطرف کرنے کا بھی اختیار حاصل رہا، تاکہ وہ سنگین بحران کی صورت میں اس اختیار کے ذریعے اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کروا سکیں، تاکہ فوج کو دخل اندازی کرنے کا موقع نہ ملے۔ آئینی ترمیم کے مطابق صدر مملکت کو یہ اختیار صرف اس صورت میں استعمال کرنا تھا جب ملک کی وفاقی حکومت کے لیے آئین کے مطابق کام کرنا ممکن نہ رہا ہو اور رائے دہندگان سے رجوع ضروری ہوگیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ 29 مئی 1988ء کو جب صدر مملکت نے قومی اسمبلی برطرف کی اور محمد خان جونیجو کی حکومت برخاست کی تو کیا اس وقت واقعی اس اختیار کے استعمال کا جواز موجود تھا؟ ملک و قوم کو ایک گہرے بحران میں مبتلا کر دیا اور جمہوری عمل جو طویل عرصے کے بعد بحال ہوا تھا، اس کا راستہ بند کر دیا گیا۔

سکندر مرزا اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انتخابات کے بعد آنے والی حکومت اسے صدر منتخب نہیں کرے گی۔ چنانچہ مارشل لاء لگا کر اپنی بقا کا سامان کیا، لیکن جب اس نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایوب خان کے خلاف سازش کی تو فوج نے اسے چھٹی کروا دی

وزیراعظم محمد خاں جونیجو حکومت کی برطرفی

وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے دورہ چین سے واپسی کے فوراً بعد 29 مئی 1988ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے قومی اسمبلی اور وفاقی کابینہ کو توڑنے اور 90 دن میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کے آپریشن فیئر پلے کی طرح 29 مئی 1988ء کو آپریشن کلین اپ کا منصوبہ بھی انتہائی خفیہ رکھا اور آخر وقت تک کسی کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ صدر نے اپنے اس فیصلے کا اعلان پونے سات بجے آئین کے آرٹیکل 58 کی شق II بی کے تحت اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے کیا۔ ان کے چیف آف جنرل سٹاف سید رفاقت حسین کے سوا شاید ہی کسی کو علم ہو۔ اعلان کا مکمل متن یہ ہے:

چونکہ جن اغراض و مقاصد کے لیے قومی اسمبلی منتخب کی گئی تھی وہ پورے نہیں ہوئے، چونکہ ملک میں امن وامان کی صورتحال تشویشناک حد تک خراب ہوگئی ہے جس میں بے شمار قیمتی جانوں اور مال کا نقصان ہوا ہے اور چونکہ پاکستان کے شہریوں کی جان و مال اور عزت مکمل طور پر غیر محفوظ ہوگئی تھی اور پاکستان کی یکجہتی اور نظریہ کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا اور چونکہ اخلاق عامہ اس حد تک گر چکا تھا کہ جس کی مثال نہیں ملتی اور چونکہ میری رائے میں ایسی صورتحال پیدا ہوگئی تھی جس میں حکومت پاکستان آئین کے مطابق نہیں چل سکتی اور انتخابات ضروری ہوگئے تھے۔ اس لیے میں جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آرٹیکل 58 کی کلاز 2 بی کے تحت حاصل کردہ اختیارات کے تحت فوری طور پر قومی اسمبلی کو توڑتا ہوں جس کے نتیجے میں کابینہ بھی ٹوٹ گئی ہے۔

صدر مملکت نے یہ بھی کہا کہ ”یہ قدم ہمیں جمہوریت کی طرف لے جائے گا۔ تین سال میں نے بڑی گزارشات کیں۔ پارلیمنٹ سے بھی خطاب کیا کہ قوم کو اسلام کی طرف لائیے۔ اب میں یہ اقدامات کروں گا اور کوشش کروں گا کہ آئندہ اچھے لوگ منتخب ہو کر آئیں۔“

نگران حکومت کا قیام:

29 مئی 1988ء کو صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کی برطرفی کے موقع پر اعلان کیا کہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے وفاقی اور صوبائی سطح پر نگران حکومتیں قائم کی جائیں گی۔ چنانچہ اس کے تحت 9 جولائی 1988ء کو مرکز میں جناب اسلم خٹک کی قیادت میں نگران حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ انھیں سینئر وزیر کا مرتبہ دیا گیا تھا۔ پہلے مرحلے پر اٹھارہ ارکان پر مشتمل وزرائے نے حلف اٹھایا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے حلف لیا۔ اسی طرح صوبہ پنجاب میں میاں نواز شریف نے 30 مئی 1988ء کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ، 31 مئی کو سابق گورنر فضل حق نے سرحد کے نگران وزیر اعلیٰ، 10 جون 1988ء کو صوبہ سندھ میں اختر علی قاضی کو نگران وزیر اعلیٰ اور 24 جون 1988ء کو میر ظفر اللہ جمالی کو بلوچستان کا نگران وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

عام انتخابات کرانے کا اعلان:

20 جولائی 1988ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے انتخابات کے لئے 16 نومبر 1988ء کی تاریخ مقرر کرنے کا اعلان کیا۔ صدر نے آئینی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے الیکشن کمیشن کو ہدایت کی کہ وہ انتخابی حلقہ بندیوں کا جو کام آٹھ نو ماہ میں مکمل کرنا تھا اسے دو تین ماہ میں مکمل کرے...... صدر مملکت نے اگرچہ عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان تو کر دیا تھا تاہم انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ انتخابات جماعتی یا غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔

صدر نے اس موقع پر کہا کہ آئین کا تقاضا ہے کہ عام انتخابات اسمبلیاں توڑنے کے بعد جلد سے جلد کرائے جائیں۔ یہ میری خواہش تھی کہ نوے روز کے اندر انتخابات کا عمل مکمل کر لیا جاتا مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عملاً ایسا کرنا ممکن نہیں جس کی کئی ایک وجوہات ہیں مثلاً محرم کا پہلا عشرہ ماہ اگست کے حالات خراب کرنے کے مترادف ہوگا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگست برسات کا موسم ہے۔ اس بار تو باران رحمت ضرورت سے زیادہ ہو رہی ہے۔ اس وجہ سے اگست میں ہمارے ملک میں سیلاب کا زور ہوتا ہے یا سخت گرمی اور حبس ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اسی نوے ہزار پاکستانی حجاج حجاز مقدس گئے ہوئے ہیں ان کی واپسی میں بھی وقت لگے گا۔ ان کی اکثریت ووٹ ڈالنا چاہے گی۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو خود الیکشن کے امیدوار ہیں۔

وفاقی وزیر برائے انصاف و پارلیمانی امور مسٹر وسیم سجاد نے کہا انتخابی شیڈول کا اعلان انتخابات کی رو سے 38 روز قبل یعنی 9 اکتوبر کو کیا جائے گا۔

صدر ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو ہوائی حادثے میں جاں بحق ہوگئے اور ان کی جگہ غلام محمد اسحاق خان صدر بن گئے، جنھوں نے نومبر 1988ء میں انتخابات کروا کر حکومت بے نظیر بھٹو کی سربراہی میں منتخب نمائندوں کے حوالے کر دی۔

ایوب خان کا بنیادی جمہوریتوں والا 1962ء کا آئین پاکستانی عوام کو اوپر سے عطا کیا گیا تھا اور عوام کو اس پر رائے دینے کا اہل نہیں سمجھا گیا تھا، کیونکہ حکمران عوام کی اہلیت اور سمجھ بوجھ کے بارے میں شاکی تھے

بے نظیر بھٹو کے دور اوّل کی برطرفی

6 اگست 1990ء کو صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان نے قومی اسمبلی کو منسوخ کرنے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے علاوہ ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا اور متحدہ حزب اختلاف کے رہنما جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا۔ صدر نے بے نظیر بھٹو کی حکومت پر بدعنوانی اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال اور جمہوری روایات کو پامال کرنے کے الزامات لگائے نیز انھوں نے 24 اکتوبر 1990ء کو عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔

پاکستان جمہوری وطن پارٹی کے سربراہ نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ قومی اسمبلی کی برطرفی افسوس ناک ہے لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا۔ بے نظیر بھٹو پورے ملک کی وزیر اعظم بننے کی بجائے صرف پیپلز پارٹی کی وزیر اعظم بن کر رہ گئی تھیں۔

انھوں نے کہا کہ پاکستان میں جمہوری اقدار کو استحکام نصیب نہیں ہو سکا جب کہ غیر جمہوری اقدار اور مارشل لاء کی روایات مستحکم ہو چکی ہیں۔ پاکستان کے عوام کی قربانیوں کے نتیجہ میں جمہوریت آئی تھی لیکن اس سے عوام کی توقعات پوری نہیں ہو سکیں۔ پیپلز پارٹی نے قومی مفاہمت کی طرف توجہ دینے کی بجائے مختلف محاذ کھول دیئے۔ اللہ کرے کہ وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی مقررہ تاریخ پر منصفانہ انتخابات کرائیں۔ ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔ باقی معاملہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن اور برطرف وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کہا کہ صدر غلام اسحاق خان کی جانب سے قومی اسمبلی کو توڑنے کا اقدام سراسر غیر آئینی اور غیر قانونی ہے اور یہ آئینی کو ڈیٹا ہے۔

امور خارجہ کے سابق وزیر مملکت زین نورانی نے قومی اسمبلی توڑنے کے اقدام کو صدر کی آئینی ذمہ داری سے تعبیر کیا اور کہا کہ پیپلز پارٹی جس راہ پر چل رہی تھی اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ بے نظیر حکومت مکمل طور پر نا کام رہی تھی۔

جمعیت العلمائے اہل حدیث کے جنرل سیکرٹری قاضی عبدالقدیر خاموش نے کہا کہ موجودہ اسمبلیوں کو ان کی میعاد پوری کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اسمبلیاں توڑنے کا فیصلہ جمہوری عمل کو متاثر کرے گا۔ تاہم وفاقی وزراء کی بدعنوانی اور نااہلیت اسمبلیوں کی تحلیل کی بنیادی وجہ ہے۔

مزدور کسان پارٹی کے صدر فتح یاب علی خان نے کہا کہ ہر شخص کو ملک میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کو یقینی بنانا چاہیے، کیوں کہ عوام ہی خود مختار اتھارٹی ہیں۔

غلام مصطفیٰ جتوئی ایم آر ڈی کی جدوجہد میں ہراول دستے میں رہے اور انھوں نے امید ظاہر کی وہ ذاتی پسند یا ناپسند سے بالاتر ہو کر آزادانہ منصفانہ انتخابات کو یقینی بنائیں گے۔

سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے کہا صدر مملکت غلام اسحاق خان نے وفاقی حکومت اور اسمبلی کو برطرف کر کے ملک وقوم کی ایسی خدمت کی ہے جو ملک کی جمہوری تاریخ میں ایک روشن باب کے طور پر سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔ اسمبلی ہمارے مطالبے پر ٹوٹی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم بیان کرتے تھے کہ بے نظیر بھٹو اور ان کی جماعت نے ملک کو اس نہج پر پہنچا دیا تھا جہاں ملک کی سالمیت کو بھی شدید خطرات لاحق تھے۔ اب حالات ایسے تھے کہ ملک کی باگ ڈور پیپلز پارٹی کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ کرپشن انتہا کو تھی اور ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ جہاں تک صوبائی حکومت کا معاملہ ہے، صوبوں میں قانون نام کی کوئی شے باقی نہ رہی تھی۔ امن وامان ناپید تھا۔ جب میری حکومت کو غیر آئینی طور پر برطرف کیا گیا تھا تو اس وقت ملک کے حالات نارمل تھے اور اب افراتفری کا عالم تھا۔ صدر نے نئے انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر کے بھی ایک احسن قدم اٹھایا ہے۔ اب ہم عوام کے پاس نیا جمہوری مینڈیٹ لینے کے لیے انتخابات میں حصہ لیں گے اور انتخابات میں ملک کو بہتر قیادت ملے گی۔

جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر شاہ احمد نورانی نے کہا کہ پارلیمنٹ توڑ کر صدر اسحاق نے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ سابق وزراء نے جس طرح قومی دولت کو لوٹا ہے ان کا محاسبہ ہونا چاہیے۔ ملک تباہی کے راستے چل نکلا تھا۔ کشمیر اور افغانستان کے مسئلوں کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

صدر ضیاء الحق کے صاحبزادے اور مسلم لیگی رہنما اعجاز الحق نے کہا کہ صدر کے قومی اسمبلی کو توڑنے کا اقدام قابل تحسین ہے۔ سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایسے ٹریبونل قائم کیے جائیں جو سابق وزیراعظم اور ارکان قومی اسمبلی کی بے قاعدگیوں کی تحقیقات کریں۔

مہاجر قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے وفاقی حکومت کی برطرفی کے صدارتی اقدام کو قطعاً آئینی و جمہوری قرار دیا اور صدر مملکت اور نگران حکومتوں پر زور دیا کہ ملکی خزانے کو لوٹنے اور عوام کا قتل عام کرنے والوں کا سختی سے احتساب کریں۔ انھیں ملک سے فرار نہ ہونے دیا جائے اور ان کو ایسی کڑی سزائیں دی جائیں کہ آئندہ کسی کو اقتدار کے نشے میں عوام پر مظالم کرنے اور قومی دولت لوٹنے کی جرأت نہ ہو سکے۔

جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما پروفیسر عبدالغفور نے کہا کہ پیپلز پارٹی نے اقتدار میں آنے کے بعد منشور اور آئین کو نظر انداز کر دیا تھا۔ عام آدمی نے پیپلز پارٹی کی حکومت کے بیس ماہ کے دوران بڑا کڑا وقت گزارا۔ صدر کا اقدام موجودہ حالات میں غیر متوقع نہیں۔

سیاسی رہنما حمیدہ کھوڑو نے کہا کہ صدر مملکت کا یہ اقدام بروقت اور لائق ستائش ہے۔ انھوں نے صدر کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ سابق حکومت نے جمہوری عمل کو بدعنوانی اور نااہلیت سے بدنام کیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے دور میں سب سے زیادہ مصائب سندھ کے عوام نے جھیلے جنھیں نہ قصبات میں اور نہ ہی گاؤں میں تحفظ حاصل تھا۔ صوبے کی اقتصادیات بری طرح متاثر ہوئی۔ سندھ کے عوام نے تاریخ میں ایسا برا وقت کبھی نہیں دیکھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے سندھ کو تباہ کیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سندھ کے عوام حکومت کے ہاتھ مضبوط بنائیں تاکہ وہ تدبر اور حوصلے سے مسائل سے عہدہ برآ ہو سکے۔ جمعیت العلمائے اسلام کے سیکرٹری اطلاعات زاہد الراشدی نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کو شریعت کی مخالفت کرنے پر خدا کی طرف سے سزا ملی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر فخر الزمان نے کہا کہ کسی جواز کے بغیر قومی اسمبلی برخاست کرنے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت توڑنے کا فیصلہ قابل مذمت ہے۔

سابق اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کے اقدام کو باطل حکم اور بلا جواز قرار دیا۔

بی بی سی نے کہا کہ صدر غلام اسحاق کے بقول بے نظیر بھٹو کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں رہا تھا۔ تاہم بے نظیر کی حکومت مشکلات سے دوچار رہی۔ خصوصاً صوبہ سندھ میں انھیں زیادہ مشکلات درپیش رہیں۔ اپوزیشن نے 12 اگست 1990ء بروز اتوار کو وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی دوسری تحریک پیش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن صدر اسحاق نے اس سے پہلے قومی اسمبلی توڑ کر نئے الیکشن کا اعلان کر دیا۔ بی بی سی کے مبصر کے مطابق بے نظیر بھٹو کو شروع ہی سے اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک بااختیار صدر اور فوج کے درمیان توازن کی راہ کیوں کر اپنائی جائے کیوں کہ پاکستانی فوج برسوں تک اقتدار پر قابض رہی۔ گزشتہ نومبر میں بے نظیر بھٹو کو عدم اعتماد کی تحریک میں چند ووٹوں کی سبقت حاصل رہی۔ صدر نے اپنے اعلان میں بے نظیر حکومت پر اختیارات کے ناجائز استعمال، اقربا پروری اور بدعنوانی کے الزامات بھی عائد کیے۔ اس سے پہلے بے نظیر کے شوہر آصف زرداری پر بھی اس ضمن میں کڑی نکتہ چینی ہوتی رہی تھی۔ ایک اہم امر یہ بھی ہے کہ خود پیپلز پارٹی کے بعض اندرونی حلقے بھی حکومت کی کارکردگی پر تنقید کر رہے تھے اور یہ اطلاعات بھی تھیں کہ مصطفیٰ کھر اور مخدوم خلیق الزمان پارٹی کے اندر منحرف عناصر کو ملا کر نیا گروپ تشکیل دینا چاہتے تھے۔

بے نظیر کی برطرفی کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں۔ جن میں سندھ کا مسئلہ، کشمیر کی صورت حال اور شریعت بل بھی شامل ہیں۔ فوج اور صدر کو اس ضمن میں کافی خدشات لاحق ہو چکے تھے۔ سندھ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ حکومت نے نئی گڑبڑ کے بعد گزشتہ آٹھ ہفتے سے کوئی سیاسی قدم نہیں اٹھایا۔ سندھ میں لسانی تقسیم بڑھ رہی تھی کہ کشمیر کے بارے میں فوج کا خیال تھا کہ حکومت کو بھارت سے مذاکرات کے لیے کچھ وقت مل چکا ہے۔ اس لیے فوج اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر سندھ کی صورت حال کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتی تھی۔ شریعت بل کے بارے میں فوج کا یہ خیال تھا کہ اس وقت شریعت بل کے باعث مسلمانوں میں تقسیم ہو سکتی ہے ان وجوہات کی بنا پر بے نظیر بھٹو کے فوج اور صدر کے ساتھ کافی تعلقات خراب ہو چکے تھے اور ان تینوں کے درمیان باہمی مفاہمت کا امکان بھی ختم ہو چکا تھا۔ بی بی سی نے مزید بتایا کہ غلام مصطفیٰ جتوئی پر بھی

بے نظیر بھٹو کو شروع ہی سے اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک بااختیار صدر اور فوج کے درمیان توازن کی راہ کیوں کر اپنائی جائے کیوں کہ پاکستانی فوج برسوں تک اقتدار پر قابض رہی

اعتراض ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ گزشتہ انتخابات میں سندھ میں دونوں حلقوں سے ہار گئے تھے اور پھر مصطفیٰ کھر کے حلقہ میں ضمنی الیکشن میں غلام مصطفیٰ کھر کے اثر ورسوخ کے نتیجے میں کامیاب ہوئے۔

جمعیت العلمائے پاکستان (نیازی گروپ) کے سربراہ مولانا عبدالستار خان نیازی نے کہا کہ مرکز اور صوبوں میں محاذ آرائی نے ملک کو تباہی کے کنارے پر لاکھڑا کیا تھا۔ قومی اسمبلی کے سابق ارکان اور وفاقی وزراء کا احتساب ہونا چاہیے۔

پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ پروفیسر طاہر القادری نے کہا کہ پاکستان عوامی تحریک مڈٹرم الیکشن میں بھرپور حصہ لے گی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ انتخابات میں صوبائی انتظامیہ اور پولیس کی دخل اندازی کو روکا جائے اور انتخابات فوج کی نگرانی میں ہوں اور غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طریقے سے کرائے جائیں۔ انھوں نے صدر کی جانب سے وزیر اعظم کی برطرفی اور اسمبلیاں توڑنے کے حکم کا خیر مقدم کیا۔

امریکہ نے صدر غلام اسحاق خان کی طرف سے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کرنے اور نئے انتخابات کرانے کے اقدام کی حمایت کی اور کہا کہ ہم پاکستان میں ہمیشہ جمہوریت کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ صدر اسحاق کے اس اقدام کی بھی حمایت کرتے ہیں جو پاکستان میں جمہوری روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آئینی دفعات کے مطابق کیا گیا۔

امریکہ اس اقدام کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر رہا ہے۔ ہم صورت حال کا بغور جائزہ لے رہے ہیں۔ ادھر امریکہ کے ذرائع ابلاغ نے پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کی خبر کو انتہائی اہم خبر کے طور پر نشر کیا۔ حالانکہ ان دنوں امریکی ذرائع ابلاغ کی سب سے بڑی خبر عراق کویت صورت حال سے متعلق تھی۔

میاں نواز شریف کی پہلی برطرفی

8 جنوری 1993ء کو جب سابق چیف آف آرمی سٹاف مسٹر آصف نواز دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے تو چیف آف آرمی سٹاف کے تقرر کے مسئلے پر صدر اور وزیر اعظم کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ جس جنرل کو صدر نے نامزد کیا اس سے نواز شریف نے اختلاف کیا۔ تاہم بعد ازاں 12 جنوری 1993ء کو وحید کاکڑ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیا گیا۔ صدر نے صوبوں میں پانی کی تقسیم اور دیگر امور کے بارے میں وزیر اعظم کو ایک سو سے زائد خطوط تحریر کیے۔ لیکن وزیر اعظم نے ان خطوط پر کوئی غور وحوض نہ کیا۔ چونکہ غلام اسحاق خان کی صدر کے عہدے پر پانچ سال کی مدت پوری ہونے والی تھی اس لیے سردار فاروق احمد خان لغاری اور فیصل صالح حیات نے صدر تک یہ پیغام پہنچایا کہ اگر وہ اسمبلی توڑ دیں تو وہ انھیں اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیں گے۔ 24 جنوری کو نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کی چار جماعتوں نے بھی صدارتی انتخاب میں صدر کی حمایت کا اعلان کیا۔ 30 فروری 1993ء کو مسلم لیگ نے وزیر اعظم نواز شریف کو آٹھویں ترمیم کے خاتمے اور صدارتی امیدوار کی نامزدگی کے اختیار دے دیئے۔ چنانچہ یکم مارچ 1993ء کو حکومت اور پی ڈی اے کے مابین آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے لیے مذاکرات شروع ہوئے۔ 11 مارچ کو حکومت نے آٹھویں ترمیم میں ردوبدل کا مسودہ تیارہ کر لیا تو صدر کو بھی اس کا علم ہو گیا۔

غلام اسحاق خان کی صدر کے عہدے پر پانچ سال کی مدت پوری ہونے والی تھی۔ اس لیے سردار فاروق احمد خان لغاری اور فیصل صالح حیات نے صدر تک یہ پیغام پہنچایا کہ اگر وہ اسمبلی توڑ دیں تو وہ انھیں اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیں گے

جس کے نتیجے میں صدر غلام اسحاق، وزیر اعظم نواز شریف کے خلاف ہو گئے۔ عوام میں بھی صدر اور وزیر اعظم کے مابین اختلاف کی چہ گوئیاں ہونے لگیں۔ اسی بنا پر وزیر اعظم کو 15 مارچ کو یہ کہنا پڑا کہ ان کا صدر سے کوئی اختلاف نہیں۔ 16 مارچ کو صدارتی کیمپ سرگرم عمل ہو گیا اور اس نے صدر کو اسمبلیاں توڑنے اور وزیر اعظم کو برطرف کرنے کا مشورہ دیا۔ مارچ 1993ء میں مسلم لیگ کے صدر محمد خان جونیجو کا انتقال ہو گیا تو مسلم لیگ کے صدر کا عہدہ خالی ہو گیا۔ میاں نواز شریف کے علاوہ حامد ناصر چٹھہ بھی مسلم لیگ کا صدر بننا چاہتے تھے۔ تاہم 27 مارچ کو نواز شریف کو جب مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا تو حامد ناصر چٹھہ اور ان کے حامیوں نے صدر سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور صدر کو اسمبلیاں توڑنے اور نواز شریف کی حکومت کو برطرف کرنے کی نہ صرف مشورہ دیتے رہے بلکہ اپنے مکمل تعاون کا یقین بھی دلاتے رہے۔ ادھر پیپلز پارٹی کے فاروق لغاری، فیصل صالح حیات، صاحبزادہ سلطان اور آفتاب شعبان میرانی نے بھی صدر سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ مولانا کوثر نیازی، غلام مصطفیٰ جتوئی، محمود اے ہارون، رونیداد خان، بلخ شیر مزاری اور زاہد سرفراز صدر اور پیپلز پارٹی میں رابطوں کا باعث بنے رہے۔ جب یہ سلسلہ طول پکڑ گیا تو مسلم لیگ نے الٰہی بخش سومرو کے ذریعے صدر کو یہ پیغام بھجوایا کہ مسلم لیگ بھی انھیں صدارتی امیدوار بنانے پر رضا مند ہے۔ تاہم مسلم لیگ کا یہ اقدام بھی صدر اور وزیر اعظم کے مابین اختلاف کو ختم کرنے کا ذریعہ نہ بن سکا۔

28 مارچ 1993ء کو حامد ناصر چٹھہ، انور سیف اللہ اور اسد جونیجو وفاقی کابینہ سے مستعفی ہو گئے۔ یکم اپریل 1993ء کو بے نظیر بھٹو نے سیاسی حربے کے طور پر وزیر اعظم کو یہ پیغام بھیجا کہ آٹھویں ترمیم کے مکمل خاتمے کے لیے مسلم لیگ سے تعاون ہو سکتا ہے۔ 4 اپریل کو صدر کو مسلم لیگ کا صدارتی امیدوار نامزد کر دیا گیا۔ اس دوران وزیر اعظم نے صدر سے دوبارہ ملاقات کی اور 7 اپریل کی ملاقات میں بتایا گیا کہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں ہیں۔ لیکن اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور صدر مکمل طور پر وزیر اعظم کے سیاسی مخالفین کے نرغے میں آ چکے تھے اور وہ ہر قیمت پر وزیر اعظم کو برطرف کرانے کے لیے ڈٹ گئے تھے۔ 9 اپریل کو حکومت سے ناراض ارکان نے صدر سے ملاقات کی اور 24 ارکان اسمبلی کے استعفے صدر کو پیش کر دیئے اور انھیں اسمبلیاں توڑنے کا مشورہ دیا گیا۔ اسی روز چوہدری شجاعت حسین نے بھی صدر سے ملاقات کی اور مصالحت کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ صدر ہمارے بزرگ ہیں، ان سے ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وزیر اعظم کو صدر سے مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حالانکہ 65 ارکان اسمبلی نے وزیر اعظم کو اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا۔

10 اپریل کو وفاقی وزیر میر ہزار خان بجارانی اور 12 اپریل کو جام معشوق علی اور رونیداد خاں نے بھی استعفیٰ دے دیا۔

17 اپریل 1993ء کو وزیر اعظم نے قوم کے نام اپنے خطاب میں کہا کہ میں استعفیٰ نہیں دوں گا۔ اسمبلیاں نہیں توڑوں گا اور ڈکٹیشن نہیں لوں گا۔ مگر 18 اپریل کو صدر نے اسمبلی توڑ دی، اور نواز شریف کو برطرف کر دیا

صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقتدار کی ہوس میں ملک کے بہترین مفادات کو داؤ پر لگانے والے مہلت اور وارننگ ملنے کے باوجود تباہ کن روش سے ہٹنے پر تیار نہیں ہوئے۔ میں مزید خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا کرتا تو حلف اور آئین سے انحراف کا مرتکب ہوتا۔ صوبے مرکز کی چودھراہٹ کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے تھے۔

سابق وزیراعظم چھوٹے چھوٹے معاملات میں خود مداخلت کرتے اور انتظامی مشینری کو مفلوج کر دیا گیا تھا۔ اقتصادی پالیسیاں ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی تھیں۔ موٹروے ایک متنازعہ منصوبہ تھا۔ اخبارات پر بغاوت کے مقدمے قائم ہوئے۔ صحافیوں کو زدوکوب کرنا معمول بن گیا۔ پریس کو زنجیریں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ سابق وزیراعظم نے اپنی تقریر میں فیڈریشن کے آئینی سربراہ پر الزام تراشا اور دشنام طرازی کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔

قومی اسمبلی توڑنے کے سلسلے میں ردعمل

اندرون اور بیرون ملک ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ مثلاً

1۔ بھارت نے صدر غلام اسحاق خان کی جانب سے حکومت کی سبکدوشی کے فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا اور تشویش ظاہر کی کہ اس اقدام سے دونوں ملکوں کے پہلے بگڑے ہوئے تعلقات مزید خراب ہو جائیں گے۔ ایک جمہوری ملک ہونے کے ناطے بھارت پاکستان میں جمہوریت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے۔

2۔ وائس آف امریکہ نے کہا کہ حکومت کی برطرفی کی وجہ

ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے کہا کہ اسمبلی کو توڑنے کی ذمہ دار بے نظیر بھٹو ہیں۔ بے نظیر نے صدر اسحاق سے ملاقات کر کے جمہوریت کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اور آمریت کا ساتھ دیا ہے

صدر کے اختیارات کو چیلنج کرنا ہے۔ دوسری وجہ ذاتی انا ہے کہ انھوں نے (وزیراعظم) ٹیلی ویژن پر صدر کے خلاف تنقید کی۔ بے نظیر نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ حکومت میں پیپلز پارٹی کی شمولیت اور بے نظیر کی صدر سے ملاقات کو کسی نے نہیں سراہا۔ کارکنوں میں بے اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے۔

3۔ تحریک استقلال کے صدر ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے کہا کہ اسمبلی کو توڑنے کی ذمہ دار بے نظیر بھٹو ہیں۔ بے نظیر نے صدر اسحاق سے ملاقات کر کے جمہوریت کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اور آمریت کا ساتھ دیا ہے۔

4۔ پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری نے کہا کہ صدر نے عوام کے دل جیت لیے ہیں۔ صدر کے اس دلیرانہ اقدام کو پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے فرعونی آمریت سے نجات دلائی۔ احتساب ضروری ہے۔

5۔ مرکزی جمعیت اہلحدیث کے سربراہ پروفیسر ساجد میر نے کہا کہ صدر نے منتخب حکومت برطرف کر کے ملک کو لادینی اور سیکولر قوتوں کے حوالے کر دیا ہے۔ صدر اسحاق خان نے تاریخ کی بدترین ہارس ٹریڈنگ کی ہے اور جس حکومت کے پاس اکثریت تھی، اسے برطرف کر کے غیر نمائندہ افراد کو حکومت دینا بھی صدر اسحاق کا اخلاقی اور سیاسی جرم ہے۔ صدر اسحاق کو بہت جلد اپنے آمرانہ فیصلوں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

6۔ سپاہ صحابہ پاکستان کے سربراہ علامہ ضیاء الدین فاروقی نے کہا کہ صدر نے اسمبلیاں توڑ کر اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کی ہیں اور ہم ان کے اس اقدام کی حمایت کرتے ہیں۔

7۔ جماعت اہلحدیث کے سربراہ مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی نے کہا کہ صدر اسحاق نے قومی اسمبلی توڑ کر منتخب نمائندوں اور عوام کے جذبات کی توہین کی ہے۔ اگر صدر نے پیپلز پارٹی کو چور دروازے سے اقتدار میں لانے کی کوشش کی تو ہم بھرپور مخالفت کریں گے۔ پاکستان میں عورت کی حکمرانی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ مفاد پرست ٹولے نے اقتدار کے دروازے کو کھول دینے کے لیے احتساب کا نعرہ لگایا ہے۔

8۔ تحریک نفاذ جعفریہ پاکستان کے سربراہ آغا سید حامد علی شاہ موسوی نے صدر کے فیصلہ کو جذباتی قرار دیا۔ انھوں نے انتخابات کے لیے ایام محرم سے پہلے یا بعد کی تاریخ مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔

9۔ جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے امیر مولانا گوہر الرحمان نے کہا اسمبلیوں کا خاتمہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم اسمبلیوں کے اندر جمہوری طریقے سے ہونے والی تبدیلیوں کے حامی ہیں۔ نواز شریف نے چونکہ شریعت کا مذاق اڑایا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے غرور کی سزا دی ہے۔

10۔ جمعیت العلمائے اسلام کے قائم مقام امیر مولانا محمد اجمل خان نے کہا جمعیت العلمائے اسلام شدید اختلافات کے باوجود اسمبلیاں توڑنے کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن وزیراعظم کی حمایت سے غبار خاطر نکالنے کے بعد صدر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وزیراعظم نے اپنے کارناموں میں اسلامائزیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیونکہ ان کی حکومت اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائی۔ افسوس یہ ہے کہ صدر نے جو چارج شیٹ دی ہے اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ جس سے اسلام سے ان کے اخلاص کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پی پی نے وزیراعظم کو آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے سنہری جال میں پھنسایا، جسے مسلم لیگ والے سمجھ نہ سکے۔

قومی اسمبلی اور وزارت اعظمیٰ کی بحالی

19 اپریل 1993ء کو قومی اسمبلی کے سپیکر گوہر ایوب خان نے صدر مملکت غلام اسحاق خان کی طرف سے قومی اسمبلی کو برطرف کرنے کے اقدام کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا' بعد ازاں میاں نواز شریف نے بھی قومی اسمبلی کی بحالی کی اپیل کر دی۔

سپریم کورٹ نے 26 مئی 1993ء کو قومی اسمبلی اور سابق وزیراعظم میاں نواز شریف اور ان کی کابینہ کو بحال کر دیا۔ 11 ججوں پر مشتمل فل بنچ کے دس ججوں نے سابق وزیراعظم اور ان کی کابینہ کی بحالی کے حق میں فیصلہ دیا جب کہ ایک جج نے فیصلے سے اختلاف کیا۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ سابق وزیراعظم کی طرف سے قومی اسمبلی کی بحالی کے لیے دی گئی آئینی درخواست آئین کے آرٹیکل 184 (2) کے تحت قابل سماعت ہے۔ اپنے اکثریتی فیصلے میں سپریم کورٹ نے صدر کے 18 اپریل 1993ء کے حکم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ عدالت عظمیٰ نے لکھا کہ جہاں تک اس درخواست کی میرٹ کا تعلق ہے سپریم کورٹ کے 10 ججوں کا فیصلہ یہ ہے کہ صدر غلام اسحاق خاں کا 18 اپریل 1993ء کا فیصلہ صدر کو آئین کے آرٹیکل 58 (2) بی میں حاصل شدہ اختیارات کے دائرے میں نہیں آتا۔ اس طرح صدر کا یہ فیصلہ آئین میں حاصل دوسرے اختیارات کے دائرے سے بھی باہر ہے۔ اس لیے فیصلہ غیر قانونی ہے اور اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے مختصر فیصلے میں لکھا کہ ہمارے اس حکم کے نتیجے میں قومی اسمبلی' وزیراعظم اور کابینہ بحال ہو گئے ہیں اور اس طرح اپنا کام کریں گے جس طرح کہ وہ 18 اپریل 1993ء کے صدارتی حکم سے پہلے کر رہے تھے۔ 18 اپریل 1993ء کے بعد آئین کے آرٹیکل 58 (2) بی کے تحت نگران کابینہ کے قیام کی بھی کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی۔ تاہم نگران حکومت نے جو احکامات جاری کیے ہیں اور اس اثناء میں ریاست کو چلانے کے سلسلے میں آئین کے تحت جو اقدامات کیے گئے ہیں انھیں قانونی حیثیت حاصل ہو گی۔ یہ فیصلہ چیف جسٹس نسیم حسن شاہ نے یہ فیصلہ سنایا۔

اعتماد کے ووٹ کا حصول

سپریم کورٹ کی جانب سے نواز شریف کی حکومت کی بحالی کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وزیر اعظم قومی اسمبلی سے از سر نو اعتماد کا ووٹ لیں تا کہ صدر نے جس بنا پر قومی اسمبلی کو تحلیل اور وزیر اعظم کو برطرف کیا تھا، ان کے اس اقدام کو بھی غلط قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ 27 مئی 1993ء کو وزیر اعظم نواز شریف نے قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ اعتماد کی تحریک شام 6 بج کر 40 منٹ پر پارلیمانی امور کے وزیر چوہدری امیر حسین نے پیش کی۔ نواز شریف نے مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں کے تعاون سے 123 ووٹ حاصل کئے، اس طرح وہ ایک بار پھر عوام کے اعتماد پر پورے اترے۔ اگر چہ اپوزیشن جماعتوں نے اعتماد کا ووٹ نہ ڈالنے ہی میں اپنی بہتری سمجھی۔

متحدہ اپوزیشن کا قیام:

نواز شریف کی وزارت عظمیٰ سے بحالی کے فوراً بعد 27 مئی ہی کو حزب اختلاف کی جماعتوں نے نواز شریف کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ اس محاذ میں پی ڈی اے، این ڈی اے، چٹھہ گروپ اور اسلامی جمہوری محاذ نے شمولیت اختیار کی۔ اس اتحاد کا مقصد باہم مل کر نواز شریف کی حکومت کو ختم کرنا قرار پایا۔ اپوزیشن رہنماؤں نے اپنے اجلاس میں کہا کہ نواز شریف اور ان کے گروہ کے زیر اقتدار جمہوریت چل سکتی ہے اور نہ ملک کی سالمیت محفوظ رہ سکتی ہے۔ ماضی میں ان کے رویے نے فیڈریشن کا اتحاد خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ان کے خلاف سیاسی جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔

صوبائی اسمبلیوں کی تحلیل:

سپریم کورٹ کے تاریخی فیصلے کے بعد یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب سیاسی طوفان کوئی اور رخ اختیار کرے گا اور آئندہ کسی صدر مملکت یا گورنر کو قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑنے کے لیے ہزار بار سوچنا پڑے گا۔ لیکن ابھی عوام کی جانب سے سپریم کورٹ کے فیصلے کو سراہنے کا سلسلہ جاری تھا کہ 29 مئی 1993ء کو پنجاب اور 30 مئی کو سرحد اسمبلی بھی توڑ دی گئی۔

پنجاب کے بحران نے تو زیادہ شدت اختیار کر لی کیونکہ پنجاب کے نگران وزیر اعلیٰ میاں منظور احمد وٹو اور گورنر پنجاب الطاف حسین کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس بنا پر وہ وفاقی حکومت کے سخت خلاف تھے اور ان کی مخالفت میں اس حد تک پہنچ گئی کہ انھوں نے اپنے مرتبے کا بھی خیال نہ رکھا۔

29 مئی کو سابق وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں نے اسمبلی توڑے جانے کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ انھوں نے 4 بجے اسمبلی توڑی اور 9 بجے تحریک عدم اعتماد کی خبر آئی۔ جب کہ غلام حیدر وائیں نے کہا کہ 4 بجے اسمبلی توڑنے کا اعلان سفید جھوٹ ہے۔ 30 مئی کو لاہور ہائی کورٹ نے حکومت پنجاب کو حکم دیا کہ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

9 جون 1993ء کو لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے پنجاب کے 29 مئی کے حکم کو معطل کر کے پنجاب اسمبلی کو عارضی طور پر بحال کر دیا اور قرار دیا کہ منظور احمد وٹو بطور وزیر اعلیٰ اور ان کی کابینہ کے ارکان اپنے فرائض ادا کر سکتے ہیں۔ عدالت نے یہ بھی قرار دیا کہ میاں منظور احمد وٹو گورنر کو نئے سرے سے اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے سکیں گے اور نہ ان کے خلاف عدم اعتماد کی نئی تحریک پیش کی جا سکے گی۔

28 جون 1993ء کو لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے پنجاب اسمبلی کو بحال کر دیا اور گورنر کے 29 مئی کے حکم کو کالعدم قرار دے دیا۔ فل بنچ نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اسمبلی توڑنے کا مشورہ بد نیتی پر مبنی تھا۔ انھوں نے اسمبلی توڑنے کا فیصلہ اپنے آپ کو اقتدار میں رکھنے کے لیے کیا۔

جہاں تک سرحد اسمبلی کی برطرفی کا تعلق ہے تو 14 جولائی 1994ء کو لاہور ہائی کورٹ کے برعکس پشاور ہائی کورٹ نے سرحد اسمبلی توڑنے کے اقدام کو درست قرار دیا۔

ایک عرصے سے جاری سیاسی بحران کو حل کرنے کے سلسلے میں بالآخر فوج کے تعاون سے 17 جولائی 1993ء کو ایک سمجھوتہ طے پایا، جس پر صدر مملکت غلام اسحاق خان، وزیر اعظم نواز شریف اور آرمی چیف سٹاف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے دستخط کیے۔ اس دستاویز میں وزیر اعظم کی طرف سے صدر مملکت کو قومی اسمبلی توڑنے کی ایڈوائس، صدر مملکت کے استعفیٰ اور عام انتخابات کے ٹائم ٹیبل کی تفصیلات درج تھیں۔

18 جولائی 1993ء کو اس سمجھوتے کے تحت وزیر اعظم نواز شریف اور صدر مملکت غلام اسحاق خان نے اپنے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ مملکت کا کاروبار چلانے کے لیے سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد کو قائم مقام صدر اور معین قریشی کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی برطرفی

صدر مملکت سردار فاروق احمد خان لغاری نے آئین کے آرٹیکل 58 (2) بی کے تحت حاصل اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے 5 نومبر 1996ء کو قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور بے نظیر بھٹو کو دوسری مرتبہ برطرف کر دیا۔ سابق سپیکر قومی اسمبلی ملک معراج خالد کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا اور عام انتخابات کے لیے 3 فروری 1997ء کی تاریخ مقرر کی۔ صدرت مملکت نے قومی اسمبلی کی تحلیل اور بے نظیر حکومت کی برطرفی کے لیے آٹھ بڑے الزامات عائد کیے یعنی:

1۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو ان کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا جن میں سابق وزیر اعظم کا بہنوئی بھی شامل تھا اور سابق وزیر اعظم نے میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کا الزام صدر مملکت اور بعض حکومتی اداروں پر عائد کیا جب کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ غنویٰ بھٹو اور دیگر عزیز و اقارب نے آئی بی کے سربراہ مسعود شریف، وزیر اعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ، آصف زرداری اور اعلیٰ سرکاری حکام پر سازش کا الزام عائد کیا۔

2۔ وزیر اعظم نے سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کے بارے میں فیصلے کی توہین کی اور اس فیصلے کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی تھیں۔

3۔ صدر مملکت کو اطلاع دیئے بغیر کرپشن کے خاتمے کا بل قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا جس میں تجویز پیش کی گئی کہ 32 ارکان قومی اسمبلی کی شکایت پر سپریم کورٹ کے کسی بھی جج کو جبری رخصت پر بھیج دیا جائے۔ اس بل کو کابینہ نے بھی منظور کر لیا۔

4۔ عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کی انتظامی مدت گزرنے کے باوجود اسے مکمل نہیں کیا گیا۔

5۔ آئین کے آرٹیکل 14 کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے عدلیہ کے ججوں، اعلیٰ فوجی اور سول حکام کے ٹیلی فون ٹیپ کیے گئے اور غیر قانونی طور پر ان کی گفتگو سنی گئی۔

6۔ رشوت ستانی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ قومی سلامتی کو خطرات لاحق ہو گئے تھے۔

7۔ جن افراد کے خلاف کرپشن کے الزامات میں فوجداری مقدمات درج کیے گئے تھے انھیں کابینہ میں شامل کیا گیا اور وزیر داخلہ اعلان کے باوجود مستعفی نہ ہوئے۔

8۔ پاکستان پٹرولیم لمیٹڈ (پی پی ایل) اور برما کیسٹرول کے حصص کابینہ اور صدر مملکت کی اجازت کے بغیر فروخت کر دیئے گئے جس سے قومی خزانے کو کئی ارب روپے کا نقصان پہنچا۔

نواز شریف حکومت کی دوسری برطرفی

جب سے وزیر اعظم نے اعلان واشنگٹن پر دستخط کیے تھے اس وقت سے لے کر ان کی حکومت کا تختہ الٹنے تک کارگل سے فوج کی واپسی کی بنا پر فوج اور حکومت کے مابین اختلافات نے شدت اختیار کر لی تھی۔ وزیر اعظم

اختلاف کو معمول پر لانے کے لیے ستمبر 1999ء میں جنرل پرویز مشرف کی مدت ملازمت بطور چیئرمین جائنٹ چیف آف کمیٹی اور چیف آف آرمی سٹاف اکتوبر 2001ء تک توسیع کردی تھی جس کے نتیجے میں بحریہ کے ایڈمرل فصیح بخاری کو بھی مستعفی ہونا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ 10 اکتوبر کو جنرل پرویز مشرف سری لنکا کی پچاسویں سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کے لیے کولمبو گئے۔ 12 اکتوبر 1999ء کو ان کی پاکستان آمد سے قبل ہی وزیر اعظم نے جنرل خواجہ ضیاء الدین بٹ کو لیفٹیننٹ جنرل سے جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر انھیں جنرل پرویز مشرف کی جگہ نیا آرمی چیف مقرر کیا۔ چیف آف جنرل سٹاف جنرل عزیز جنھیں جنرل پرویز مشرف کا ساتھی کہا جاتا تھا کو بھی ان کے عہدے سے فارغ کردیا گیا۔ لیکن جنرل پرویز مشرف کی برطرفی کی کوئی سرکاری وجہ نہ بتائی گئی۔ دریں اثناء 12 اکتوبر کو جب جنرل پرویز مشرف پاکستان آئے تو کراچی ایئرپورٹ کے ڈائریکٹر کو فون پر حکم دیا کہ وہ جنرل پرویز کا جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر نہ اترنے دے اور اسے دوبئی بھیج دیا جائے۔

ہوتا آیا یوں ہی ہوتا رہے گا۔ کیا کوئی فضل الٰہی، رفیق تارڑ، ضیاء الحق اور پرویز مشرف

یہ پیغام پائلٹ کو بھی دیا گیا۔ مگر پائلٹ نے زبردستی جہاز کو ٹرمینل ون پر اتار لیا اور ایئرپورٹ کو مکمل طور پر بند کر کے فوج کے حوالے کردیا گیا۔ حکومت نے جنرل پرویز مشرف کی برطرفی کی خبر ساڑھے چھ بجے ٹیلی کاسٹ کرادی۔ چھ بج کر 35 منٹ پر فوج اسلام آباد ٹی وی سنٹر میں داخل ہوگئی بعد ازاں فوجی دستوں نے وزیر اعظم کی کمان لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز کی قیادت میں سنبھال لی اور نواز شریف، شہباز شریف، سرتاج عزیز، مشاہد حسین، راجہ نادر پرویز اور ان کے دیگر ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ مسلح افواج نے آخری چارہ کار کے طور پر یہ اقدام کیا۔ 12، 13 اکتوبر کی رات کو جنرل پرویز مشرف نے ریڈیو اور ٹی وی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

جیسا کہ آپ آگاہ ہیں نہ صرف یہ کہ نواز شریف حکومت نے تمام اداروں کو نقصان پہنچایا۔ جہاں تک معیشت کا تعلق ہے تو وہ بھی تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی تھی۔ ذاتی مفادات پر مبنی پالیسیوں پر عمل کیا جارہا تھا جس سے پاکستان کی بنیادیں ہل گئیں۔ عوام اور مختلف سیاسی حلقے تیزی سے بگڑتی ہوئی صورتحال کی اصلاح کے لیے مسلح افواج سے مسلسل درخواست کر رہے تھے۔ وزیر اعظم کو پورے خلوص کے ساتھ اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ لیکن وزیر اعظم نے اپنی تمام تر توجہ پاک فوج پر مرکوز کردی۔ میرے تمام مشوروں کے باوجود انھوں نے مسلح افواج کے معاملات میں مداخلت کی کوشش کی۔ فوج ملک کا آخری معتبر ادارہ ہے اور جس پر آپ سب کو نہ صرف فخر ہے بلکہ جس سے ہر قسم کے حالات میں وطن عزیز کے استحکام واتحاد اور یکجہتی کے لیے کردار ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ ہم نے ایک بار پھر واضح الفاظ میں اپنی تشویش سے آگاہ کیا لیکن نواز شریف کی حکومت نے اس تشویش کو نظر انداز کردیا اور پاک فوج کو سیاست میں ملوث کرکے اسے غیر مستحکم کرنے اور اس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں سرکاری دورہ پر سری لنکا میں تھا تاہم میری وطن واپسی پر پی آئی اے کی عام پرواز کو کراچی کے ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت نہ دی گئی حالانکہ ایندھن کی کمی اور تمام مسافروں (200 سے زائد) کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں تھیں' کیونکہ طیارے کو پاکستان سے کہیں بھی باہر لے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پاک فوج کی بروقت کارروائی سے یہ ناپاک منصوبہ ناکام ہوگیا اور پاکستان انتشار سے بچ گیا۔

قوم کے نام اپنے پیغام میں جنرل پرویز مشرف نے یہ نہیں بتایا کہ ملک کا نظم ونسق کیسے چلایا جائے گا۔ قومی اسمبلی اور دیگر منتخب ادارے کام کرتے رہیں گے۔ آئین بحال رہے گا یا کہ اس کی کچھ شقیں معطل کردی جائیں گی۔

وزیر اعظم کا حوصلہ اس وقت سے بلند ہونا شروع ہو گیا تھا جب انھوں نے صدر فاروق لغاری اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور بعد ازاں جنرل جہانگیر کرامت کو ان کے عہدوں سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ امریکی دباؤ میں آکر نواز شریف نے جیتی ہوئی جنگ ہار دی اور کارگل سے پاک فوج کی واپسی منظور کرلی۔ لیکن اپنے سیاسی امیج کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے انھوں نے آرمی چیف (جنرل پرویز مشرف) کو اپنا حریف بنالیا۔ وہ اپنے انجام کو خود پہنچے' کیوں کہ انھوں نے ملک میں مطلق العنان حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کردیا تھا اور اس چکر میں چوکھی لڑائی لڑنے کی کوشش کی۔ 13 اکتوبر کو فوجی حکام نے کہا کہ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں بدستور کام کرتی رہیں گی۔ ملک میں مارشل لاء نافذ نہیں کیا جائے گا۔ نہ آئین منسوخ ہوگا۔ تاہم نواز شریف اور اس کے ساتھیوں کے خلاف فوج کے خلاف سازش کے کافی ثبوت مل گئے ہیں۔

تاہم 14 اکتوبر 1999ء کو جائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے پورے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کردی اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس ضمن میں جو فرمان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین پر عملدرآمد معطل رہے گا، صدر مملکت اپنے منصب پر کام کرتے رہیں گے۔ قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیاں اور سینٹ معطل رہیں گے۔ سینٹ کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر بھی معطل رہیں گے۔ وزیر اعظم، وفاقی وزراء اور وزراء مملکت، وزیر اعظم کے مشیر پارلیمانی سیکرٹری، صوبائی گورنر، صوبائی وزرائے اعلیٰ، صوبائی وزیر اعلیٰ کے مشیر اپنے عہدوں پر برقرار نہیں رہیں گے۔ پورا پاکستان مسلح افواج کے کنٹرول میں ہوگا۔

چیف ایگزیکٹو نے عبوری آئین کا حکم بھی جاری کیا۔ حکم میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کے آئین کی دفعات پر عمل درآمد معرض التواء میں ڈالے جانے سے قطع نظر پاکستان کا نظم ونسق جہاں تک یہ حکم اور چیف ایگزیکٹو کی طرف سے جاری کیے گئے دوسرے احکامات اجازت دیں جتنی حد تک ممکن ہو آئین کے مطابق چلایا جائے گا۔ اس طرح وہ تمام عدالتیں جو اس فوری حکم کے نفاذ سے پہلے قائم تھیں کام کرتی رہیں گی اور اپنے دائرہ کار میں اختیارات استعمال کریں گی بشرطیکہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹس یا کسی دوسری عدالت کو چیف ایگزیکٹو یا ان کی اتھارٹی کے تحت دائرہ اختیار یا اختیارات استعمال کرنے والے کسی شخص کے خلاف حکم جاری کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

آئین کے حصہ دوم کے پہلے باب میں دیئے گئے بنیادی حقوق جو ہنگامی حالت کے فرمان یا اس کے تحت وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے کسی حکم سے متصادم نہ ہوں نافذ العمل رہیں گے۔

صدر مملکت چیف ایگزیکٹو کی ایڈوائس پر اور اس کے مطابق عمل کریں گے۔ کسی بھی عدالت یا ٹریبونل کی جانب سے چیف ایگزیکٹو کی طرف سے نامزد کی گئی کسی اتھارٹی کے خلاف کسی بھی قسم کا کوئی فیصلہ ''ڈگری رٹ''، حکم یا پروسیس جاری نہیں کیا جائے گا۔ آئین کی دفعات پر عمل درآمد

معرض التواء میں ڈالے جانے سے قطع نظر چیف ایگزیکٹو کے احکام کے تحت آئین کے سوا تمام قوانین نافذ العمل رہیں گے۔ تا آں کہ چیف ایگزیکٹو یا ان کی طرف سے نامزد کی گئی اتھارٹی ان میں ردو بدل کر کے ترمیم کردے یا انھیں منسوخ کردے۔ پچھلے سال 28 مئی کو جاری ہونے والا ہنگامی حالت کا فرمان 14 اکتوبر 1999ء کے ایمرجنسی کے فرمان اور عبوری آئین کے اس حکم اور اس کے تحت جاری ہونے والے کسی بھی دوسرے حکم کی دفعات کے تحت جاری رہے گا۔ وہ تمام افراد جو اس حکم کے نفاذ سے فوراً پہلے آئین کے آرٹیکل 260 میں دی گئی تعریف کے مطابق پاکستان کی سروس میں تھے اور وہ تمام افراد جو اس حکم کے نفاذ سے فوراً پہلے سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت کسی ہائیکورٹ کے جج، آڈیٹر جنرل، محتسب یا چیف احتساب کمشنر تھے، انھی شرائط پر اور اسی استحقاق کے ساتھ اپنی سروس یا اپنے عہدے پر فائز رہیں گے۔

یہ تمام فیصلے تینوں مسلح افواج کے سربراہوں اور پاک فوج کے کمانڈوں کے باہمی صلاح مشوروں سے کیے گئے۔

صدر محمد رفیق تارڑ کی سبکدوشی

20 جون 2001ء کو صدر محمد رفیق تارڑ کو ان کے عہدے سے سبکدوش کردیا گیا اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے ان کی جگہ صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ اپنی سبکدوشی کے بعد سابق صدر محمد رفیق تارڑ نے کہا کہ مجھے پی سی او کے ذریعے فارغ کیا گیا، جس کی اطلاع مجھے چند روز پہلے کی گئی تھی۔

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد سینٹ اور قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ جنرل پرویز مشرف نے اس ضمن میں کہا کہ اصلاحات کے تسلسل اور استحکام کی ضمانت کے لیے صدر کا عہدہ سنبھالنا ضروری ہوگیا تھا۔ عام انتخابات عدالتی فیصلے کے مطابق ہوں گے۔ چیف ایگزیکٹو کو صدر بنانے کے لیے پی سی او میں دو ترامیم کی گئیں۔

جنرل پرویز مشرف کے صدر کا عہدہ سنبھالنے پر ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ مثلاً

1۔ اے آر ڈی اور دیگر سیاسی جماعتوں نے اسے آئین کے منافی اقدام قرار دیا۔

2۔ سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کہا جنرل پرویز کے صدر بننے کا پروگرام پرانا تھا، اس پر قطعاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

3۔ جنرل پرویز مشرف نے صدر بن کر آئینی، سیاسی اور اقتصادی ضرورتوں کو پورا کیا۔

4۔ قومی اسمبلی معطل ہونے کے باعث صدر استعفیٰ نہ دے سکے، سبکدوش ہونا پڑا۔

5۔ پاکستان جمہوریت سے مزید دور ہوگیا، پابندیاں نہیں ہٹائیں گے۔ (امریکہ)

6۔ منتخب حکومت کی طرف پیش قدمی ہوئی۔ بہت سے مسائل خود بخود حل ہوں گے۔ (میاں اظہر)

7۔ پاکستان میں یوں ہی ہوتا آیا، یوں ہی ہوتا رہے گا۔ کیا کوئی فضل الٰہی، رفیق تارڑ، ضیاء الحق اور پرویز مشرف اپنے پیشروؤں سے عبرت حاصل کرے گا۔ جمہوریت کی بساط لپیٹی گئی تو رفیق تارڑ نے اف تک نہ کی، پھر بذریعہ سڑک گھر چلے گئے۔ (بی بی سی)

8۔ جنرل پرویز مشرف کو صدر پاکستان قبول کرتے ہیں۔ (بھارت)

9۔ یہ جمہوریت کی بحالی کے عمل کے لیے دھچکا ہے۔ (برطانیہ)

✿✿✿✿✿

- نظریۂ پاکستان ایک حقیقی و واقعی نظریہ تھا یا ایک واہمہ و خیال؟
- علامہ اقبال کس طرح کی مسلم ریاست کے قیام کے خواہاں تھے؟
- قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے یا اسلامی نظریاتی ریاست؟
- نظریۂ پاکستان سے انحراف کے کیا نتائج سامنے آچکے ہیں اور مزید کن نتائج کا اندیشہ ہے؟
- پاکستان کی نظریاتی اساس کو مستحکم کرنے کا واحد طریقہ کیا ہے؟

یہ سب کچھ جاننے کے لیے مطالعہ کیجیے:

علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریۂ پاکستان

اور

اس نظریے سے انحراف کے نتائج

بانی، تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کا انتہائی فکر انگیز خطاب

✿ معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ✿ عمدہ طباعت ✿ 64 صفحات

اشاعت عام: 20 روپے ' اشاعت خاص: 40 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-5869501

email:maktaba@tanzeem.org website:www.tanzeem.org

پاکستان میں نفاذ اسلام کے لئے کیے گئے اقدامات پر ایک نظر

غیر ملکی سامراج کے خلاف مسلمانانِ برصغیر کی جدوجہد آزادی کے پہلو بہ پہلو تجدید و احیائے اسلام کا نصب العین بھی تھا اور درحقیقت اسی نصب العین کی خاطر انہوں نے جداگانہ تشخص کے نظریے کی اساس پر حصولِ پاکستان کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔ علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد (1930) کی بنیاد پر جب قرار داد لاہور (1940ء) منظور ہوئی اور تحریکِ پاکستان چلی تو پورے برصغیر کے مسلمانوں کا ایک ہی نعرہ تھا:

پاکستان کا مطلب کیا
لا اِلٰہ اِلاّ اللہ

قیام پاکستان کے بعد مختلف حکومتوں نے اپنے اپنے عہد میں بہ رضا و رغبت یا عوامی دباؤ کے تحت نظامِ اسلام کے لیے جو اقدامات کیے وہ اختصار کے ساتھ یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

1۔ قراردادِ مقاصد

پاکستان میں اسلامی نظام کی جانب پہلا قدم 12 مارچ 1949ء کی قراردادِ مقاصد کی منظوری کی صورت میں اٹھایا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو قرآن و سنت میں ڈھالنے کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ جمہوریت، آزادی، مساوات اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا اور اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

قرار دادِ مقاصد کو پاکستان کی آئینی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ملک کی نظریاتی اساس متعین کردی۔ پاکستان کے تمام دساتیر میں اس کو دیباچے میں شامل کیا گیا۔ اب یہ آئین کا باقاعدہ اور موثر حصہ ہے۔ (قرار داد مقاصد کا مکمل متن باب چارم میں درج ہے۔)

2۔ پاکستان کے دساتیر

قرار دادِ مقاصد نے مستقبل میں آئین سازی کے لیے بنیاد کا تعین کر دیا تھا۔ لہٰذا پاکستان کے تمام دساتیر میں اسلامی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ یہ رنگ 1973ء کے آئین میں تو مزید گہرا ہو گیا ہے۔

3۔ علماء کے بائیس نکات

1951ء میں مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے 22 نکاتی فارمولہ پیش کیا۔ یہ اس امر کا واضح اعلان تھا کہ بنیادی امور پر علمائے کرام اور پوری قوم متحد ہے۔ (ان نکات کا مکمل متن باب پنجم میں درج ہے۔)

پاکستان کی منزل مقصود اسلامی معاشرے کا قیام ہے۔ ماضی کی کوششیں اور قیام پاکستان کے فوری بعد قرار داد مقاصد کی صورت میں کیا جانے والا عہد اس منزل کے نشان ہیں

4۔ تحریکِ نظام مصطفیٰ ﷺ اور بھٹو کے اقدامات

مارچ 1977ء میں ہونے والے انتخابات کو حکومت کی مخالف جماعتوں کے اتحاد، پاکستان قومی اتحاد نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مبینہ دھاندلیوں کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی، جسے تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نام دیا گیا۔ حکومت تمام تر کوششوں کے باوجود تحریک کو روکنے میں ناکام رہی۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک سے مجبور ہو کر اپنی حکومت کو سنبھالا دینے کے لیے حسب ذیل اقدامات کا اعلان کیا:

1۔ شراب نوشی اور عصمت فروشی پر پابندی عائد کر دی گئی۔
2۔ اتوار کی بجائے جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل کا اعلان کیا گیا۔
3۔ گھڑ دوڑ کی ممانعت کر دی گئی۔

5۔ سابقہ دساتیر کی اسلامی دفعات کی بحالی

24 مارچ 1981ء کو عبوری آئین کا ایک حکم نامہ جاری کیا گیا جس میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 1973ء کی متعدد دفعات شامل ہیں۔ اس طرح سابق آئین کی اسلامی دفعات کو بحال کر دیا گیا۔

6۔ شرعی سزاؤں کا نفاذ

1973ء کے آئین کی اسلامی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے 12 ربیع الاوّل 1399ھ بمطابق 10 فروری 1979ء یعنی رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم ولادت کی تقریب پر صدر ضیاء الحق نے اسلامی نظام کے نفاذ کی خاطر چند اہم اعلانات کیے جن کے مطابق چوری اور حرام کاری جیسے جرائم کے انسداد کی خاطر اسلامی سزائیں نافذ کی گئیں تاکہ ان جرائم کی حوصلہ شکنی ہو۔ (حدود آرڈیننس میں ''تحفظ حقوق نسواں'' کے نام سے کی گئی حالیہ ترامیم سے اس کی اصل روح اب باقی نہیں رہی۔ نئی ترمیمات کو تمام مکاتب فکر کے علماء نے غیر اسلامی قرار دیا ہے۔)

7۔ زکوٰۃ وعشر کا نظام

اسلامی نظام معیشت کے نفاذ، معاشی عدل کے قیام اور غربت کے لیے 1980ء سے ملک بھر میں زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ کیا گیا جس کے تحت ہر مسلمان سال کے آخر میں اپنی جمع شدہ رقم و اثاثوں پر زکوٰۃ وعشر دینے

کا پابند ہے۔ صوبائی اور مقامی سطح پر زکوٰۃ کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس طرح حاصل ہونے والی رقوم سے 1980ء سے اب تک رمضان المبارک کے مہینے میں ہر سال لاکھوں روپے کی غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کی اقتصادی امداد دی گئی۔ اس طرح زرعی پیداوار پر بھی عشر نافذ کیا گیا۔

8۔ وفاقی شرعی عدالت کا قیام

ملک میں نفاذ شریعت کے لیے ایک وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا' جس کا درجہ ہائی کورٹ کے برابر ہے۔ اس میں علماء کرام کو بطور جج مقرر کیا گیا ہے۔ یہ عدالت ماتحت عدالتوں میں کیے گئے فیصلوں کے خلاف اپیل سن سکتی ہے اور اسلامی تعلیمات کے منافی قوانین کو منسوخ کر سکتی ہے۔ تاہم افسوسناک بات یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت میں کسی بھی قانون کو اس بنا پر چیلنج نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق نہیں۔

9۔ شریعت بنچ سپریم کورٹ

اسلامی قوانین کے تحت دی گئی سزا کے سلسلے کی اعلیٰ ترین عدالت سپریم کورٹ کا شریعت بنچ ہے' جس میں وفاقی عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی جا سکتی ہے۔

10۔ اسلامی نظریاتی کونسل

اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی گئی۔ اس میں تمام مکاتب فکر کے علماء کو نمائندگی دی گئی۔ کونسل نے حدود آرڈی نینس زکوٰۃ و عشر اور سود سے پاک معیشت کے قیام کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کونسل نے ملک کے قوانین کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ کرنے اور پہلے سے موجود قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے سفارشات پیش کیں، مگر انہیں سرد خانے کی نذر کر دیا گیا۔

11۔ سود سے پاک بینکاری

معاشرے کو سود کی لعنت سے پاک کرنے کے لیے یکم جنوری 1981ء سے نفع و نقصان کی بنیاد پر بینکوں میں کھاتے کھولے گئے۔ یکم جولائی 1984ء سے تمام سیونگ اکاؤنٹس کو نفع نقصان کھاتوں میں بدل دیا گیا۔ علاوہ ازیں حکومت کے سرکاری تحویل میں کام کرنے والی مالیاتی اداروں میں مثلاً این آئی ٹی اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن نے شراکت کی بنیاد پر قرضے دینے شروع کر دیئے۔

12۔ اسلامی یونیورسٹی کا قیام

جنوری 1981ء میں اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی نے کام شروع کیا جو کہ اسلامی علوم کی تعلیم و تحقیق پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ اس میں اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں پر بھی تحقیق کی جاتی ہے۔

13۔ اسلامی قدروں سے ہم آہنگی

انسانی ذہنوں کی تعمیر نظام تعلیم کرتا ہے' اس لیے تعلیم اور تدریس کے عمل کو اسلامی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے 1979ء میں تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی کی گئی' تعلیمی نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی گئیں اور ایسا مواد تعلیمی کتب سے حذف کر دیا گیا جو اسلام اور نظریہ پاکستان کے منافی تھا۔

شاعر اور اسلامی روایات، رواداری اور نظام عدل اس بات کے ضامن ہیں کہ اسلامی نظام میں غیر مسلموں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ ہوگا اور انہیں اپنے اپنے عقائد پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے

14۔ اسلامیات اور مطالعہ پاکستان لازمی

طلبہ کو اسلامی تعلیمات، قیام پاکستان کے پس منظر اور نظریہ پاکستان سے آگاہ کرنے کے لیے ایف اے، بی اے، میڈیکل اور انجینئرنگ کے طلبہ کے لیے مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کیا گیا۔ موجودہ دور حکومت میں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کے مضامین کو مخصوص نظریات کے تحت تبدیل کیا جا رہا ہے۔

15۔ عربی زبان کا فروغ

قرآن و حدیث سمجھنے کے لیے عربی زبان سے واقفیت اشد ضروری ہے۔ چنانچہ ماضی میں حکومت نے عربی کو سکولوں میں لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کیا۔ سکولوں میں قرآن مجید کی تدریس کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر عربی پڑھانے اور قرآن مجید کی قراءت سکھانے کے لیے پروگرام شروع کیے گئے۔

16۔ اسلامی فقہ کا لازمی نصاب

ملکی قوانین کو اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے لاء کالجوں میں اسلامی فقہ کو لازمی نصاب کے طور پر رائج کیا گیا۔

17۔ قرآن و سنت کے مطابق تعلیم

جدید تعلیمی نظام کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے، دینی درسگاہوں کے نصاب تعلیم کو وسعت دینے اور ناخواندگی دور کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لیے مارچ 1980ء میں اسلامی تعلیم کی عالمی کانفرنس ہوئی جس میں مسلم ممالک کے تقریباً بیس دانشوروں نے حصہ لیا۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں ذہنی مطابقت پیدا کرنے کے لیے یکساں نظام تعلیم رائج کرنے اور نظام تعلیم میں دورنگی ختم کر کے اسے قرآن و سنت کے مطابق بنانے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین پر خصوصی توجہ دینے پر زور دیا۔

18۔ نماز کا اہتمام

مسلمانوں کو نماز کا پابند بنانے کے لئے اقامت صلوٰۃ کا نظام نافذ کیا گیا جس کے خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ ملک میں ناظمین صلوٰۃ کا تقرر کیا گیا جو مسلم عوام کو بارگاہ رب العزت میں سربسجود ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ زکوٰۃ کونسل کی طرح صلوٰۃ کونسل کی تجویز بھی زیر غور آئی۔

19۔ احترام رمضان آرڈی نینس

رمضان المبارک کے احترام کے لیے ایک خصوصی آرڈی نینس جاری کیا گیا جس کی رو سے ماہ رمضان میں سرعام کھانے پینے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے تین ماہ قید اور 500 روپے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی۔

20۔ علماء و مشائخ کا احترام

اسلامی معاشرے کی تشکیل میں علماء و مشائخ بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن ماضی کی حکومتوں نے ان کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ضیاء حکومت کے دور میں پہلی بار علماء و مشائخ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس ضمن میں علماء و مشائخ کے کنونشن منعقد کرائے گئے۔ اس طرح علماء و مشائخ کو براہ راست حکومت کے ساتھ بات چیت کا موقع ملا۔ ان کے خیالات کا احترام کیا گیا۔ مذہبی حلقوں کی سرپرستی کی گئی۔ علماء کو شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل میں نمائندگی دی گئی۔

21۔ حج کے لیے سہولتیں

حکومت نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے مواقع فراہم کیے۔ کفالت سکیم کے

تحت وہ تمام لوگ فریضہ حج ادا کر سکتے تھے' جن کے اخراجات بیرون ممالک مقیم ان کے عزیز و اقارب برداشت کریں۔ حاجیوں کے لیے بہترین رہائش اور طبی سہولتیں مہیا کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔

22۔ ذرائع نشرواشاعت کی اصلاح

ضیاء دور میں ریڈیو اور ٹی وی پر اسلامی قدروں کے فروغ کے لیے خاص اہتمام کیا گیا۔ فحش اشتہارات پر پابندی لگا دی گئی۔ رقص و سرود کی بجائے اسلامی پروگرام شروع ہوئے۔ عربی زبان اور قرآن مجید کی قراءت سکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ محافل شبینہ اور مناسک حج کو ٹی وی پر دکھانے کا آغاز ہوا۔ اسلامی تعلیمات پر مبنی پروگرام شروع ہوئے۔ ٹی وی پر کام کرنے والی خواتین کے لیے دوپٹہ لازمی قرار دیا گیا۔ رمضان المبارک میں سحری کے وقت اسلامی پروگرام شروع ہوئے۔ پانچ وقت کی اذان شروع ہوئی۔

23۔ قومی لباس اور زبان کی ترویج

قومی تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے قومی لباس کی سرپرستی کی گئی۔ سرکاری تقریبات کے موقع پر صدر قومی لباس پہنتے جس کی تقلید وزراء اور سرکاری افسران بھی کرتے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے بھی اقدامات کیے گئے۔ صدر مملکت اہم مواقع پر اردو میں اظہار خیال کرتے۔ سرکاری دفاتر میں بھی اردو کو بتدریج رائج کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔

24۔ اسلامی وقومی تقریبات

حکومت نے اہم اسلامی وقومی تقریبات کو سرکاری سطح پر منانے کا فیصلہ کیا۔ یوم میلاد النبی ﷺ کو شان و شوکت سے منانے کا اہتمام کیا۔ شب برأت اور شب معراج کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے خصوصی پروگرام مرتب کیے گئے۔ یوم آزادی کو نئی شان اور جذبہ سے منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس دن کو رنگا رنگ تقریبات کے ساتھ بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔

25۔ شریعت بل کی منظوری

میاں محمد نواز شریف کے دور حکومت میں پارلیمنٹ نے شریعت بل کو منظور کیا' تاکہ قرآن وسنت کو ملک کے تمام قوانین پر برتری حاصل ہو۔ تعلیمی، عدالتی اور معاشی نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے۔ اسلامی اقدار کو فروغ دیا جائے اور سماجی برائیوں کا خاتمہ کیا جائے۔

26۔ بیت المال کا قیام

1992ء میں بیت المال کا قیام دو ارب روپے کے فنڈ سے عمل میں لایا گیا جس کا مقصد ملک میں ناداروں، یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے ہوئے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانا ہے۔

27۔ ناظرۂ قرآن کی تعلیم

محمد نواز شریف حکومت نے اپنے انتخابی منشور کے مطابق تعلیمی اداروں میں ناظرہ قرآن کی تعلیم کے لیے احکامات جاری کیے۔ اس سلسلہ میں تعلیمی اداروں میں ماہر قاری حضرات تعینات کیے گئے۔

28 احتساب کمیٹیاں

حکومت نے ملک میں کرپشن کے خاتمہ' انصاف کی فراہمی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لیے احتساب کمیٹیاں قائم کیں۔

29۔ دینی مدارس کی سرپرستی

حکومت نے دینی مدارس کی سرکاری طور پر سرپرستی کی اور ان کو اخراجات کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے سالانہ امداد دینا شروع کی۔ منظور شدہ دینی مدارس کی اسناد کو ایم اے کی ڈگری کے مساوی قرار دیا گیا اور یہاں سے فارغ التحصیل افراد کو فوج اور تعلیمی اداروں میں ملازمت کے مواقع فراہم کیے گئے۔

30۔ قادیانیوں کے بارے میں نیا فیصلہ

قادیانیوں کو بھٹو حکومت میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا تھا لیکن وہ بدستور شعائر اسلام کے نام استعمال کر رہے تھے۔ 1984ء میں حکومت نے ان پر شعائر اسلام کے نام استعمال کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اب وہ اپنی عبادت گاہوں کو مسجد نہیں کہہ سکتے' نہ اذان دے سکتے ہیں۔ وہ مرزا غلام احمد کے ساتھیوں کو صحابہ کرام اور ان کی بیویوں کو امہات المومنین نہیں کہہ سکتے۔ (نعوذ باللہ)

مندرجہ بالا اقدامات ایک عظیم مرحلے کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔ پاکستان کی منزل مقصود اسلامی معاشرے کا قیام ہے۔ ماضی کی کوششیں اور قیام پاکستان کے فوری بعد قرار داد مقاصد کی صورت میں کیا جانے والا عہد اس منزل کے نشان ہیں۔ ملک میں بنائے جانے والے اب تک کے تینوں دساتیر میں اسلام کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے آئینی دفعات کا سہارا لیا گیا ہے مگر اس کے باوجود اب تک مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکے' جن کا عہد الگ وطن حاصل کرتے وقت کیا گیا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر جب ہم اپنی آئینی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں اسلامی دفعات تو ہر آئین میں بکثرت ملتی ہیں مگر ان پر عمل درآمد کرنے کی رفتار خاصی سست نظر آتی ہے۔

قیام پاکستان کا جواز

حصول پاکستان کا مقصد ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں مسلمان اسلامی نظام کے تحت اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ صرف مسلمانوں کے لیے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل آزاد مملکت کا حصول پیش نظر نہ تھا بلکہ ان علاقوں پر مشتمل ایک نئی مملکت کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ اسلام تھا تاکہ مسلمان اپنی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی اسلام کے اصولوں کے مطابق گزار سکیں۔

اسلامی نظام کے قیام میں پیش آنے والی دشواریاں

بلاشبہ آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے قائدین قیام پاکستان کی سرگرم جدوجہد میں مصروف ہونے کے باعث ریاست پاکستان کی آئینی اساس اور اس کے دوسرے لوازمات کے بارے میں کوئی تفصیلی منصوبہ نہ بنا سکے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور خود قائداعظم یہ بات واشگاف الفاظ میں کہہ چکے تھے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہوگی لیکن انگریز اور ہندو سازشوں نے مسلم قائدین کو کئی ایک اہم اور سنگین مسائل میں ایک عرصے تک اس قدر الجھائے رکھا کہ وہ ملک کے نظریاتی تقاضوں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اس کے علاوہ قائداعظم' لیاقت علی' علامہ شبیر احمد عثمانی اور علامہ سید سلمان ندوی جیسے رہبروں کی وفات کی وجہ سے پاکستان کی نظریاتی اساس متعین اور مستحکم کرنے کے عمل کو بہت نقصان پہنچا۔

مسلمانانِ پاکستان کا عقیدہ وعزم

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان جیسے نظریاتی ملک کو سیاسی استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ کیونکہ ملک میں کبھی پارلیمانی نظام اور کبھی صدارتی نظام اور کبھی فوجی حکومت کا قیام عمل میں آتا رہا ہے اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ اس ملک کے لیے کون سا نظام مناسب رہے گا یا ایک نظریاتی ملک میں نفاذ شریعت اور اسلامی طرز حیات کے لیے کون سا نظام موزوں رہے گا لیکن اس بات پر مذہبی مسالک اور ہر طبقہ فکر کے لوگ اور تمام قوم متفق ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اسی نام پر اسے قائم و دائم رہنا ہے۔ پاکستان کے مختلف آئینوں کے مطابق جو وقتاً فوقتاً نافذ کیے گئے آپ کو اسلام کی جھلک ان میں نظر آتی ہے، مگر عملاً ملک

کی گاڑی کو سیکولرازم کی پٹری پر لے جانے کی کوشش ہو رہی ہیں۔ روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا نعرہ اسی کا مظہر ہے۔

قراردادِ پاکستان اور نظامِ اسلام

قرارداد مقاصد پر دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے جو بحث کی اس کے تجزیئے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر مسلم ارکان نے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا کہ شاید غیر مسلم اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری بنانے کے لیے یہ قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ چند سیکولر مسلم ارکان بھی یہ چاہتے تھے کہ مذہب کو کاروبار حکومت چلانے کے لیے دخل نہیں ہونا چاہیے لیکن اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور کئی دوسرے مقررین نے بات واضح کی کہ شاندار اسلامی روایات، رواداری اور نظام عدل اس بات کے ضامن ہیں کہ غیر مسلموں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ

جب تک پاکستان کی حکومت اور عوام صرف اسلام ہی کو اپنا نصب العین نہیں بنائیں گے

اس وقت تک حکومت اور عوام سرخرو نہیں ہو سکتے۔

ہوگا اور انھیں اپنے عقائد پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے اور یہ بات بھی واضح کی گئی کہ یہ قرارداد تحریک پاکستان کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی نظر آئے کیونکہ پاکستان کا دستور قرارداد مقاصد کی روح کے مطابق مرتب ہوگا۔ نظام مملکت اور پاکستان معاشرہ بھی انھی خطوط پر استوار ہوگا یعنی ان کی بنیاد قرآن وسنت کی تعلیمات پر ہوگی۔ پاکستان کے آئندہ دستور کی وضاحت میں اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے علاوہ ممتاز عالم دین شبیر احمد عثمانی، سردار عبدالرب نشتر اور ڈاکٹر اشتیاق حسن نے بھرپور حصہ لیا' جب کہ مولوی تمیز الدین نے بطور سپیکر اس اجلاس کی صدارت کی۔

1956ء کے دستور کے امتیازی پہلو

1956ء کے دستور کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔ تمام کائنات پر حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات پاکستان کے عوام بطور امانت استعمال کریں گے۔ پاکستان اسلام کے معاشرتی انصاف کے اصولوں پر مبنی ایک جمہوری ریاست قرار پائی جس میں اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ دیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ ان کو اپنی ثقافت اور عقائد کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہوگی۔

1973ء کے دستور کی اسلامی دفعات

1973ء کے دستور میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ساری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور مطلق اختیار قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ اختیارات کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان اختیارات کا استعمال پاکستان کی عوام کے پاس ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتا ہے۔

1۔ پہلے دو دساتیر کی طرح اس آئین کے تحت ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے۔

2۔ آئین میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔

3۔ دستور کے مطابق صدر اور وزیر اعظم کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے۔

4۔ آئین میں پہلی مرتبہ مسلمان کی تعریف کی گئی جس کی رو سے توحید و رسالت اور قیامت پر ایمان کے علاوہ حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی ماننا لازمی ہے۔

5۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔

6۔ آئین میں یہ بات کہی گئی کہ پہلے سے موجود قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جائے گا اور کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو اسلام سے متصادم ہو۔

7۔ قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کی کوشش کی جائے گی۔

8۔ دستور میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا، وہ مسلمان نہیں۔

9۔ آئین میں صدر، وزیر اعظم اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں کو اپنے حلف ناموں میں یہ بھی عہد کرنا پڑتا ہے کہ وہ اسلامی نظریہ کے تحفظ کے لیے جو کہ قیام پاکستان کی بنیاد ہے، مکمل کوشش کریں گے۔

تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ سے پاکستان کے نصب العین کا اعادہ

مارچ 1977ء کے انتخابات کے لیے حزب اختلاف کی تمام جماعتوں نے متحد ہو کر نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کو اپنا انتخابی منشور قرار دیا۔ انھوں نے ملک کے کونے کونے میں یہ پیغام پہنچا دیا کہ جب تک پاکستان کی حکومت اور عوام صرف اسلام ہی کو اپنا نصب العین نہیں بنائیں گے اس وقت تک حکومت اور عوام سے کیے ہوئے وعدے سے سرخرو نہیں ہو سکتے۔ انتخابات کے بعد حکومت وقت کے خلاف عوامی لہر اٹھ کھڑی ہوئی۔

حکومت نے عوامی دباؤ کم کرنے کے لیے کچھ اقدامات اٹھائے جن کی بنا پر اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے کچھ پیش رفت ہوئی مثلاً گھڑ دوڑ پر پابندی، جوئے کا خاتمہ، شراب نوشی اور عصمت فروشی کی روک تھام کے لیے قوانین کا زیادہ موثر بنانا۔ اس کے علاوہ اتوار کی تعطیل کی بجائے جمعہ کی تعطیل کا اعلان۔

نفاذ اسلام بذریعہ قانونی اقدامات

5 جولائی 1977ء کو پاکستان میں مارشل لاء کی وجہ سے حکومت کی تبدیلی عمل میں آئی۔ اس حکومت نے پاکستان میں اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار کرنے کو اپنا نصب العین بنایا اور دستوری اور قانونی اقدامات کے ذریعے نظام اسلام کی طرف پیش رفت کی۔ حکومت نے شعائر اسلام کی پابندی اور احترام کو لازمی قرار دیا۔ اس کے علاوہ علماء اور مذہبی حلقوں کو سرکاری سرپرستی مہیا کی۔ اس سے عوام میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی کہ حکومت نفاذ اسلام کے لیے مخلص ہے مثلاً زکوٰۃ کی کٹوتی' وفاقی شریعت کورٹ کا قیام اور علماء کی خدمات سے استفادہ اور دینی مدارس کے لیے نصاب کا تعین وغیرہ۔

نظام زکوٰۃ کے نمایاں پہلو

حکومت نے اقتصادیات کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے زکوٰۃ اور عشر کا نظام رائج کرنے پر پوری توجہ دی۔ چنانچہ 20 جون 1980ء کو زکوٰۃ آرڈیننس جاری کیا گیا۔ یہ قانون پاکستان کے تمام مسلمانوں پر لاگو کیا گیا۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے لیے جو ادارے بنائے گئے ہیں ان میں عوام ہی کے چنے ہوئے نمائندے تھے۔ طے پایا کہ زکوٰۃ اور عشر جس علاقے سے وصول کیا جائے گا اس کی آمدنی اسی علاقے کے مستحق لوگوں پر صرف ہوگی۔ وصول اور تقسیم کار کا حساب رکھا جائے گا۔ اس کی جانچ پڑتال ہوتی رہے گی۔ یہ رقم ان مدوں پر خرچ ہوگی جن کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ جس فصل پر عشر وصول کیا جائے گا اس پر مالیہ نہیں لیا جائے گا۔ چنانچہ زکوٰۃ اور عشر کے نظام کو چلانے کے لیے وفاقی اور صوبائی سطح پر کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ اس طرح زکوٰۃ کے نظام کا آغاز کیا گیا۔

پاکستان اور عالمِ اسلام

تقسیم سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کے عالمِ اسلام کے ساتھ روابط

قیام پاکستان سے پہلے برصغیر کے مسلمانوں کے عالم اسلام کے ساتھ گہرے تعلقات رہے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں سندھ اور ملتان اسلامی سلطنت کا حصہ بنے۔ اس علاقے پر عربوں کی ایک سو سال حکومت رہی۔ انھوں نے علاقے پر گہرے ثقافتی نقوش چھوڑے۔

دوسرا گروہ جو تقریباً دو سو سال بعد برصغیر میں آیا' اس وقت ان کی قیادت ترک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے پہلے تو پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم کی اور پنجاب تقریباً سو سال تک غزنی کے حکمرانوں کے تحت رہا' پھر مسلمانوں کی حکومتیں آہستہ آہستہ برصغیر کے دوسرے علاقوں تک پھیل گئیں' جو انیس صدی عیسوی تک قائم رہیں۔ اسلامی دنیا کے ساتھ ان کے روابط اچھے تھے۔ ان میں سے اکثر نے عباسی خلیفہ کا نام خطبہ میں شامل کیا اور سکوں پر ان کے نام کندہ کروائے۔ سولہویں صدی عیسوی میں جب خلافت عثمانیہ ترکوں نے سنبھال لی تو برصغیر کے علماء کی نظروں میں خلافت کی اہمیت کم نہ ہوئی اور عالمی سطح پر یہ احساس زندہ رہا کہ مسلمانوں کے آپس میں گہرے روابط ہیں۔

برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمان مشرق وسطٰی کے مسلمانوں کے ساتھ مذہبی' علمی اور روحانی رشتوں میں بھی جڑے رہے۔ مسلمانوں کے مذہبی مقامات مشرق وسطٰی میں ہیں۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ، ہر مسلمان کے خوابوں کی دنیا ہے۔ برصغیر کے مسلمان حصول علم کے لیے مشرق وسطٰی کے ممالک میں جایا کرتے تھے۔ صوفیاء کرام کے تمام سلسلوں کی ابتدا بھی اسی سر زمین سے ہوئی۔ اس طرح برصغیر کے مسلمانوں اور مشرق وسطٰی کے مابین مذہبی اور روحانی تعلقات قائم تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب سلطنت عثمانیہ کمزور ہوگئی تو سامراجی طاقتوں نے اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے منصوبہ بنایا تو برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ ترکی اور روس کی 1877ء میں جنگ ہوئی تو برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی فتح کے لیے دعائیں مانگیں۔

پہلی جنگ عظیم میں ترک مسلمانوں نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے بھی جرمنی کا ساتھ دیا تو برصغیر کے مسلمانوں کو اگرچہ بہت مشکل پیش آئی کہ ایک طرف تو انگریز حکمران تھے دوسری طرف ترک مسلمان بھائی تھے۔ آخر کار اسلام کا جذبہ غالب آیا اور برصغیر کے مسلمانوں نے خلافتِ عثمانیہ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

> **تیسری مسلم سربراہی کانفرنس کے موقع پر صدر پاکستان ضیاء الحق نے امت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو فارمولا پیش کیا اُس کا پہلا نقطہ یہ تھا کہ قرآن و سنت کو انفرادی و اجتماعی زندگی کی بنیاد بنایا جائے**

پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کو فلسطین میں آباد کیا جائے گا۔ 1932ء میں فلسطین کے مفتیٔ اعظم نے جب برصغیر کا دورہ کیا اور وہاں کے مسلمانوں کو مسئلہ فلسطین سے آگاہ کیا تو آل انڈیا مسلم لیگ نے 1933ء میں اپنے اجلاس میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے خلاف ایک قرارداد پاس کی اور اس کے علاوہ متعدد بار اس مسئلے پر فلسطینیوں کے حق میں آواز بلند کی۔ 23 مارچ 1940ء کو جب برصغیر کے مسلمان لاہور میں اپنے مستقبل کے فیصلے کے لیے جمع ہوئے تو اس وقت بھی وہ اپنے فلسطینی بھائیوں کو نہ بھولے۔ اس اجلاس میں فلسطین کے بارے میں سمجھوتے کے لیے تاخیری حربوں پر تشویش کا اظہار کیا۔ 1937ء میں قائداعظمؒ نے لکھنؤ میں مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ فلسطین میں ابتدا ہی سے برطانوی حکومت کا رویہ عربوں کے ساتھ دھوکہ دہی پر مبنی رہا ہے۔ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ اب برطانوی حکومت فلسطین کو تقسیم کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس جہدوجہد میں فلسطین کے مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے ان مسلمان ممالک کی' جو آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے بھرپور حمایت کی۔ جب برصغیر کے مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا کہ برطانیہ، مصر، ترکی' فلسطین اور شام کے خلاف مداخلت کرنا چاہتا ہے تو مسلم لیگ نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ 1943ء میں مسلم لیگ نے لیبیا، فلسطین، شام، لبنان، مراکش، الجیریا کی آزادی کے لیے قرارداد منظور کی۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں نے جب ہالینڈ سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کوشش کی تو ہالینڈ کی فوجوں نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ قائداعظمؒ نے ہالینڈ کی مذمت کی۔

لیاقت علی خان نے فروری 1951ء میں موتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کے حصول کا اہم جز عالمی سطح پر اسلامی اخوت اور بھائی چارے کا قیام ہے۔ اس لیے پاکستان کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد اسلامی ممالک کے اتحاد کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔

مسئلہ فلسطین اور پاکستان

قیام پاکستان کے فوراً بعد جب پاکستان ستمبر 1947ء میں اقوام متحدہ کا ممبر بنا تو مسئلہ فلسطین جنرل اسمبلی کے زیر غور تھا۔ پاکستان کے نزدیک اعلان بالفور کی اہمیت نہ تھی۔ یہ اعلان عربوں کے ساتھ کئے گئے وعدے کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ پاکستان کا موقف تھا کہ فلسطین کے عوام اور پاکستان کی مرضی کے خلاف جنرل اسمبلی نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے دو ذیلی کمیٹیاں تشکیل کیں۔ پاکستان کو ذیلی کمیٹی نمبر 2 کا رکن مقرر کیا گیا۔ جب کمیٹی کے صدر مستعفی ہوئے تو پاکستان کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ پاکستان نے فلسطین کی تقسیم کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ فلسطینی عوام کو ایک آزاد ریاست کی صورت میں آزادی دی جائے مگر انگریز جنہیں امریکہ کی پوری حمایت حاصل تھی، فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ جنرل اسمبلی میں رائے شماری ہوئی تو فیصلہ تقسیم کے حق میں ہوا تو پاکستان کے نمائندے نے جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا کہ یہ اقوام متحدہ کا فیصلہ نہیں بلکہ امریکہ کا فیصلہ ہے۔ فلسطین کے لوگوں نے جب غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو یہودیوں نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے اسے کچل دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نکالا اور ان کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کرلیا۔ جب عربوں نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے اپنی فوجیں بھیجیں تو پاکستان کی تمام ہمدردیاں فلسطینی عوام کے ساتھ تھیں۔ 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجہ میں فلسطینی مہاجرین کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ لاکھوں فلسطینی مسلمانوں کے لیے اقوام متحدہ نے ایک فنڈ قائم کیا جس میں پاکستان نے بھی رقم جمع کروائی۔ نیز پاکستان نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اس مسئلے کا دائمی حل تلاش کیا جائے اور ان بے گھروں کو اپنے گھروں میں واپس جا کر آباد ہونے کا حق دیا جائے۔ جب 1956ء میں اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کی مدد سے فلسطین پر حملہ کیا تو پاکستان نے اقوام متحدہ کو جنگ بند کروانے کے لیے کہا۔ 1967ء میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ ہوئی تو پاکستان نے عربوں کی مالی امداد بھی کی۔ 1973 کی عرب اسرائیل جنگ میں پاکستان کی امداد کا اعتراف خود عربوں نے کیا۔ پاکستان نے روز اوّل سے فلسطینیوں کی اخلاقی، سیاسی اور مالی امداد کی۔

عالم اسلام سے روابط کے اقدامات

پاکستان نے نہ صرف مسلمان ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی، بلکہ عالم اسلام کے اتحاد کے لیے متعدد کوششیں کیں اور ان تمام کوششوں میں شریک رہا جو اس مقصد کے حصول کے لیے کی گئیں۔ پاکستان کی یہ خواہش رہی کہ تمام مسلمان ممالک مل جل کر اپنے مسائل حل کریں اور باہمی تعاون سے عالم اسلام کو ایک بار پھر ایک محرک اور فعال طاقت بنا دیں۔ پاکستان نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو کوششیں کیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

1۔ موتمر عالم اسلامی کا احیاء

موتمر عالم اسلامی کا قیام 1926ء میں مکہ میں عمل میں آیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی نے اس کے پہلے اجلاس میں جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ موتمر کا دوسرا اجلاس 1931ء میں بیت المقدس میں ہوا، جس میں علامہ محمد اقبال نے شرکت کی۔ اس کے بعد یہ تنظیم

آل انڈیا مسلم لیگ نے 1933ء میں اپنے اجلاس میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے خلاف ایک قرارداد پاس کی اور اس کے علاوہ متعدد بار اس مسئلے پر فلسطینیوں کے حق میں آواز بلند کی

تقریباً اٹھارہ برس تک گمنامی کی حالت میں رہی۔

آخر کار 1949ء میں اس کے احیاء کے لیے کراچی میں اس کا اجلاس بلایا گیا، جس کا افتتاح پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ اس کا صدر دفتر کراچی میں قائم ہو۔ فلسطین کے مفتی امین الحسینی کو موتمر کا صدر اور پاکستانی ڈاکٹر انعام اللہ خان کو اس کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔

2۔ بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس

1949ء میں مسلمان ممالک کے اقتصادی مسائل پر غور و خوض کرنے اور ان کے حل کی تدابیر سوچنے کے لیے کراچی میں مسلمان ممالک کے تجارتی اور صنعتی نمائندوں کی ایک کانفرنس بلائی گئی۔ گو کہ اس کی میزبانی کے فرائض پاکستان چیمبر آف کامرس نے ادا کیے مگر درحقیقت اس کانفرنس کو بھی حکومت پاکستان کی تائید و معاونت حاصل تھی۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو اقتصادی امور کے بارے میں تحقیق کرے۔ کانفرنس کا دوسرا اجلاس تہران میں 1951ء میں منعقد ہوا۔ تیسرا اور آخری اجلاس 1953 میں کراچی میں منعقد ہوا۔ پاکستان کی اس کوشش میں دیگر مسلمان ممالک نے اتنی سنجیدگی سے دلچسپی نہ لی جتنی کہ ایسے اہم مسئلے کے حل کے لیے ضروری تھی اور یوں پاکستان کی مسلمان ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون پیدا کرنے کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ بہرحال یہ کوشش اپنی نوعیت کی اولین کوشش تھی۔

اتحادِ عالم اسلام کے لیے کوشش کرنے کے دوران پاکستان کو مندرجہ ذیل مشکلات کا سامنا کرنا پڑا:

1۔ پاکستان نے اتحاد عالم اسلامی میں جو گہری دلچسپی ظاہر کی تو اس کے سبب کچھ مسلم ممالک کو یہ اندیشہ ہوا کہ پاکستان یہ سب کچھ عالم اسلام کی قیادت حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔

2۔ مسلمان ممالک کی اکثریت بھی اپنے اندرونی مسائل اور آزادی کی جدوجہد میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ ان کے پاس عالم اسلام کے اتحاد کی طرف توجہ دینے کی فرصت بھی نہ تھی۔

3۔ اس کے علاوہ مغربی سامراجی طاقتیں اور اشتراکی ممالک مسلمانوں کے ممکنہ اتحاد سے خائف تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ اتحاد و عالم اسلامی معرض وجود میں نہ آئے۔

4۔ مسلمان ممالک کا اتحاد بھارت کے لیے بھی ناقابل قبول تھا۔ مسلمانوں کے اتحاد سے پاکستان مضبوط تر ہو جاتا اور یہ بات بھارت کے عزائم میں رکاوٹ پیدا کر سکتی تھی۔

3۔ اسلامی کانگریس کا قیام

1953ء میں پاکستان نے مسلم ممالک کو سیاسی طور پر ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے مسلمان سربراہان مملکت کی ایک کانفرنس بلانے کی ناکام کوشش کی۔ 1954ء میں مکہ معظمہ میں شاہ سعود، صدر جمال عبدالناصر اور گورنر جنرل غلام محمد نے ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ اس میں طے پایا کہ اسلامی کانگریس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ اس کانگریس کا عارضی صدر مقام قاہرہ مقرر کیا گیا اور انور سادات کو اس کا سیکرٹری جنرل بنایا گیا۔ مگر یہ ادارہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا اور چند سالوں بعد ختم ہو گیا۔

4۔ رابطۂ عالم اسلامی کا قیام

1962ء میں مکہ معظمہ میں رابطۂ عالم اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ ادارہ سعودی عرب کی حکومت کی سرپرستی میں بنایا گیا۔ پاکستان نے اس کے قیام اور تنظیم کے معاملات میں گہری دلچسپی لی۔ رابطہ ایک فعال ادارہ ہے اور مسلمانوں کے مسائل کے حل میں سرگرم ہے۔ کراچی اس

کے ایشیائی حلقے کا صدر مقام ہے۔

5۔او آئی سی (اسلامی سربراہی کانفرنس)

مسلمان ممالک کی پہلی سربراہی کانفرنس مراکش کے شہر رباط میں ہوئی۔ اس نسبت سے اسے رباط کانفرنس بھی کہا جاتا ہے۔ جب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کی نیت سے اسے آگ لگائی تو اس سانحہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور اتحاد عالم اسلام کی ضرورت کا، جس کے لیے پاکستان اپنے قیام کے وقت سے کوشاں تھا، شدت سے احساس دلایا۔ چنانچہ متفقہ اور مربوط لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے مسلمان سربراہوں کی پہلی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں مسجد اقصیٰ کے واقعے اور فلسطین کے مسئلے پر غور و خوض کے علاوہ مسلمان ممالک کی ایک مستقل تنظیم بنانے پر بھی غور کیا گیا۔ چنانچہ اس سے اگلے سال جدہ میں مسلمان وزرائے خارجہ نے اپنے ایک اجلاس میں اسلامی سیکرٹریٹ کے قیام کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ وزرائے خارجہ کا اجلاس ہر سال بلایا جائے۔ اب تک اسلامی وزرائے خارجہ کے چودہ اجلاس اور ایک خصوصی اجلاس ہو چکا ہے۔

1973ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اس بات کی ضرورت پھر محسوس کی گئی کہ مسلمان سربراہان ایک بار پھر مل بیٹھیں اور تبادلۂ خیالات کریں۔ چنانچہ اس مرتبہ سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 1974ء میں پاکستان میں اس کانفرنس کا انعقاد پاکستان کی اتحاد عالم اسلامی کے لیے کوششوں کا اعتراف تھا۔ اس موقع پر اہلِ پاکستان خصوصاً اہل لاہور کی امنگوں کا حال دیدنی تھا۔ شاہی مسجد میں جمعہ کی نماز میں مسلم سربراہان مملکت کا سجدہ ریز ہونا اور پھر شاہ فیصل کے دعائیہ ہاتھ بلند ہونا، مسلم عوام کی دیرینہ اور مستقبل کی آرزوؤں کے مظہر بنے۔

تیسری سربراہی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس 1981ء کو مسجد الحرام کے صحن اور خانہ کعبہ کے سائے میں منعقد ہوا۔ حرم پاک میں سربراہانِ مملکت نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ قرآن وسنت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بنائیں گے اور عالم اسلام کے مسائل مثلاً فلسطین اور افغانستان کے حل کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کریں گے۔ مسلمان ممالک کے درمیان تنازعے باہمی افہام وتفہیم سے طے کیے جائیں گے۔ نیز مسلمان ممالک ایک دوسرے کی اعانت بھی کریں گے۔ اعلان مکہ مسلمانوں کے دور جدید کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز ہے۔ اس میں جو بنیادی اصول پیش کیے گئے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جن کے لیے پاکستان ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔

اِس وقت او آئی سی کے ارکان کی تعداد 57 ہے۔ اُمّہ کو پیش آنے والے مسائل ومعاملات پر اِس تنظیم کے سربراہوں اور وزرائے خارجہ کے اجلاس وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ تنظیم آج تک امہ کے مسائل کے حل کے لئے کوئی کردار ادا نہ کرسکی۔ وجہ صاف ظاہر ہے مسلمانوں کے حکمرانوں صلیبی طاقتوں کے منظورِ نظر ہیں، اور اپنے عوام میں اُن کی پذیرائی نہیں، کہ وہ عوام کی امنگوں کے مطابق اپنی خارجہ پالیسیوں کو ترتیب دے سکیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پاکستان دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہے اور وہ ہر قسم کے سائنسی تجربات، جن میں ایٹم بم، مصنوعی خلائی سیارے، میزائل وغیرہ شامل ہیں، کر چکا ہے۔ اسی وجہ سے او آئی سی کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کمیٹی (کومسٹیک) کا دفتر اسلام آباد میں ہے۔ اس کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر پروفیسر عطاالرحمٰن ہیں جو ہائر ایجوکیشن کمیشن کے چیئرمین بھی ہیں۔ اِس کمیٹی کے سیکرٹری اور مُشیر پاکستان کے نامور ماہر حیاتیات ڈاکٹر انور نسیم ہیں۔

پاکستان کی ہر حکومت کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ مسلم ممالک سے بہتر سے بہتر تعلقات قائم کرے۔ پاکستان کے مسلم ممالک سے تجارتی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور دفاعی تعلقات کی تفصیل اس طرح ہے۔

تیسری سربراہی کانفرنس میں حرم پاک میں سربراہانِ مملکت نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ قرآن وسنت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بنائیں گے اور عالم اسلام میں جارحیت کا شکار خطوں مثلاً فلسطین اور افغانستان کے جہاد کا راستہ اختیار کریں گے۔

پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات

سعودی عرب ان ممالک میں شامل ہے، جنھوں نے ہر آڑے وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔ پاک سعودی تعلقات کا آغاز قیام پاکستان سے قبل ہی ہو چکا تھا۔

1947ء میں پاکستان آزاد ہوا تو سعودی عرب نے اسے فوراً تسلیم کرلیا اور اپنے سفارتی تعلقات کا آغاز کر دیا۔ 1951ء میں شاہ سعود نے پاکستان کا دورہ کیا۔ جس سے تعلقات میں مزید مضبوطی آئی۔ انھوں نے مہاجرین کی آبادکاری کے لیے کراچی میں ایک کالونی کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کا نام انھی کی مناسبت سے سعود آباد رکھا گیا۔ 1956ء میں سکندر مرزا اور 1960ء میں صدر ایوب نے سعودی عرب کے دورے کیے، جس سے تعاون کی مزید راہیں کھلیں۔ 1964ء میں شاہ فیصل سعودی فرمانروا بنے تو دونوں ملکوں کے تعلقات میں مزید گرم جوشی آ گئی۔ شاہ فیصل نے مسئلہ کشمیر پر کھل کر پاکستانی موقف کی حمایت کی۔ انھوں نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی دل کھول کر پاکستان کی امداد کی۔ یہ امداد اخلاقی، مادی، سیاسی اور روحانی پہلوؤں پر مشتمل تھی۔ حجاز مقدس میں پاکستانی مسلمانوں کی سرخروئی کے لیے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں سعودی عرب نے بھارت کے سازشی اور گھناؤنے کردار کی شدید مذمت کی اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو ''بین الاقوامی سازش'' قرار دیا۔ شاہ فیصل سے پاکستانی عوام والہانہ محبت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھیں 1975ء میں شہید کر دیا گیا تو پاکستان میں صف ماتم بچھ گئی اور سرکاری وعوامی سطح پر سوگ منایا گیا۔ پاکستان نے ان کی یاد میں اپنے شہر لائل پور کا نام تبدیل کر کے فیصل آباد رکھ دیا اور پاکستان میں سعودی امداد سے دنیا کی سب سے بڑی مسجد جو اسلام آباد میں تعمیر کی گئی، اس کا نام فیصل مسجد رکھا گیا۔

سعودی عرب نے پاکستان کی مالی اور اقتصادی تعاون میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ 88-1980ء کے دوران پاکستان کو سب سے زیادہ بیرونی امداد سعودی عرب سے ملتی تھی۔ سعودی عرب نے پاکستان کی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت کئی مشترکہ منصوبے دونوں ملکوں کے درمیان جاری ہیں۔ پاکستان نے جہاز رانی، سیمنٹ، ایلومینیم، کھاد اور آئل ریفائنری کے منصوبے سعودی تعاون سے مکمل کیے۔ سعودی عرب پاکستان کے ان چند مخلص دوستوں میں سے ہے جس نے پاکستان کی مسئلہ کشمیر پر ہمیشہ بغیر کسی مفاد کے حمایت کی ہے۔ سعودی عرب کے تقریباً تمام حکمرانوں نے پاکستان کا سرکاری دورہ کیا ہے۔ 1974ء میں شاہ فیصل لاہور آئے اور اسلامی کانفرنس کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 1979ء میں شاہ خالد پاکستان آئے اور 1980ء میں شاہ فہد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ موجودہ حکمران شاہ عبداللہ بھی پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ پاکستان کے لاکھوں مسلمان ہر سال حج کے موقع پر خانہ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے لیے سعودی عرب جاتے ہیں۔

سعودی عرب نے 1980ء تک پاکستان کو تقریباً پانچ ارب روپے کی امداد دی ہے۔ سعودی عرب پاکستان کو رعایتی نرخوں پر تیل بھی فراہم کرتا ہے۔ پاکستان نے

سعودی عرب سے محبت کے اظہار کی بنا پر کئی شاہراہوں کا نام شاہ فیصل کے نام پر رکھا ہے۔ صنعتی شہر لائل پور کا نام فیصل آباد اور اسلام آباد میں فیصل مسجد اس کی واضح مثال ہے۔ فیصل مسجد کے تمام اخراجات سعودی حکومت نے برداشت کیے ہیں۔

جب پاکستان میں ضیاء الحق کے دور میں نفاذ اسلام کا عمل شروع ہوا اور نظام زکوٰۃ کو متعارف کروایا گیا تو سعودی عرب نے فوری طور پر دو کروڑ روپیہ بطور زکوٰۃ فنڈ دیا۔ سعودی عرب نے افغان مہاجرین کے لیے بھی خطیر مالی امداد فراہم کی ہے۔ مختصر یہ کہ پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات مثالی ہیں اور ان میں ہر دور میں اضافہ ہوا ہے۔

تیسری مسلم سربراہی کانفرنس

اس کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی جنرل ضیاء الحق نے کی، جن کی تجویز پر شاہ خالد کو اس کانفرنس کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ اس کانفرنس میں عراق ایران جنگ کے خاتمے کے لیے ایک آٹھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں پاکستان کو بھی شامل کیا گیا۔ اس کانفرنس میں اسلامی ممالک میں ترقیاتی سکیموں کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا جس میں تین ارب ڈالر جمع ہوئے۔ اس کانفرنس میں صدر ضیاء الحق نے مسئلہ کشمیر کا بھی ذکر کیا اور مسلم ممالک کی کھوئی ہوئی حیثیت کو بحال کرنے کے لیے صدر ضیاء الحق نے درج ذیل فارمولا پیش کیا۔

1۔ اسلامی سربراہی سطح پر قرآن و سنت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بنانے کا عہد کیا گیا۔

2۔ مسلمان ممالک کے درمیان تنازعات کو باہمی افہام و تفہیم سے حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

3۔ ضرورت پڑنے پر جہاد کا راستہ اپنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

پاکستان اور ترکی کے تعلقات

پاکستان اور ترکی کے تعلقات حکومتی سطح سے ہٹ کر عوامی سطح پر بڑے پرتپاک ہیں اور قیام پاکستان سے قبل بھی دونوں خطوں کے عوام ایک دوسرے سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بلقانی ریاستوں کا مسئلہ ہو یا خلافت عثمانیہ کو خطرہ، ہندوستانی مسلمانوں نے غلام ہونے کے باوجود تحریک خلافت چلا کر جو عظیم قربانیاں دی ہیں وہ آج بھی تاریخ کے اوراق میں درخشندہ مثال ہیں۔ 1955ء میں ترکی کے صدر جلال بایا پاکستان کا سرکاری دورہ کرنے والے پہلے ترک حکمران تھے۔ انھوں نے اپنے دورے کے بعد تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان جیسی عظیم قوم سے برادرانہ تعلقات پر ترک قوم فخر کرتی ہے"۔ ترکی اور پاکستان مشترکہ طور پر دفاعی معاہدے سینٹو میں شریک رہے ہیں، جس سے قریبی تعلقات مزید مستحکم ہوئے۔

1964ء میں پاکستان، ایران اور ترکی کے درمیان ہونے والا RCD کا معاہدہ جو میثاق استنبول بھی کہلاتا ہے، ترکی میں ہی طے پایا تھا۔ جہاں صدر ایوب، رضا شاہ پہلوی اور جمال گرسل اکٹھے ہوئے تھے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ترکی نے پانچ لاکھ ڈالر کا فوجی سامان بھیج کر حق دوستی ادا کیا تھا۔ دونوں ممالک نے اقتصادی تعاون کے لیے کوششیں کی ہیں۔ جنوری 1988ء میں اسلام آباد میں تجارتی عدم توازن دور کرنے کی لیے ایک معاہدے پر دستخط کیے گئے۔

1992ء میں ترکی، ایران اور پاکستان کی مشترکہ کوششوں سے اقتصادی تعاون کی تنظیم (ایکو) کو وسعت دی گئی اور وسط ایشیا کی چھ نو آزاد مسلم ریاستوں کو تنظیم کا رکن بنایا گیا۔ اب اس تنظیم کے رکن ممالک کی تعداد دس ہوگئی ہے۔

پاک ایران تعلقات

ایران نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا قریبی ہمسایہ ہے بلکہ لسانی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے بھی دونوں ممالک مضبوط بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

پاک ایران تعلقات کی موجودہ بنیاد اس وقت رکھی گئی جب 1941ء میں غیر ملکی طاقتوں نے ایران پر غاصبانہ قبضہ کیا تو آل انڈیا مسلم لیگ نے اس کی بھرپور مذمت کی۔ 1947ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو نئے ملک پاکستان کو ایران نے فوراً تسلیم کرلیا اور سفارتی تعلقات کا آغاز کیا گیا۔

1950ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی دعوت پر شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی نے پاکستان کا پندرہ روزہ دورہ کیا تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ پاکستان امریکی دفاعی معاہدوں سینٹو، سیٹو میں شامل ہوا تو دونوں ملکوں کی دوستی مزید گہری ہوگئی کیونکہ ایران بھی ان معاہدوں کا رکن تھا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ایران نے پاکستان کا ساتھ دیا اور رن کچھ کے جھگڑے میں پاکستان نے ایک ایرانی نصر اللہ کو ٹریبونل کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کرکے ایران پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ 1964ء میں آر۔سی۔ڈی (جو کہ بعد ازاں ای۔سی۔او کہلایا) کا معاہدہ پاکستان، ایران اور ترکی کے مابین ہوا۔ جس کے تحت رکن ممالک تجارت، صنعت، زراعت اور مواصلات کے شعبوں میں ایک دوسروں سے تعاون کریں گے۔

1980ء میں ایران، عراق جنگ چھڑی تو پاکستان نے جنگ بندی کے لیے مصالحتی کردار ادا کیا اور عالم اسلام نے پاکستانی صدر کو اپنا نمائندہ بنا کر جنگ بند کروانے کا ٹاسک سونپا۔ اس وقت سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات گرم جوشی پر مشتمل ہیں۔ پاکستان، ایران سے تیل درآمد کرتا ہے جب کہ ایران پاکستان سے چاول، سوتی دھاگہ، کپڑے، کھیلوں کا سامان اور کپاس وغیرہ خریدتا ہے۔

انڈونیشیا کے ساتھ تعلقات

انڈونیشیا کا پرانا نام "جزائر شرق الہند" تھا۔ اس لیے کہ یہ مختلف جزائر پر مشتمل ہے۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد انڈونیشیا دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست بن گئی ہے۔ 27 صوبوں پر مشتمل ملک کا دارالحکومت جکارتہ ہے۔ مالی وسائل کے لحاظ سے انڈونیشیا دنیا کا پانچواں امیر ملک ہے۔ یہ 1942ء تک ہالینڈ کی نوآبادی رہا۔ بعد ازاں 1945ء تک جاپان اس پر قابض رہا۔

1949ء میں قوم پرست غالب آگئے اور احمد سوئیکارنو اس کے پہلے صدر بنے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے انڈونیشیا سے تعلقات تقسیم ہند سے قبل ہی قائم ہو چکے تھے۔ وہ اس صورت میں کہ انڈونیشیا نے اپنی آزادی کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کو مدد دینے کا کہا تھا جس پر قائد اعظم نے ہندوستانی مسلمانوں کو انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں شرکت کے لیے جہاد کا پیغام دیا، جس پر چھ سو فوجی یہاں سے گئے۔ جن میں پانچ سو نے شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔

انڈونیشیا کے صدر احمد سوئیکارنو دو مرتبہ پاکستان آئے اور دوستی اور باہمی تعاون کے کئی سمجھوتے عمل میں آئے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں انڈونیشیا نے کھل کر پاکستان کا ساتھ دیا۔ انڈونیشی عوام نے بھارتی سفارت خانے کے سامنے مسئلہ کشمیر اور پاکستان کی افغان پالیسی پر پاکستان کے حق میں احتجاجی مظاہرے کیے۔ مسئلہ کشمیر، پاکستان کی افغان پالیسی اور امت مسلمہ کو درپیش دوسرے عالمی مسائل کے لیے دونوں ملکوں کا نقطۂ نظر ہمیشہ مشترک رہا ہے۔ دونوں ملک اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔

پاک لیبیا تعلقات

لیبیا نے پاکستان کے بعد آزادی حاصل کی مگر دونوں ملکوں کے تعلقات آزادی سے قبل ہی قائم ہو گئے تھے۔ لیبیا پہلے خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ خلافت کے خاتمے کے بعد فرانس اور اٹلی کا اس پر تسلط قائم ہوگیا۔ تاہم 1951ء میں لیبیا نے فرانس کی غلامی سے رہائی پائی۔ پاکستان لیبیا کو آزاد کرنے والے اقوام متحدہ کے کمیشن کا سرگرم رکن تھا۔

پاکستان کے لیبیا کے ساتھ موجودہ تعلقات کا آغاز 1969ء میں ہوا جب کرنل معمر قذافی نے شاہ ادریس کی حکومت کا خاتمہ کرکے لیبیا میں عوامی انقلابی حکومت قائم کی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو برسراقتدار آئے تو ان تعلقات میں زیادہ گرم جوشی آ گئی کیونکہ دونوں سربراہان مملکت کے سوچ کے زاویے باہم ملتے تھے۔1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد پاکستانی معیشت کو سہارا دینے کے لیے لیبیا نے بھرپور کردار ادا کیا۔لیبیا نے مسئلہ کشمیر پر بھی پاکستانی موقف کی حمایت کی۔ 1974ء میں ہی دونوں ملکوں نے معاہدے کے تحت وزارتی کمیشن تشکیل دے کر مشترکہ سرمایہ کاری، بینکاری کے کئی سمجھوتے کیے۔لیبیا تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔وہ اپنے وسائل پاکستان کو مہیا کرتا ہے۔جب کہ پاکستان ڈاکٹر، انجینئر، اساتذہ اور ہنر مند بھیج کر لیبیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مصر کے ساتھ تعلقات

مشرق وسطیٰ کے ممالک میں مصر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔مصر سے اٹھایا جانے والا ہر قدم مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کو بھی متاثر کرتا ہے۔پاکستان اور مصر کے عوام اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی بناء پر ایک دوسرے کے لیے مثبت سوچ رکھتے ہیں۔

انور سادات کے دور میں تعلقات میں مثبت تبدیلی آئی۔1987ء میں جب بھارت نے پاکستانی سرحدوں پر فوجیں جمع کرنا شروع کیں تو مصر نے اسے کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھا۔مصری صدر حسنی مبارک نے بذات خود راجیو گاندھی کو فوج کشی سے منع کیا۔عالمی سطح پر روز بروز تبدیل ہونے والی صورتحال اور خصوصاً سوویت یونین کے خاتمے کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات میں تبدیلی آئی ہے۔اس طرح اب دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہیں۔

بنگلہ دیش سے تعلقات

پاکستان اور بنگلہ دیش نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کی تھی۔ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کا قیام بھی ڈھاکہ ہی میں عمل میں آیا تھا۔1947ء سے لے کر 1971ء تک دونوں ایک ہی تھے مگر اپنوں کی غلطی اور غیروں کی سازش کی بناء پر ملک کا مشرقی حصہ کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔پاکستان نے فروری 1974ء میں لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران برادر اسلامی ملکوں کے زور دینے پر بنگلہ دیش کو الگ وطن کے طور پر تسلیم کرلیا۔پاکستان اور بنگلہ دیش کے عوام نے ایک مشترکہ نصب العین کے لیے جدوجہد کی تھی۔ان کے دل آج بھی ایک دوسرے کے لیے دھڑکتے ہیں۔دونوں علاقائی تنظیم سارک کے فعال رکن ہیں بلکہ سارک کی بنیاد بنگلہ دیشی صدر ضیاء الرحمن ہی نے رکھی تھی۔ علاقائی امور پر دونوں ملکوں کا موقف یکساں ہوتا ہے۔

وسط ایشیا کی ریاستیں اور پاکستان

1991ء میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد وسط ایشیا کی مسلمان ریاستیں آزاد ہوئیں تو پاکستان نے انھیں فوراً تسلیم کرکے تعلقات قائم کرلیے۔ان ریاستوں کے ساتھ پاکستان کی قدیم ثقافتی نسبت ہے' تاشقند جو کہ ازبکستان کا دارالحکومت ہے' مسلم تہذیب وادب کا گہوارہ ہے اور مغل فرمانرواں کا مسکن اوّل بھی۔ اسی طرح آذربائیجان، تاجکستان، ترکمانستان، قازقستان اور ان کے شہر ثمرقند، اور بخارا قدیم اسلامی تہذیب کے بڑے مرکز رہے ہیں۔ پاکستان نے ان ریاستوں کو راہداری کی سہولت مہیا کی ہے۔یہ آزاد ریاستیں اپنے مذہب، ثقافت، رسم ورواج اور نظریات کے لحاظ سے پاکستان سے قریبی تعلقات رکھتی ہیں۔

متحدہ عرب امارات اور دیگر خلیجی ریاستوں سے تعلقات

متحدہ عرب امارات کی ریاستیں آزادی حاصل کرنے سے قبل برطانیہ کے زیر تسلط تھیں۔دسمبر 1971ء میں برطانیہ نے خلیج فارس سے اپنے فوجی اڈے ختم کرنے کا اعلان کیا تو سات ریاستوں کا وفاق قائم ہوا جس کا دارالحکومت ابوظہبی قرار پایا۔یہ عرب ریاستیں معدنی تیل کی دولت سے مالا مال ہیں اور پاکستان کے ساتھ تعلقات انتہائی دوستانہ وبرادرانہ ہیں۔

مذکورہ ممالک کے علاوہ پاکستان کے قطر، شام، مراکش، سوڈان، ملائیشیا، برونائی، نائجیریا، جبوتی اور کویت سے خصوصی تعلقات قائم ہیں۔یہاں یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ پاکستان کا دورہ کرنے والے پہلے غیر ملکی سربراہ مملکت امیر کویت ہی تھے جو ستمبر 1947ء میں پاکستان آئے۔یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے تقریباً تمام اسلامی ممالک سے خوشگوار تعلقات ہیں۔اس لیے کہ ان کی بنیادیں سیاسی مفادات کی بجائے اسلامی اخوت کے جذبوں پر قائم ہیں۔

مسئلہ فلسطین موجودہ عالمی مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ ہے جو گزشتہ ایک صدی سے حل طلب ہے۔اس کے حل کے لیے جو کوششیں کی گئیں انھیں بین الاقوامی سازش کے تحت ناکام بنایا جاتا رہا ہے۔

عرب اسرائیل جنگوں میں پاکستان کا کردار

عرب اسرائیل جنگوں میں حکومتی وعوامی سطح پر پاکستان نے اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کی شدید مذمت کی اور عربوں کی کھل کر حمایت کی۔1956ء، 1958ء اور 1973ء میں اسرائیل نے جو جارحانہ کارروائیاں کیں، پاکستان نے اقوام متحدہ، او۔آئی۔سی اور دیگر پلیٹ فارموں پر فلسطینی عوام کی آواز میں آواز ملا کر اسے قوت بخشی۔ فلسطینی عوام کی جنگ آزادی کی حمایت کی گئی اور پاکستان سربراہوں نے فلسطینی رہنماؤں سے مل کر مشترکہ پریس کانفرنسوں، اعلامیوں اور انٹرویوز کے ذریعے اظہار یکجہتی کیا۔ 1982ء میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد لبنان میں موجود فلسطینی کیمپوں میں قتل عام کیا تو پاکستان نے ان دونوں اقدامات کی شدید مذمت کی۔ 1958ء میں اسرائیلی طیاروں نے تیونس میں فلسطینیوں کی حریت پسند تنظیم پی۔ایل۔او (Palestinian Liberation Organization) کے مرکزی دفتر پر حملہ کیا تو پاکستان نے اس واقعہ کو شرمناک قرار دیا۔

فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنا

نومبر 1988ء میں پی ایل او کی زیر قیادت فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان ہوا تو پاکستان نے اسے فوری تسلیم کرلیا۔

اسرائیل، روز اوّل ہی سے عرب علاقوں پر مزید یہودی بستیاں قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جب کہ فلسطینی اس کے شدید مخالف ہیں۔یاسر عرفات نے جولائی 1998ء میں چین کا دورہ کیا۔یاسر عرفات چین جاتے ہوئے واپسی پر پاکستان ٹھہرے اور وزیر اعظم نواز شریف سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔یاسر عرفات نے پاکستان کے ایٹمی قوت بننے پر بھی پاکستان کو مبارک باد دی اور حکومت کی طرف سے فلسطینی عوام کی حمایت مسلسل جاری رکھنے پر شکریہ بھی ادا کیا۔انھوں نے خیر سگالی کے جذبات کے طور پر کشمیری عوام کی کھل کر حمایت کی اور پاکستانی موقف کو جائز قرار دیا۔ گزشتہ انتخابات میں فلسطین میں مزاحمتی تنظیم حماس نے بھرپور کامیابی حاصل کی۔یورپ وامریکہ چراغ پا ہو گئے۔ فلسطینی حکومت کی امداد بند کردی اور سازشوں سے بالآخر حماس حکومت ہی کا خاتمہ کردیا،مگر پاکستان کا روز اول سے یہ موقف رہا ہے کہ عوامی حمایت سے برسراقتدار آنے والی ہر پارٹی کو حکومت کا موقع ملنا چاہیے۔اُس کی راہ میں عالمی طاقتیں روڑے نہ اٹکائیں۔

پاکستان کا دفاع اور خارجہ تعلقات

پاکستان معرض وجود میں آتے ہی کئی مسائل میں گھر گیا۔ اس کے حصے میں برطانوی ہند کی سرحدوں کے مسائل آئے۔ مزید برآں ہندوستان کے ساتھ طویل سرحدوں نے گوناگوں مسائل پیدا کیے۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کو چین، افغانستان، ایران، برما اور ہندوستان سے سرحدوں کے دفاع کے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔ چونکہ افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ تعلقات شروع سے اچھے نہیں تھے اس لیے یہ ممالک شروع ہی سے پاکستان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ سب سے بڑی بات پاکستان کے دونوں حصوں میں طویل جغرافیائی دوری تھی جس نے ان مسائل کو مزید گھمبیر بنا دیا۔

شروع سے معاشی طور پر پاکستان کمزور تھا۔ بھارت نے پاکستانی حصے کی رقم پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کا خزانہ خالی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ لاکھوں مہاجرین کی آمد سے معیشت کا توازن بگڑ گیا۔ ملک میں نہ کوئی صنعت تھی، نہ قابل انتظامیہ۔ دفاعی اخراجات کے لیے رقم نہ ہونے کے برابر تھی اور پھر خوراک کے مسائل ملک کی الجھنوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

دفاعی اور معاشی مشکلات کے ساتھ ساتھ پاکستان کو افغانستان اور بھارت کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بھارت نے کبھی بھی نظریۂ پاکستان کو تسلیم نہ کیا اور شروع سے بھارتی حکومت اور رہنماؤں کی کوشش یہ رہی ہے کہ ہر حربہ استعمال کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔ افغانستان نے پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبے میں گڑبڑ پھیلانے کی بڑی کوشش کی، تاکہ اس صوبہ کو اپنے ملک میں شامل کیا جا سکے۔ جب افغانستان نے یہ محسوس کیا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے تو اس نے آزاد پختونستان کا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔

اوپر بیان کیے گئے دفاعی، معاشی، اندرونی اور بیرونی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنی سلامتی کے تحفظ کے لیے اقدامات کرے۔ لیکن آزادی کے وقت پاکستان کے وسائل بہت کم تھے۔ اگر پاکستان بیرونی طرف توجہ دیتا تو اندرونی ترقی رک جاتی اور اگر دفاع کو نظرانداز کر کے اندرونی ترقی پر توجہ ہوتی تو خود ملک کو بیرونی خطرہ لاحق تھا۔ غرضیکہ عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

پاکستان کے بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات زیادہ تر اس وجہ سے تھے کہ اپنے آپ کو بیرونی خطرات سے محفوظ کرے۔ امریکہ، چین اور روس کے ساتھ تعلقات کا جائزہ اس حقیقت کا برملا اظہار ہے کہ وہ اپنی سلامتی کے لیے کس حد تک تگ و دو کرتا رہا ہے۔

پاکستان اور امریکہ

قیام پاکستان کے وقت سے امریکہ بھارت سے نسبتاً بہتر تعلقات کا خواہاں رہا ہے جس کی ایک بڑی وجہ بھارت کی وسعت آبادی اور وسائل تھی۔ ماضی میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات مضبوط اور دوستانہ رہے ہیں۔ 1950-60ء میں دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ لیکن اس کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات مختلف مراحل سے گزرتے رہے۔

ابتدا میں امریکہ نے برصغیر کے ملکوں کی طرف غیر جانبدار پالیسی بنائی۔ امریکی عوام اور حکومت گاندھی اور نہرو کے آزادی حاصل کرنے کے کردار سے زیادہ متاثر تھے اور قائداعظم کے پاکستان حاصل کرنے کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیکن سرد جنگ کی وجہ سے بین الاقوامی کشیدگی بڑھی اور ساتھ ساتھ نہرو کی غیر جانبداری کی پالیسی نے امریکہ کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں اپنی پالیسی پر نظرثانی کرے۔

مئی 1950ء میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے امریکہ کا دورہ کیا۔ لیاقت علی خان کے دورے نے امریکی عوام کے ان شبہات کو دور کرنے میں بڑی مدد دی جو وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست سمجھ کر اپنے ذہنوں میں لیے ہوئے تھے۔ لیاقت علی خان نے اپنی تقریروں میں کمیونزم کو اسلام کے منافی نظام قرار دیا اور ساتھ ساتھ انھوں نے ان امریکی کوششوں کو سراہا جو اس نظام کو ختم کرنے میں کر رہا تھا۔ اس سے امریکہ نے پاکستان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا شروع کر دیا۔

جون 1950ء میں شمالی کوریا کی فوجیں جنوبی کوریا میں داخل ہو گئیں۔ پاکستان نے اس حملہ کو جارحیت قرار دیا اور اس کی پرزور مذمت کی جب کہ بھارت نے خاموشی اختیار کر لی۔ مزید برآں بھارت نے مشرق بعید میں امریکی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا' باوجودیکہ امریکی حکومت بھارت کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس وجہ سے بھارت کی اہمیت کم ہونے لگی۔ 1951ء میں جب جاپان نے معاہدہ امن پر دستخط کیے پاکستان نے اس قوم کی حوصلہ افزائی کی جبکہ بھارت نے تنقید کی۔ 1953ء میں آئزن ہاور امریکہ کے صدر بن گئے۔ نئی ریپبلکن حکومت نے پاکستان کی زیادہ مدد کرنی شروع کر دی۔ مئی 1953ء میں امریکہ کے وزیر خارجہ جان ڈلس پاکستان کے دورے پر آئے تو انھوں نے امریکہ اور پاکستان کے مضبوط تعلقات کی اہمیت پر زور دیا۔

پاکستان کے سابق صدر ایوب خان شروع سے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدہ چاہتے تھے بقول ان کے جب 1951ء میں بھارت نے پاکستانی سرحدوں پر فوجیں جمع کیں تو دفاعی معاہدے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔

بھارت کا جارحانہ رویہ، جغرافیائی حیثیت اور پاکستان کے دونوں حصوں کی باہمی دوری نے ایوب خان کی سوچ کو مزید پختہ کردیا۔ اس قسم کی سوچ اس وقت کے پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ کے ذہن میں بھی تھی، اگرچہ معاشی امداد کے وہ زیادہ خواہاں تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان کی معیشت کو سنوارنے کے اقدامات حوصلہ افزا تھے۔ کیونکہ ان میں پاکستانی دفاعی ضروریات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ اس بات نے پاکستان کے رہنماؤں کو امریکہ سے مزید بہتر تعلقات بنانے پر مجبور کیا۔

سینٹو اور سیٹو کے معاہدے

1954ء میں پاکستان اور امریکہ نے باہمی امداد کا معاہدہ کیا، جس کی رو سے امریکہ نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ پاکستان کی افواج کو اسلحہ مہیا کرے گا اور تربیت دے گا۔ اس سال پاکستان فیلا کے دفاعی معاہدہ (سیٹو) میں شامل ہوا۔ اگلے سال بغداد کا معاہدہ ہوا جو بعد میں سینٹو کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ پاکستان نے بڑی خوشی سے اس معاہدے میں شمولیت کی لیکن مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات ہمیشہ مقدم رہے۔ چنانچہ اب پاکستان امریکہ کے ساتھ تین دفاعی معاہدوں میں شامل ہوگیا۔ پاکستان اور امریکہ دونوں ان معاہدوں کی وجہ سے محسوس کرنے لگے کہ ان کے اپنے قومی مفاد بہتر طریقے سے پورے ہو رہے ہیں۔ پاکستان کو ہمیشہ بھارت سے خطرہ رہا اور وہ اپنے طور پر دفاع کرنے سے قاصر تھا اور عدم تحفظ پاکستانی ترقی پر بہت زیادہ اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس لیے امریکی امداد نے پاکستان کو بروقت سہارا دیا۔ 1950ء کے مرحلے میں امریکی روس سے خوف زدہ تھے اور کمیونزم کو پھیلانے سے روک رہے تھے۔ امریکہ کو پاکستان ایک ایسا ملک ملا جو کہ اس کے ساتھ ان کوششوں میں شریک تھا۔

1962ء تک پاکستان کے امریکہ کے ساتھ تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ضرور مدنظر رکھنی چاہیے کہ پاکستان کو ان تعلقات کی امریکہ سے شاید زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ معاہدوں میں شمولیت کی وجہ سے روس نے پاکستان کے خلاف دشمنی شروع کردی۔ پاکستان عربوں اور افریقی و ایشیائی قوموں میں غیر مقبول ہوگیا۔ مزید برآں کشمیر کا مسئلہ ان معاہدوں میں شمولیت سے مزید بگڑ گیا۔ بھارت نے رائے شماری کا وعدہ پورا کرنے سے انکار کردیا اور امریکیوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے بھارت کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ بھارت کو امریکی معاشی امداد پاکستان سے کہیں زیادہ ملتی رہی۔

1960ء کے شروع میں امریکی پالیسی برائے جنوبی ایشیاء میں تبدیلی آنے لگی۔ پاکستان امریکہ سے بدظن ہونے لگا۔ تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ ڈیموکریٹک صدر کینیڈی کا برسر اقتدار آنا تھا۔ کینیڈی کا غیر جانبدار تحریک کی طرف نظریہ بالکل مختلف تھا۔ امریکہ نے اس تحریک کو بنیادی طور پر تسلیم کرلیا۔ جس کی وجہ سے خود بخود امریکی پالیسی بھارت کی جانب بڑی تیزی سے تبدیل ہونے لگی۔ 1962ء میں ہندوچین جنگ کی وجہ سے بھارت نے مغرب سے فوجی امداد کی اپیل کی۔ امریکہ کی قیادت میں مغربی دنیا نے پاکستان کے اس احتجاج کے باوجود کہ یہ فوجی

بھٹو نے جب ایٹمی پلانٹ کی فرانس سے بات چیت چلائی تو امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خاصے بگڑتے چلے گئے۔ امریکہ نے فرانس پر سفارتی دباؤ ڈالا کہ پاکستان کے ساتھ وہ معاہدہ توڑ ڈالے

سازوسامان ایک روز پاکستان کے خلاف استعمال ہوگا، بھارت کو بڑی مقدار میں اسلحہ دینا شروع کردیا۔ پاکستان کے خدشات 1965ء میں درست ثابت ہوئے۔ بھارت نے مغربی دنیا سے چین سے خطرہ کے نام پر حاصل کیا ہوا اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال کیا۔

1965ء کی جنگ اور امریکہ

1965ء کی جنگ کے بعد پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ اس کی بنیادی وجہ امریکہ کی 1965ء میں پاک بھارت پالیسی ہے۔ امریکہ نے تو پاکستان کی فوجی امداد بند کردی لیکن بھارت متواتر سوویت یونین سے اسلحہ حاصل کرتا رہا۔ امریکہ نے اس بات کو بھی مدنظر نہ رکھا کہ پاکستان کا فوجی اسلحہ حاصل کرنے کا ذریعہ صرف امریکہ ہے جب کہ بھارت دو طاقتوں امریکہ اور روس دونوں سے اسلحہ حاصل کرتا رہا۔ امریکہ کی اسلحے کی پالیسی نے پاکستان کے مفاد کو بہت زیادہ نقصان دیا 1965ء میں امریکہ نے برصغیر کے لیے اسلحہ کی نئی پالیسی کا اعلان کیا، جس کا بنیادی مقصد اسلحہ کی دوڑ کو روکنا تھا۔ اس سے پھر پاکستان کو ہی نقصان اٹھانا پڑا۔ پاکستان کو تو کچھ نہ ملا مگر بھارت مغرب اور روس سے اسلحہ سمیٹتا رہا۔ نئی پالیسی اپنے مقاصد حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔

پاکستان کو اپنی پالیسی پر نظرثانی کا خیال اسے دوطرفہ دوستی کی پالیسی کی طرف لے گیا۔ اس پالیسی کی مدد سے تمام بڑی طاقتوں سے اچھے تعلقات قائم کیے۔ اس وجہ سے پاکستان سیٹو اور سینٹو سے آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا اور آخرکار ان کو خیرباد کہہ گیا۔ 1970ء سے پاکستان کے امریکہ کے ساتھ ایسے دوستانہ تعلقات نہیں جیسے 1950ء یا 1960ء کے شروع میں تھے۔ اگرچہ 1971ء کی جنگ میں امریکہ نے معمولی دباؤ بھارت پر ڈالا مگر وہ بھی بے اثر اور بغیر کسی نتیجہ کے رہا۔

1971ء میں بھٹو پاکستان کے صدر بنے۔ بھٹو کے دور حکومت میں دوطرفہ پالیسی پر عمل کیا گیا۔ بھٹو نے جب ایٹمی پلانٹ کی فرانس سے بات چیت چلائی تو امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خاصے بگڑتے چلے گئے۔ امریکہ نے فرانس پر سفارتی دباؤ ڈالا کہ پاکستان کے ساتھ وہ معاہدہ توڑ ڈالے۔ بھٹو کی ان کوششوں نے جو کہ وہ تیسری دنیا کو اکٹھے کرنے میں کر رہے تھے جلتی پر تیل کا کام کیا اور امریکہ نے کھلی دشمنی کی پالیسی اختیار کرلی۔ جنرل ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے سے دوبارہ تعلقات بہتر ہونے لگے۔ اگرچہ خصوصی تعلقات والا دور تو نہیں لیکن پھر بھی تعلقات بہتر رہے ہیں۔

پاکستان اور سابق سوویت یونین

سوویت یونین کی پالیسی برصغیر جنوبی ایشیا میں بدلتی رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سوویت یونین بھارت اور پاکستان دونوں کو سامراج کا پٹھو تصور کرتا تھا۔ جب کانگریس اور مسلم لیگ انگریزوں سے آزادی پانے میں مصروف تھیں، روس نے دونوں کو ہدف تنقید بنایا۔ برطانیہ کی تقسیم ہند کی تجویز کو روس نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی قرار دیا۔ روس خاص طور پر مسلم لیگ اور پاکستان کو سامراج کے پٹھو قرار دیا کرتا تھا۔ وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہرگز تسلیم نہیں کرتا تھا۔ شاید روس کو یہ خطرہ ہو کہ اسلامی ریاست کا قیام اس کی مسلم ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکوں کو ہوا دے گا۔ بالآخر دونوں ملکوں کے تعلقات بڑی سرد مہری سے شروع ہوئے۔

آزادی کے شروع میں معاشی مسائل اور عدم تحفظ نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ جہاں سے بھی امداد آئے قبول کرے، لیکن سوویت یونین نے پاکستان کی ضرورت کو کبھی محسوس نہ کیا۔ اگرچہ سفارتی تعلقات 1948ء میں قائم ہو گئے تھے مگر 1949ء تک سفیروں کا تبادلہ نہ ہوسکا۔

1949ء میں حکومت روس نے لیاقت علی خان کو

روس کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اگرچہ یہ دعوت قبول کر لی گئی لیکن پاکستان کے وزیراعظم نے دورہ نہ کیا۔ اس کی بجائے وہ امریکہ کے دورے پر چلے گئے۔ جہاں سے یہ دعوت نامہ روس کے دعوت نامہ کے بعد ملا تھا۔ سوویت یونین کے ذرائع ابلاغ نے اس بات کو خاص طور پر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

پاکستان کے روس کے ساتھ تعلقات اس وقت مزید بگڑ گئے جب پاکستان نے مغربی دنیا میں شمولیت اختیار کر لی۔ اگرچہ شروع میں سوویت یونین کا رویہ اتنا سخت نہیں تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ممکن ہے ایک نیا آزاد ملک کبھی بھی سامراج کے جھانسے نہ چڑھے۔ پاکستان نے روس کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پاکستان ان معاہدوں میں دراصل بھارت کے ڈر سے شامل ہوا ہے۔ مگر روس نے اس بات کو ہرگز تسلیم نہ کیا اور موقع آنے پر پاکستان کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ روس نے بجائے پاکستان کے عدم تحفظ کا مسئلہ سمجھنے کے اسے ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ احتجاجی مراسلہ بھیجنے کے بعد روس نے افغانستان اور بھارت سے مزید بہتر تعلقات استوار کر لیے۔ 1955ء میں روس کے رہنماؤں نے بھارت اور افغانستان کا سرکاری دورہ کیا۔ وہ پہلے تو سری نگر گئے جہاں انھوں نے کشمیر کو بھارت کا جزو قرار دیا اور پھر کابل گئے جہاں پختونستان کے مسئلے کو ایک حقیقت قرار دیا۔

روس کے ذرائع ابلاغ نے کھلے طور پر پاکستان کے خلاف ایک جارحانہ رویہ اختیار کیا، لیکن پاکستان خاموش رہا۔ روس کے غصے کی بنیادی وجہ پاکستان کا مغربی ممالک سے دفاعی معاہدوں میں شمولیت تھی۔ جب پاکستان معاہدوں میں شریک ہوا تو اس نے ہندوستان کو دوست بنانے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔ اس کو بھارت نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

1956ء میں فرسٹ ڈپٹی سوویت وزیراعظم نے پاکستان کا خیر سگالی دورہ کیا۔ اسی سال سوویت یونین کے ایک وفد نے دورۂ پاکستان کے موقع پر پاکستان کے ساتھ تجارتی معاہدہ کیا۔ 1958ء میں روس کے ایک پارلیمانی وفد نے بھی دورہ کیا اور پاکستان کو غیر مشروط امداد کی پیش کش کی۔ 1958ء میں ایوب خان مارشل لاء کے ذریعے سے برسر اقتدار آئے۔ چونکہ وہ شروع سے امریکہ کے ساتھ زیادہ بہتر تعلقات کے خواہاں تھے اس لیے برسر اقتدار آتے ہی انھوں نے ان تعلقات کو اور بھی بڑھایا جس سے پاکستان اور روس کے باہمی تعلقات کو مزید دھچکا لگا۔ 1960ء میں یو۔ٹو جاسوسی جہاز کا واقعہ پیش آیا۔ یہ جاسوسی جہاز پشاور سے اڑ کر روس کے علاقہ میں تصویریں لے رہا تھا کہ اسے روسی جہازوں نے مار گرایا۔ پائلٹ پکڑا گیا اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔ روس نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر پھر ایسا ہوا تو پشاور کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اس واقعے نے تعلقات کو بالکل بگاڑ دیا۔ اچھے تعلقات کی رہی سہی امید بھی نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔

1962ء کی بھارت چین جنگ کے بعد پاک روس تعلقات مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر بہتر ہونے لگے۔

سب سے بڑی وجہ تو پاکستان کا مغرب سے مایوس ہونا تھا۔ 1962ء تک پاکستان کو اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ باوجود یکہ وہ مغرب کے ساتھ تین معاہدوں میں شریک ہے، اس کی توقعات پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ مزید برآں بھارت جو معاہدوں میں شریک بھی نہیں تھا، اس کو بڑے پیمانے پر فوجی اور معاشی مدد ملتی رہی۔ ان باتوں نے پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔

بین البراعظمی مزائلوں کی ایجاد نے زمینی اڈوں کی اہمیت کو بالکل ختم کر دیا۔ اب روس ان اڈوں سے بالکل خوف زدہ نہیں تھا جو چھوٹے ملکوں نے امریکہ کو دیئے تھے۔ فوجی لحاظ سے اب روس کو امریکہ سے کوئی ڈر نہیں رہا تھا۔

چین ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہا تھا۔ روس کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ پڑوسی ملک دوسرے ایشیائی ملکوں کے ساتھ مل کر اس کے لیے بلائے جان نہ ثابت ہو۔ چین روس جھگڑے کے بعد روسیوں نے اس بات کو خاص طور پر مدنظر رکھا۔

چوتھی وجہ جس نے روس کو پاکستان کے ساتھ تعلقات کا دوبارہ جائزہ لینے پر مجبور کیا، وہ 1962ء کی بھارت چین جنگ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد مغرب والوں نے بڑے پیمانے پر بھارت کی فوجی امداد شروع کر دی۔ جب روس نے محسوس کیا کہ بھارت مغرب والوں کی طرف جھک رہا ہے تو انھوں نے اپنی توجہ پاکستان پر مرکوز کر دی۔

مندرجہ بالا باتوں نے پاکستان کے بارے میں روس کی پالیسی کو متاثر کیا۔ پاکستان نے بھی روس کی اہمیت کو پہچانا اور دونوں ملکوں نے اپنے تعلقات بہتر بنانے شروع کر دیئے۔

معاہدۂ تاشقند

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں روس نے بالکل غیر جانب دار پالیسی اختیار کر لی۔ جنگ کے بعد روس کی کوششوں سے پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ تاشقند ہوا۔ روسی وزیراعظم کوسیگن نے اس میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔ چنانچہ سیاسی اور معاشی تعلقات روز بروز بڑھتے چلے گئے۔

1965-69ء تک روس اور پاکستان کے تعلقات قابل تعریف تو نہیں تھے لیکن خاصے اچھے ہو گئے تھے۔ پاکستان کے ایک فوجی وفد نے 1960ء میں روس کا دورہ کیا اور روس نے پاکستان کو جیپیں اور ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرا اسلحہ اس لیے نہ دیا کیونکہ بھارت نے بہت واویلا مچایا، لیکن کوسیگن جب 1968ء میں پاکستان کے دورے پر آئے تو انھوں نے مناسب اسلحہ دینے کا وعدہ کیا۔

1969ء میں روس پاکستان تعلقات میں ایک بار پھر کشیدگی بڑھی۔ اس کی بنیادی وجہ روس کا ایشیائی سلامتی کا معاہدہ تھا، پاکستان نے یہ سمجھ کر کہ یہ معاہدہ چین کے خلاف ہو رہا ہے، اس کی بالکل حمایت نہ کی۔ روس نے دوبارہ پاکستان کی طرف جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ 73-1971ء میں پاکستان کے بحران نے روس کو ایک نادر موقع فراہم کیا کہ وہ پاکستان کو سبق سکھائے۔ روس نے نہ صرف مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کی حمایت اور امداد کی بلکہ ہندوستان کے ساتھ مل کر پاکستان کو دولخت کر دیا۔

بھٹو نے برسر اقتدار آتے ہی روس کے ساتھ دوطرفہ دوستی کی بنیادوں پر تعلقات قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے بہت سے سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے اور روس نے پاکستان کی سیٹو سے علیحدگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے ساتھ دونوں ملکوں کے مابین وفدوں کے تبادلے شروع ہوئے جن سے تعلقات کی بہتری میں مدد ملی۔

پاکستان اور چین

پاکستان وہ واحد مسلم ملک تھا جس نے 1950ء میں چین کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان نے سلامتی کونسل میں عوامی جمہوریہ چین کو مستقل ممبر کی حیثیت دلانے کی بھرپور کوشش شروع کر دی۔ اس کوشش کو چین نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ملکوں کے تعلقات صحیح خطوط پر استوار ہونے لگے۔

1950ء میں چین کی افواج نے تبت کو آزاد کرانے کے لیے کارروائی کی تو بھارت نے چین کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا شروع کر دیا، جب کہ پاکستان غیر جانبدار رہا۔ اس چیز نے بھی دونوں ملکوں کو قریب لانے میں مدد دی۔

اگرچہ کوریا کی جنگ میں پاکستان نے شمالی کوریا کو جارح قرار دیا لیکن اقوام متحدہ میں جب چین کو بھی جارح قرار دینے کی قرارداد پیش ہوئی تو پاکستان نے اس میں حصہ نہ

لیا۔ بعد میں دوستانہ تعلقات کے قیام میں یہ بات قابل تعریف سمجھی جاتی رہی۔ جب پاکستان نے سیٹو اور سینٹو میں شمولیت اختیار کی تو چین نے ان معاہدوں کو تو ہدف تنقید بنایا لیکن پاکستان کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔

انہی معاہدوں کی وجہ سے روس نے پاکستان سے مخالفانہ روش اختیار کر لی' لیکن چین نے فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور چینی رہنماؤں نے پاکستان کے عدم تحفظ کے احساس کو بخوبی بھانپ لیا۔1955ء میں پاکستان نے چین کو ان معاہدوں میں شمولیت کی اصل وجہ بتائی کہ ان معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت چین کے خلاف نہیں ہے بلکہ بھارتی خطرے کے پیش نظر اپنے دفاع کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ چین نے پاکستانی موقف کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس کی بجائے چین نے کیوں پاکستان کا موقف قبول کیا۔ دراصل ان چار باتوں نے چین کی سوچ کو متاثر کیا۔ پہلی بات تو یہ کہ چین کو معلوم تھا کہ بھارت پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔ اس لیے پاکستان ان دفاعی معاہدوں میں شامل ہوا ہے۔ دوسرے پاکستان ان معاہدوں میں شامل ہو کر امریکہ سے اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان معاہدوں میں شامل ہو کر پاکستان کو بہت زیادہ فوجی ساز و سامان ملا۔ تیسری وجہ سیٹو میں پاکستان کی شمولیت محض امریکی خوشنودی کے لیے تھی۔ چوتھی وجہ امریکی فوجی امداد چین کے خلاف نہیں بلکہ بھارت کے خلاف ہو سکتی تھی۔ ان چیزوں نے چین کو پاکستان کا موقف سمجھانے میں بڑی مدد دی۔

1965ء میں پاکستان کے وزیراعظم سہروردی چین کے دورہ پر گئے۔ چین نے اس دورے کا حوصلہ افزا جواب دیا اور چینی وزیراعظم چواین لائی پاکستان کے دورے پر آئے۔ مشترکہ اعلانیہ میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں اور دونوں ملکوں کو باہمی تعلقات مزید آگے بڑھانے چاہئیں۔

ایوب خان کے ابتدائی دور میں چین سے تعلقات میں معمولی رخنہ اندازی ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ ایوب خان کی بھارت کو دفاعی معاہدہ کی پیش کش تھی۔ پاکستان اور چین کی سرحدوں کے بارے میں کچھ اختلافات تھے، پاکستان نے چین کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور 1962ء میں اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر لیا گیا۔ بھارت نے اس معاہدہ پر اعتراض کیا کہ کشمیر کے بعض علاقے چین کو دے دیئے گئے ہیں۔

جنوری 1963ء میں پاکستان اور چین نے تجارتی سمجھوتہ کیا اور چین پاکستان کی کپاس کا سب سے بڑا خریدار بن گیا۔ 1963ء کا سال دونوں ملکوں کی دوستی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سال دونوں ملکوں نے آپس میں تین سمجھوتوں پر دستخط کیے۔

پاکستان کا چین کی طرف جھکاؤ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کی بنیادی وجہ مغرب کا پاکستان کی طرف مایوس کن رویہ تھا۔ بھارت اور افغانستان کی دشمنی اور روس کی مخالفت نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ دنیا میں نئے دوست کی تلاش کرے۔ 1962ء کی بھارت چین جنگ نے پاکستان کو چین کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے ایک نادر موقع فراہم کیا۔ دونوں ملکوں کے مفادات ایک دوسرے کو قریب لانے میں بڑے معاون ثابت ہوئے اور اس نے دونوں کو دوستی کے رشتوں میں منسلک کر دیا۔

1965ء کی جنگ اور چین

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں چین نے بھارت کو جارح ملک قرار دیا اور اس کی پرزور مذمت کی۔ جس سے پاکستان اور اس کے عوام چین سے متاثر ہوئے۔ اسی طرح 1971ء میں بھی چین نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ اگرچہ چین نے پاکستان کی فوجی طور پر مدد نہ کی کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اس طرح روس بھی کھلے طور پر اس جنگ میں شامل ہو جاتا اور دنیا کا امن خطرے میں پڑ جاتا۔ لیکن چین نے سیاسی اور سفارتی طور پر بہت مدد کی۔

1971ء کے بعد پاک چین دوستی مزید بڑھی۔ چین نے پاکستان کی معاشی امداد میں مزید اضافہ کر دیا اور فوجی ساز و سامان بھی فراہم کیا۔ کشمیر کے بارے میں پاکستان کا مؤقف ہمیشہ درست قرار دیا اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کی۔

1970ء کے شروع میں پاکستان نے امریکہ اور چین کو قریب لانے کی سفارتی کوششوں میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس سے چین اور امریکہ قریب آ گئے۔ چین نے پاکستان کے کردار کی تعریف کی۔ آج دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت دوستانہ ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔

حاصل بحث

آزادی کے وقت چونکہ بھارت اور افغانستان پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے اس لیے پاکستان کی کوشش تھی کہ ایک طرف دوسرے ہمسائیوں سے اچھے تعلقات قائم کیے جائیں اور ساتھ ساتھ ملکی دفاع کو مختلف طریقوں سے مضبوط بنایا جائے۔ اگر بڑی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت بنیادی طور پر پاکستان کے دفاعی نقطۂ نظر سے تھی۔ تمام ممالک اپنی علاقائی آزادی، سلامتی اور اقتدار اعلیٰ کو اولیت دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے آزادی حاصل کرتے ہی پاکستان کو بھی یہی بڑا مسئلہ درپیش رہا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کو معاشی اور تکنیکی امداد کی بھی بہت ضرورت رہی ہے۔ پاکستان اگر اپنے وسائل کا زیادہ حصہ دفاع پر خرچ کرتا تو اندرونی ترقی رک جاتی اور آمدنی کا بڑا حصہ ترقی پر صرف کرتا تو دفاع متاثر ہوتا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر پاکستان نے مختلف بڑی طاقتوں سے اپنے تعلقات استوار کیے۔

پاکستان اور افغانستان

پاکستان اور افغانستان دونوں ہمسایہ ممالک ہیں۔ ان میں مذہبی، تاریخی اور ثقافتی رشتے ہیں لیکن ان دونوں کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ مشرق سے بھارت کے مخالفانہ رویئے اور مغرب سے افغانستان نے ہمیشہ پاکستان کی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ ان خراب تعلقات کی بنیادی وجہ افغانستان کا پاکستان کے ان علاقوں میں جہاں پختون آباد ہیں، ایک علیحدہ ملک بنانے کا مطالبہ ہے جسے وہ پختونستان کا نام دیتا ہے۔

اگر افغانستان کے موقف کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مطالبہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے مشرق میں پٹھانوں سے آباد علاقے اس کو دے دیئے جائیں یا ان کو حق خود ارادیت دیا جائے۔ لیکن اس حق خود ارادیت میں ڈیورنڈ لائن کے مغرب میں بسنے وا کو شامل نہیں کیا جاتا۔ مطالبہ صرف ان علاقوں تک ہے جو پاکستان میں ہیں۔ افغانستان میں حکومت کے ذرائع ابلاغ دن رات پختونستان کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو درانی دور حکومت کے علاوہ یہ علاقہ جنوبی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کے قبضے میں رہا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اگرچہ اس علاقے پر قبضہ کیا لیکن سکھوں نے براہِ راست حکومت نہ کی۔ 1844ء کے بعد سکھوں نے اس علاقے کو براہِ راست اپنی عملداری میں لے لیا۔ 1949ء میں حکومت برطانیہ نے تمام سکھ علاقے کو اپنی سلطنت ہند میں شامل کر لیا۔ برطانوی ہند کی پالیسی ان علاقوں کی طرف دو طرح سے بیان کی جا سکتی ہے۔ انگریزوں کے ایک گروپ کا خیال تھا کہ ان علاقوں کو شامل کرنے کے بعد آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ جبکہ دوسرا گروپ اس بات کا خواہاں تھا کہ مغرب اور شمال میں جس قدر علاقہ

ہو سکے برطانوی عملداری میں شامل کیا جائے۔

روس اور برطانیہ کے مفاد

ان علاقوں میں برطانوی پالیسی کا بنیادی مقصد روس کو جنوب مشرق میں بڑھنے سے روکنا تھا۔ پیٹر اعظم کے زمانے سے روس کی خواہش رہی ہے کہ بحر ہند کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کی جائے۔ انیسویں صدی میں برطانیہ اور روس کی سلطنتیں ملحقہ علاقوں پر قبضہ جمانے میں مصروف تھیں۔ افغانستان اس سیاسی کشمکش میں ایک مہرہ بن گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن نے افغانستان کو ایک بکرے سے مشابہت دی جس پر شیر (برطانیہ) اور ریچھ (روس) کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

1869ء میں روس نے دریائے آمو تک کے علاقے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ اس کے برعکس حکومت برطانیہ درۂ خیبر تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد روس کی ہر ممکن کوشش رہی کہ کابل میں اثر و رسوخ بڑھایا جائے۔ یہ بات برطانیہ کو ناگوار گزری اور اس نے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ یہ جنگ 1879ء میں معاہدہ گنڈ مک پر منتج ہوئی۔ اس معاہدے کی رو سے افغانستان کے امیر نے کرام، پشین، سبی اور درۂ خیبر پر پوری برطانوی عملداری تسلیم کر لی۔ امیر نے اس بات پر بھی رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ برطانیہ کے علاوہ کسی سے خارجی تعلقات نہیں بڑھائے گا۔ اس کے بدلے میں برطانیہ نے افغانستان کا دفاع براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ (اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ افغانستان صحیح معنوں میں 1919ء میں آزاد ہوا جب حکومت برطانیہ نے افغانستان کو دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی۔)

ڈیورنڈ لائن

چند سال تک تو امیر عبدالرحمٰن کابل میں اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے میں لگا رہا' کیونکہ کچھ اور لوگ بھی اسیر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ 1890ء تک عبدالرحمٰن اپنی پوزیشن مستحکم کر چکا تھا۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی سرحدوں کا تعین کرنے کے بعد اس نے برطانیہ سے درخواست کی کہ برطانوی ہند اور افغانستان کے درمیان سرحدوں کا تعین کیا جائے۔ اس نے خود درخواست کی کہ سر مارٹیمر ڈیورنڈ کو برطانوی مشن کا سربراہ مقرر کیا جائے۔ لیکن برطانوی ہند کے وائسرائے جنرل رابرٹ کو مشن کا سربراہ مقرر کیا۔ چونکہ جنرل رابرٹ افغانستان سے جنگ کر چکا تھا' اس لیے امیر عبدالرحمٰن نے اصرار کیا کہ سر ڈیورنڈ ہی کو مشن کا سربراہ ہونا چاہیے۔ جنرل رابرٹ کے ریٹائرڈ ہونے پر سر ڈیورنڈ کو برطانیہ نے سرحدی مشن کا سربراہ مقرر کر کے کابل روانہ کیا۔ نومبر 1893ء میں سرحدی معاہدہ طے پایا۔ معاہدہ کے دوسرے دن کھلے دربار میں امیر عبدالرحمٰن نے مشن کا شکریہ ادا کیا۔ بقول اس کے ''اس معاہدہ سے افغانستان کو برطانیہ کی نسبت زیادہ فائدہ ملا ہے۔''

امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے امیر حبیب اللہ نے 1906ء میں برطانیہ سے ایک اور معاہدہ کیا جس میں یہ عہد کیا کہ 1893ء کے معاہدے کو ہر حالت میں پورا کیا جائے گا۔ 1919ء، 1920ء اور 1930ء کے اینگلو افغانستان معاہدوں نے بار بار اس معاہدہ کا پاس کرنے کا عہد کیا۔ بالآخر 1935ء کے انڈین ایکٹ کی رو سے ان علاقوں کو ہمیشہ کے لیے برطانوی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔

صوبہ سرحد

دوسری جنگ عظیم کے وسط میں جب یہ بات واضح ہو گئی کہ برطانیہ اب ہندوستان کو خیرباد کہنے والا ہے تو افغانستان نے برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ یہ علاقے افغانستان کے حوالے کر دیئے جائیں۔ جب افغانستان کو برطانوی ہند میں پختونستان میں بسنے والوں پٹھانوں کا سرد مہر جواب ملا تو اس نے آزاد پختونستان کی مہم چلانی شروع کر دی۔ اسے عبدالغفار خان کی سرخ پوش تنظیم نے خاص طور پر شہرت دی۔ جب برطانوی ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا تو صوبہ سرحد میں عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ آزادی سے پہلے صوبہ سرحد مسلم اکثریت کے باوجود کانگریس کے زیر اثر تھا، وہاں حکومت بھی کانگریس کی تھی۔ مگر 1947ء کے لگ بھگ لوگوں کی اکثریت مسلم لیگ کی طرف دار ہو گئی۔ برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ صوبے کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام ریفرنڈم کے ذریعے کریں گے کہ وہ پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں یا بھارت سے۔ چنانچہ 1947ء میں صوبے میں ریفرنڈم ہوا اور عوام نے تقریباً 99.6 فی صد ووٹوں سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ اگرچہ قبائلی علاقوں میں ریفرنڈم تو نہ ہو سکا لیکن وہاں کے لوگوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ ریاست دیر، سوات، چترال اور امب کے حکمرانوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ اسی طرح بلوچستان بھی پاکستان کے ساتھ شامل ہوا۔

اگر قانونی اور اخلاقی طور پر دیکھا جائے تو افغانستان کو یہ حق حاصل نہیں کہ پاکستان میں رہنے والے پختونوں کے حقوق کی بات کرے۔ شاید افغانستان اس مسئلے کو زندہ رکھ کر پاکستان سے زیادہ راہداری اور تجارت کی سہولتیں حاصل کرنا چاہتا ہو۔

افغان دعویٰ کی دوسری وجہ بھارت اور روس کا اس مسئلے کو ہوا دینا ہے، آزادی کے وقت ہی سے بھارت کی کوشش رہی کہ پاکستان باقی دنیا سے الگ تھلگ رہ کر کمزور ہو جائے۔

روس کا اس موقف کی حمایت کرنا بھی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اگر پختونستان بن جائے تو روس کی کوشش دریائے آمو کے ساتھ قبائلیوں کو یکجا کرنے کی ہوگی جو اس کے زیر اثر ہیں۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ بھی پیش نظر ہے کہ گرم پانیوں تک اس کی رسائی ہو جائے گی۔

پاکستان کا طرز عمل

پاکستان اور افغانستان کے درمیان جھگڑے کی بنیادی وجہ پر بحث کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں پاکستان کے طرز عمل کا جائزہ لیا جائے۔ اقوام متحدہ کے رکن بننے کے سوال پر افغانستان ہی وہ واحد ملک تھا جس نے پاکستان کے خلاف ووٹ دیا۔

آزادی کے بعد کشمیر میں جنگ کی وجہ سے پاکستان نے قبائلی علاقوں سے فوجیں ہٹا لیں۔ افغانستان نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قبائلیوں کو بغاوت پر اکسانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ 1948ء میں افغانستان کے بادشاہ نے پاکستان میں اپنا نمائندہ بھیجا تاکہ تجارت اور راہداری کی سہولتوں پر بات چیت کی جائے۔ اس نے مطالبہ پیش کیا کہ افغانستان کو بلوچستان میں سے سمندر تک راستہ دیا جائے یا کراچی میں آزاد تجارتی علاقے کی سہولت دی جائے۔ ساتھ ہی قبائلی علاقوں کو آزاد قرار دیا جائے اور نیا معاہدہ کیا جائے جس کی رو سے اگر ایک ملک پر حملہ ہو تو دوسرا خاموش ہوگا۔ ان مطالبات کا مطلب بھارت کو خوش کرنا تھا۔

اگرچہ افغانستان نے غیر دوستانہ رویہ اختیار کیا لیکن پاکستان نے 1948ء میں اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے اور اسے تجارتی سہولتیں بھی دیں۔

دونوں ملکوں کے تعلقات اس وقت پھر خراب ہو گئے جب افغان بادشاہ اور وزیر اعظم نے 1949ء میں پاکستان کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے ساتھ پاکستانی علاقوں میں افغانیوں کی یلغار شروع ہو گئی اور علیحدگی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو ناکام رہی۔

پاکستان کے رہنماؤں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس تصوراتی مسئلے کو ہمیشہ کے لیے دبا دیا جائے اور افغانستان کے ساتھ جو ایک مسلم برادر ملک ہے' اچھے تعلقات کی بنیاد ڈالی جائے۔

پاکستان جب 1954ء کے بعد مغربی ملکوں کے

ساتھ اپنی سلامتی کے لیے مختلف معاہدوں میں شامل ہوا تو افغانستان نے اسے ہدف تنقید بنایا۔ پاکستان کو سامراج کا پٹھو قرار دیا کہ وہ یہ امداد لے کر پختونستان کے عوام کو دبا دینا چاہتا ہے۔

1965ء میں مغربی پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر ایک یونٹ قائم کر دیا گیا۔ صوبہ سرحد کو اس وحدت میں شامل کرنے پر افغانستان نے بڑی خفگی کا اظہار کیا کیونکہ اس طرح اس کی الگ حیثیت ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ افغان ذرائع ابلاغ تیزی سے پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرنے لگے۔ جلال آباد اور قندھار میں پاکستانی قونصل خانوں پر حملے کیے گئے اور پاکستانی جھنڈا نذر آتش کیا گیا۔ پاکستان میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ عوامی دباؤ کی وجہ سے پاکستان نے افغانستان کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ لیکن کچھ برادر مسلم ملکوں نے درمیان میں آ کر تعلقات بحال کرا دیئے۔ روس نے بھی افغانستان کے مطالبہ پختونستان کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ پختونستان کا مسئلہ سرد جنگ کا ایک حصہ بن گیا۔

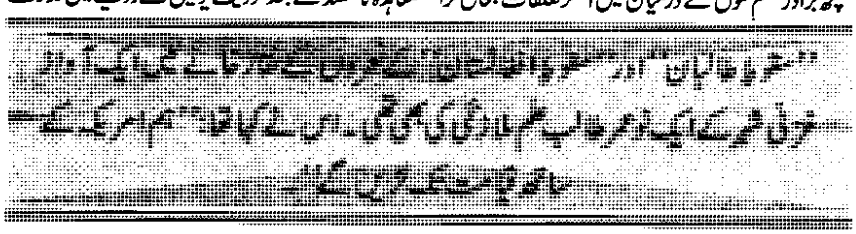

"[illegible] طالبان" اور "[illegible]" [illegible]
خوست شہر کے ایک نوعمر طالب علم [illegible] نے کہا تھا "ہم امریکہ کے
ساتھ قیامت تک لڑیں گے۔"

1956-57ء میں تعلقات کسی حد تک اچھے ہو گئے۔ اس عرصے میں افغانستان کے لیے تجارت اور راہداری کی سہولتیں بحال کی گئیں۔ پاکستان نے اپنی ریلوں میں افغان مال لے جانے کی بھی پیش کش کی، فضائی معاہدہ بھی ہوا جبکہ تار اور ٹیلی فون کا سلسلہ بھی بحال کیا گیا۔

1958ء میں ایوب خان نے برسراقتدار آتے ہی افغانستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن جب 1960ء میں افغان وزیر خارجہ نے پاکستان کا دورہ کیا تو واپسی پر جو بیان دیا وہ دوستانہ نہیں تھا۔ اسی سال سوویت وزیراعظم خرد شیف نے افغانستان کا دورہ کیا تو روس کا یہ موقف پھر دہرایا کہ پختونستان ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اسے حق خودارادیت کی بنیادوں پر حل کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ پاکستان کے خلاف پھر جارحانہ پروپیگنڈا شروع ہو گیا، علیحدگی پسندوں کو اکسانے کے لیے قبائلی علاقوں میں اشتہارات تقسیم کیے گئے۔ دو لشکر جن کو افغان فوج کی مدد حاصل تھی، مئی 1960ء اور ستمبر 1968ء میں قبائلی علاقے میں داخل ہو گئے۔ پاکستانی افواج پیچھے رہیں تاکہ قبائلی آدمی ان لشکروں کا مقابلہ کریں۔ دنیا نے اس وقت ایک عجیب صورت حال دیکھی جب افغان فوج ان پختونوں سے لڑ رہی تھی جن کی آزادی کا وہ دم بھرتی تھی۔ اس دفعہ پھر سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔ لیکن شاہ ایران کی ذاتی مداخلت سے دوبارہ تعلقات قائم ہو گئے۔ دو مہینے کے بعد دوبارہ سرحدیں کھول دی گئیں اور تجارت بحال ہو گئی۔

معاہدہ تہران سے چند ماہ پہلے افغان وزیراعظم سردار داؤد نے استعفیٰ دے دیا۔ داؤد پختونستان کا بڑا حامی تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے شاہ ایران نے دونوں ملکوں کو قریب تر لانے کی کوشش کی، چنانچہ دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے لگے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں افغانستان کی حکومت نے غیر جانب داری اختیار کی جب کہ عوام کی اکثریت نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ 1966ء میں معاہدہ تاشقند کے بعد سوویت یونین کے رویے میں قدرے نرمی پیدا ہوئی۔ 1968ء میں ظاہر شاہ پاکستان کے دورے پر آئے تو انھیں بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا گیا۔ اس کے بعد مختلف وفود کے تبادلوں نے تعلقات کو بہتر بنا دیا۔

1973ء میں سردار داؤد نے ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ چنانچہ سردار داؤد کی حکومت نے پھر پختونستان کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ 1974ء میں اسلامی کانفرنس کے موقع پر افغان نمائندے نے بھی یہ مسئلہ اٹھایا۔ لیکن مسلم ممالک نے پاکستان کے موقف کی حمایت کی۔

1976ء میں بھٹو کے دورۂ کابل سے دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے لگے۔ مشترکہ اعلانیہ میں دونوں ملکوں نے بقائے باہمی کے پانچ اصولوں پر تعلقات بہتر بنانے پر اتفاق کیا۔ وہ پانچ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ ایک دوسرے کی علاقائی سلامتی اور اقتدار اعلیٰ کا پاس رکھنا۔
2۔ طاقت کے استعمال سے گریز۔
3۔ ایک دوسرے کے معاملات میں عدم مداخلت۔
4۔ باہمی عزت اور برابری۔
5۔ بقائے باہمی۔

اسی سال صدر داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ یہ دورہ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ مشترکہ اعلامیے سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی بعض معاملات طے ہونا باقی ہیں۔ شاید داؤد کا یہ مطالبہ کہ پختون رہنماؤں کو رہا کیا جائے اور صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں ان کی حکومتیں بحال کی جائیں سب سے بڑی رکاوٹ بنا۔ حالانکہ چند مہینے پہلے دونوں ملکوں نے مندرجہ بالا اصولوں پر جو سمجھوتہ کیا تھا، وہ ایسے مطالبے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

1978ء میں افغانستان میں انقلاب آ گیا۔ سردار داؤد مارا گیا اور نور محمد ترکئی نے اقتدار سنبھالا۔ نئی حکومت کو اندرونی مخالفت کا سامنا رہا اور اس کی پختونستان پالیسی ظاہر نہ ہو سکی۔ ترکئی بھی انقلاب کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد حفیظ اللہ امین نے اقتدار سنبھالا۔ اس موقع پر روس نے فوجی مداخلت کی اور روسی فوجوں اور مقامی آبادی میں جنگ چھڑ گئی۔ سوویت یونین نے اپنے جارحانہ عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ببرک کارمل کو مشرقی یورپ سے لا کر افغانستان کا حاکم بنا دیا۔ اس کے بعد افغانستان پر براہ راست حملے کی راہ ہموار کر کے 85 ہزار افواج کے ساتھ ایک دیرینہ دوست اور کمزور افغانستان پر حملہ آور ہوا۔ افغانستان جیسے کمزور ہمسایہ ملک پر سوویت یونین کا حملہ کوئی نئی بات نہ تھی، بلکہ اس سے قبل بھی رُوسی کمیونسٹ سامراج نے وسط ایشیا کی مسلم اور کمزور ریاستوں پر قبضہ کیا تھا۔

افغان قوم نے روسی استعمار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ تقریباً پندرہ لاکھ افغانی رُوسی فوج سے جنگ کے دوران اور بعد میں خانہ جنگی میں شہید ہوئے۔ پچاس لاکھ کے قریب پاکستان، ایران اور دیگر ممالک میں پناہ گزینی پر مجبور ہوئے۔ پاکستان نے اس جنگ میں صرف افغان مہاجر بھائیوں کو اپنے ہاں پناہ دی بلکہ روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کی دل کھول کر امداد کی اور ہر محاذ پر اُن کا بھرپور ساتھ دیا۔ آٹھ برسوں کی مسلسل جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کے بعد مجاہدین نے روس کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بیسویں صدی کا غیر معمولی کارنامہ تھا جو صرف افغان قوم ہی سرانجام دے سکتی تھی۔ روس کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے بعد بدقسمتی سے مجاہدین کے گروپ آپس میں برسرپیکار ہو گئے اور افغانستان خانہ جنگی، بدامنی اور انتشار کا شکار ہو گیا۔

23 اپریل 1992ء کو حکومت پاکستان کی کوششوں سے کابل کا اقتدار سنبھالنے کے بعد مجاہدین کی مختلف جماعتوں کا ایک عبوری کونسل پر اتفاق ہو گیا۔ "معاہدۂ پشاور" کا نام دیا گیا۔ حکمت یار کو وزارت عظمیٰ کی پیش کش کی گئی، مگر حکمت یار نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کابل پر حملہ کر دیا۔ 28 اپریل

کو پروفیسر صبغت اللہ نے کابل میں دو ماہ کے لئے افغانستان کے پہلے سربراہ کا عہدہ سنبھال لیا۔ 28 جون کو چار ماہ کے لئے پروفیسر برہان الدین ربانی کو صدر منتخب کیا گیا۔ پروفیسر ربانی نے اقتدار سنبھالتے ہی حکمت یار سے اپیل کی کہ وہ وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیں۔ حکمت یار نے اپنے کمانڈر استاد فرید کو وزیراعظم نامزد کیا۔ 6 جولائی کو وہ کابل پہنچے۔ مدتِ اقتدار ختم ہونے کے بعد ربانی نے خود ساختہ جرگے کے ذریعے اپنے دورِ اقتدار میں توسیع کر لی۔

باہمی اختلافات کے باعث خانہ جنگی وقفوں وقفوں سے جاری رہی۔ 7 مارچ 1993ء کو اسلام آباد میں ایک اور معاہدہ ہوا' جسے افغانستان کے تمام فریقوں نے تسلیم کیا۔ حکمت یار نے وزیراعظم بننا قبول کر لیا۔ افغان رہنماؤں نے خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں بھی اس معاہدہ پر خلوصِ نیت سے عمل کرنے کا عہد کیا اور جدہ میں شاہ فہد کی موجودگی میں اس معاہدے کے عربی متن پر دستخط کئے۔ مگر معاہدہ پر عمل نہ کیا گیا اور چند ہی روز بعد خونریز معرکے میں ایک ہزار سے زیادہ افغان مارے گئے۔ 29 اپریل کو جلال آباد میں ایک بار پھر افغان رہنما اکٹھے ہوئے اور اکیس روز کے مذاکرات کے بعد 19 مئی کو ''میثاق جلال آباد'' پر دستخط کر دیئے۔ معاہدوں پر معاہدے ہوتے گئے' مگر حالات جوں کے توں رہے۔ 1993ء کے اختتام پر جنرل دوستم کی ربانی حکومت کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں کابل ایک بار پھر جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے علاوہ ایران نواز ''حزب وحدت'' کی سعودی نواز ''اتحادِ اسلامی'' اور حکومت سے جنگ جاری رہی۔

طالبان کا ظہور

افغان کمانڈروں کی خانہ جنگی' لوٹ مار' قتل وقتال اور غنڈہ گردی کے ردعمل کے طور پر اکتوبر 1994ء میں قندھار میں طالبان کا ظہور ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کے بعد دوسرا علاقہ فتح کرتے چلے گئے۔ کوئی بھی مجاہد تنظیم ان کے سامنے ٹھہرنے کی جرأت نہیں کر پائی۔ وہ سپن بولدک پر قبضہ کرنے کے بعد زابل اور غزنی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے مجاہدین کے تمام گروپوں سے اپیل کی کہ وہ اقتدار ان کے حوالے کر دیں' لیکن ان کو حقیر اور معمولی سمجھ کر کسی نے ان کی اپیل پر توجہ نہ کی۔ بعد ازاں طالبان نے صوبہ پکتیا' غزنی' زابل اور وروک پر قبضہ کر لیا اور کابل کی طرف پیش قدمی۔ چہار آسیاب پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ گلبدین حکمت یار فرار ہو گئے اور شیعہ لیڈر مزاری کو قتل کر دیا گیا۔ طالبان کابل پر نہایت آسانی سے قابض ہو گئے۔ لٹیروں اور چوروں کو بھگا دیا۔ شہر میں فوراً امن وامان ہو گیا۔ شہری خوشی سے رقص کرنے لگے۔

11 ستمبر 2001ء کو نیویارک کا ''ٹریڈ سنٹر'' خودکش ہوائی حملے کے ذریعے تباہ کیا گیا۔ امریکی افواج کے ہیڈ کوارٹر پر اسی روز ہوائی حملے ہوئے۔ امریکہ نے کسی قسم کے ثبوت کے بغیر صاف اعلان کر دیا کہ اس ساری کارروائی میں اسامہ بن لادن کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا اب اسامہ کو اُس کے حوالے کیا جائے۔ طالبان نے امریکہ کا یہ مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ ''دہشت گرد'' اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس الزام کے محض آٹھ دن بعد 20 ستمبر کو صدر بش کے مُنہ سے ''صلیبی جنگ'' کے نعرے لگے اور 7 اکتوبر کو افغانستان پر امریکہ اور اس کے حواریوں نے پہلا حملہ کر کے جنگ کا آغاز کیا۔ اور ہمارے حکمرانوں نے بھی اس طاغوتی جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا۔ امریکہ نے طالبان کے تربیتی کیمپوں اور افغانستان کی فوجی چھاؤنیوں اور تنصیبات پر روزانہ صبح شام بمباری شروع کر دی۔ پانچ ہفتوں کی مسلسل بمباری اور شدید مزاحمت کے بعد امریکہ نے ایک چال چلی اور طالبان کے دیرینہ دشمن ''شمالی اتحاد'' کو ساتھ ملا کر مزار شریف اور دارالحکومت کابل پر قبضہ کرنے کے لئے انتہائی تیز رفتاری سے بھرپور حملے کئے۔ 7 دسمبر کو طالبان کی حکومت کا خاتمہ ہوا' جب ان کا آخری مرکز قندھار بھی امریکہ کے زیر تسلط آ گیا۔ 7 دسمبر 2001ء کو قندھار خالی کرتے ہی دنیا نے ''سقوطِ طالبان'' اور ''سقوطِ افغانستان'' کے نعرے سنے۔ ان نعروں کے نقار خانے میں ایک آواز غزنی شہر کے ایک نوعمر طالب علم ملا زئی کی بھی تھی۔ اس نے کہا تھا: ''ہم امریکہ کے ساتھ قیامت تک لڑیں گے''۔ ایک بار پھر طالبان' افغانستان کی ان سنگلاخ چٹانوں میں پہنچ گئے ہیں جہاں سے وہ 1994ء کے موسم بہار میں نکل کر قندھار پہنچے تھے اور ایک بار پھر گوریلا جنگ شروع ہے۔ اقوام متحدہ کے انڈر سیکریٹری جنرل نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے: ''افغانستان کے کچھ حصوں پر طالبان کا غلبہ ہے۔ قندھار اور پکتیا کے سرحدی اضلاع میں طالبان اپنا کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ طالبان' القاعدہ اور حزب اسلامی کے ارکان بے خوف وخطر سرحد پار سے آ کر حملے کرتے ہیں' جن سے امن و امان کی صورت حال ابتر ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہے۔ حامد کرزئی حکومت طالبان کے آگے کمزور دکھائی دیتی ہے''۔ طالبان ذرائع کے مطابق اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر ابھی زندہ ہیں اور افغانستان کی پہاڑیوں میں بیٹھ کر ''طالبان'' کی گوریلا جنگ کی کمان کر رہے ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادی روزانہ اپنے سپاہیوں کی لاشیں اٹھا کر واپس لے جا رہے ہیں۔ امریکہ کا مجاہدین کی اس سرزمین سے بھاگ جانا مقدر ہے۔ افغانیوں کا آزادی اور اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرنا قانونِ قدرت کا عین تقاضا ہے۔

افغان باقی' کہسار باقی الحکم للّٰہ' الملک للّٰہ!

پاکستان ایران تعلقات

شروع ہی سے دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت دوستانہ رہے ہیں۔ آزادی کے وقت پاکستان کو سب سے پہلے ایران ہی نے تسلیم کیا تھا۔ آزادی سے لے کر اب تک ایران نے سیاسی اور سفارتی سطح پر ہمیشہ پاکستان کی امداد کی ہے۔ بحران میں ہمیشہ ایران نے پاکستان کا ساتھ دیا' پاکستان اور ایران دونوں سینٹو کے ممبر رہے اور اب آر۔سی۔ڈی میں شامل ہیں۔

پاکستان اور ایران دونوں مسلم ملک ہیں۔ دونوں ثقافتی اور مذہبی رشتوں میں منسلک ہیں۔ ایران کی زبان فارسی طویل عرصے تک اس علاقے کی سرکاری زبان رہی ہے اور اس کا اثر اردو زبان اور مقامی زبانوں پر بہت زیادہ ہے۔ تاریخی طور پر دونوں قومیں ایک دوسرے کے قریب رہی ہیں' بین الاقوامی تعلقات میں دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسیاں ایک دوسرے کی معاون ہیں۔

باوجودیکہ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے سے دوستانہ مراسم قائم رکھے لیکن پھر بھی یہ بہتر سمجھا کہ اپنی سرحدیں طے کر لی جائیں۔ پاکستان اور ایران کی سرحد تقریباً 590 میل ہے۔ آزادی کے وقت سرحدیں طے نہیں تھیں کیونکہ سرحد پہاڑوں میں سے گزرتی ہے۔ ماضی میں حکومت برطانیہ نے بھی کبھی سرحدیں طے کرنے کی کوشش نہ کی۔ 1950ء کی دہائی کے وسط میں دونوں ملکوں کی سرحدیں طے کرنے پر مذاکرات شروع ہوئے اور آخر کار 1958ء میں معاہدہ طے پایا اور 1960ء میں دستاویزات کا تبادلہ ہوا۔ حکومت پاکستان نے اس معاہدے کو ایک سنگ میل قرار دیا۔ معاہدے کے تحت پاکستان نے 360 مربع میل کا علاقہ واپس کیا جو کہ برطانوی ہند کی حکومت نے ایران سے چھینا تھا۔

ایران نہ صرف پاکستان کو معاشی امداد فراہم کرتا رہا ہے' بلکہ سفارتی سطح پر اس نے پاکستان کے مختلف مسائل حل کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ جب 1961ء میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات منقطع ہو گئے تو شاہ ایران نے ذاتی مداخلت سے ان کو بحال کرنے میں بڑی مدد دی۔ اسی طرح 1965ء کی جنگ کے بعد پاکستان اور ملائشیا میں

غلط فہمی پیدا ہوگئی تو وہ بھی ایران کی مدد سے دور ہوئی۔

1964ء میں ایران اور ترکی اور پاکستان آر۔سی۔ڈی میں شامل ہو گئے۔ جو ان کو قریب لانے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد معاشی تعاون ہے۔ چنانچہ 1964ء سے اس تنظیم کی مدد سے تینوں ملکوں نے بعض شعبوں میں بڑی ترقی کی ہے۔

ایران کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر پاکستان کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو بھارت اور افغانستان کے معاندانہ انداز اور مخالفانہ رویہ نے پاکستان کو بڑا مایوس کیا۔ لیکن ایران ایک ایسا ہمسایہ تھا جس سے تعلقات قائم کر کے امید افزا فضا پیدا ہوئی۔

پاک بھارت تعلقات

پاک بھارت تعلقات کی تاریخ بداعتمادی اور عداوت پر مبنی ہے جس کی وجہ سے دونوں میں تین مرتبہ جنگ ہو چکی ہے۔ اس بداعتمادی کی جڑیں ہندوستان کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ 712ء میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے۔ گیارہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک مسلمانوں نے ہندوؤں پر حکومت کی اور ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی۔ برصغیر میں برطانیہ کے دور حکومت نے ہندوؤں کو ایک نادر موقع فراہم کیا جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں سے پرانے بدلے چکانے لگے۔ ہندوؤں نے فوراً اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ جب کہ مسلمان ایسا نہ کر سکے اور نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے میں ان کو خاصی دیر لگی۔ اس وقت تک ہندو بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں نے حالات کے تقاضے محسوس کرنا شروع کیے۔ 1906ء میں مسلم لیگ نے اپنے قیام سے یہ بات تسلیم کرائی کہ مسلمان ہندوؤں سے بالکل جدا ہیں اور ان کے اپنے مسائل ہیں۔ یہی دو قومی نظریہ تھا، جس کو آل انڈیا کانگریس نے کبھی تسلیم نہ کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمان علیحدہ ملک حاصل کرنے میں شاید کامیاب ہو جائیں تو مسلمانوں کے خلاف ہندو پروپیگنڈا اہم اور تیز ہوگئی۔ کانگریس نے تقسیم ہند کو بڑی مشکل سے تسلیم کیا۔ باہمی بداعتمادی اور بھارت کے جارحانہ عزائم دونوں ملکوں کے تعلقات کو ہمیشہ متاثر کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات ذہن میں رہنے چاہئیں۔

مسلم کش فسادات: آزادی حاصل کرنے کے پہلے تین سال میں پاکستان اور بھارت کے تعلقات بھارت میں فسادات اور مہاجرین کے انخلاء کی وجہ سے نہایت کشیدہ رہے۔ آزادی سے پہلے ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ پانچ چھ ہفتوں کے دوران میں 10 لاکھ مسلمان شہید ہو گئے۔ 60 لاکھ مہاجرین سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوئے جس سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔

ریڈکلف ایوارڈ: آزادی کے وقت سرحدوں کا تعین کرنے کے لیے سرحدی کمیشن کی تشکیل کی گئی۔ اس کا چیئرمین ریڈکلف تھا۔ اس میں ہندو اور مسلم برابر برابر رکن تھے۔ اس کمیشن کا بنیادی مقصد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آبادی کی اکثریت کی بنیاد پر سرحدوں کا تعین تھا۔ یعنی مسلمانوں کی اکثریت والے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے اور ہندوؤں کی اکثریت والے ہندوستان میں۔ چونکہ مسلمان اور ہندو ارکان پنجاب کی سرحدوں کا تعین کرنے میں ناکام رہے' اس لیے زیادہ تر فیصلے چیئرمین ریڈکلف کی مرضی سے طے پائے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے پنجاب کی تمام سرحد ریڈکلف نے تشکیل دی۔ دو جگہوں کے علاوہ چیئرمین نے تمام علاقوں کا فیصلہ مذہبی اکثریت کی بنیاد پر کیا۔ ان میں ایک گورداسپور کا ضلع اور دوسرے فیروزپور کا علاقہ جس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، ہندوستان کو ملے۔ گورداسپور میں چار تحصیلیں تھیں۔ بٹالہ، شکر گڑھ، پٹھان کوٹ اور گورداسپور۔ تین تحصیلیں گورداسپور، بٹالہ اور شکر گڑھ میں مسلمان اکثریت تھی' بجائے اس کے کہ تمام ضلع پاکستان کو ملتا' ریڈکلف نے شکر گڑھ تحصیل پاکستان کو دے کر باقی علاقہ بھارت کے حوالے کر دیا۔

بقول ایک پاکستانی مصنف کے ریڈکلف ایوارڈ پاکستان کے لیے علاقائی قتل ثابت ہوا اور اس ایوارڈ کا ناجائز بچہ مسئلہ کشمیر کی صورت میں رونما ہوا۔ کیونکہ گورداسپور کا ضلع ہی تھا جو کشمیر کو بھارت سے ملاتا تھا۔ اگر یہ ضلع پاکستان کو مل جاتا تو جموں اور کشمیر کے لیے پاکستان سے الحاق کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ ہوتا۔ اس ضلع کی وجہ سے ہندوستان کا براہ راست رابطہ کشمیر سے ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندوستان کشمیر کے متعلق اتنا واویلا نہ کرتا۔ پاکستان کے ایک وزیر مالیات نے ایک بار کہا تھا کہ پاکستان کو اس جانبدار ایوارڈ سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس ضلع سے بڑی تعداد میں مسلمان اٹھ کر پاکستان میں داخل ہوئے۔ اس سے ہندوستان کی سرحدیں کشمیر سے براہ راست مل گئیں۔ سکھوں اور ہندوؤں نے اس ضلع کے مسلمانوں پر آزادی کے وقت بڑے ظلم وستم ڈھائے۔

مسائل: ایک اور مسئلہ جس نے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کو ہوا دی وہ اثاثوں کی غیر منصفانہ تقسیم تھی۔ مئی 1947ء تک اس مسئلے کی طرف بالکل توجہ نہ دی گئی۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تقسیم کے وقت تمام اثاثے ہندوستان کے قبضے میں تھے۔ چنانچہ پاکستان کو مالی اور فوجی اثاثوں میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

مالی اثاثے: تقسیم کے وقت متحدہ (برطانوی) ہندوستان کی کرنسی تقریباً 4,000 ملین روپے تھی۔ پاکستان نے اپنا حصہ جو 1,000 ملین بنتا تھا، مانگا تو بھارت نے دینے سے انکار کر دیا۔ مسئلہ ایک ٹریبونل کے سامنے پیش ہوا جس نے 750 ملین روپے دونوں حکومتوں کی رضامندی سے پاکستان کو دینے کا وعدہ کیا۔ اس سے پہلے پاکستان کو 200 ملین عبوری طور پر مل چکے تھے۔ اس کے بعد سردار پٹیل نے دھمکی دی کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا مالی اثاثے پاکستان کو نہیں دیئے جائیں گے۔ جب اثاثوں کی بات ہو رہی تھی تو کشمیر کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا۔ اس وقت بھارتی حکومت نے سنٹرل بینک کو ہدایت کی کہ پاکستان کے حصہ کا 500 ملین کیش اسے نہ دیا جائے۔ اس کا پاکستان میں شدید ردعمل ہوا اور گاندھی کی بروقت مداخلت سے پاکستان کو 450 ملین روپیہ مل گیا اور 50 ملین پھر بھی رکھ لیے گئے جو آج تک پاکستان کو نہیں ملے۔

دفاعی اثاثے: فوجی اثاثوں کی تقسیم کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے جائنٹ ڈیفنس کونسل قائم کی۔ اس کونسل کے قیام کا مقصد نہ صرف دونوں طرف فوجوں کی تقسیم تھا بلکہ اسلحہ کی تقسیم بھی تھا۔ فیلڈ مارشل کلاڈ اکینک نے جو سپریم کمانڈر اور دونوں طرف کا نمائندہ تھا اندازہ لگایا کہ تقسیم کا کام مارچ 1948ء تک مکمل ہو جائے گا۔ اگرچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جائنٹ ڈیفنس کونسل کا چیئرمین تھا، لیکن سب کچھ سپریم کمانڈر کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ تقسیم کے وقت تک کونسل ٹھیک طرح سے اپنے فرائض سرانجام دیتی رہی لیکن جب تقسیم کا وقت آیا تو ہندوستان نے ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ مشترکہ دفاعی کونسل کو ختم کر دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے سپریم کمانڈر سے ذاتی طور پر شکایت کی کہ ہندو وزیر اس پر الزام لگا رہے ہیں کہ وہ پاکستان کی حمایت کر رہا ہے۔ اس نے پاکستان کے موقف کی حمایت کی اور کہا کہ ہندو بغیر کسی جواز کے پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ پاکستان نے مشترکہ دفاعی کونسل کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے سخت احتجاج کیا لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی اور نومبر 1947ء میں کونسل ختم کر دی گئی۔

کونسل کے ختم ہونے سے پہلے بھارت نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ پاکستان کو اس کے حصہ کا فوجی ساز و

سامان ضرور مہیا کرے گا لیکن جونہی کونسل ختم ہوگئی ہندوستان پھر مکر گیا۔ ایک لاکھ سے زیادہ آرڈیننس سٹورز پاکستان کے حصے میں آئے لیکن صرف 4,730 ملے۔ جو سامان پاکستان کو ملا وہ اکثر ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔ پاکستان کو کسی قسم کی تجربہ گاہ نہ ملی جہاں اسلحہ بنایا یا ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ ٹیلی گراف سٹورز بھارت نے اپنے پاس رکھ لیے۔ پاکستان نے ان اثاثوں کو حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

مشترکہ املاک: دونوں ملکوں میں مہاجرین کی مشترکہ املاک نے تعلقات کشیدہ کر دیئے۔ شہری اور زرعی متروکہ املاک دونوں طرف کے مہاجرین چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے۔ دونوں ملکوں نے نئے آنے والے لوگوں کی چھوڑی گئی جائیداد پر بسانے کی کوشش کی، لیکن مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ متروکہ املاک کا اندازہ کیسے لگایا جائے۔ پاکستان کے لیے ایک اور مشکل یہ بھی تھی کہ یہاں سے جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد ان مہاجرین کے مقابلے میں بہت کم تھی جو بھارت سے آ رہے تھے۔ متروکہ املاک کا مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان کئی سال تک چلتا رہا۔

سردار پٹیل نے دھمکی دی کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا مالی اثاثے پاکستان کو نہیں دیئے جائیں گے۔

اقلیتوں کے مسائل: ایک اور معاملہ جس نے دونوں ملکوں کے تعلقات کو ہمیشہ کشیدہ کیا، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ اگرچہ 1947ء میں دونوں طرف کے لوگ ہجرت کرتے رہے لیکن اس کے بعد بھی ایک خاصی تعداد دونوں ملکوں میں رہ گئی۔ 47 ملین مسلمان ہندوستان میں تھے اور تقریباً 12 ملین ہندو پاکستان میں تھے۔

دریائے سندھ کے پانی کا مسئلہ: یہ مسئلہ دراصل سرحدوں کے تعین کی وجہ سے پیدا ہوا۔ دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا شمال میں برفانی پہاڑوں سے شروع ہوتے ہیں۔ سال کے دوران میں ان کے پانیوں میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ زمینوں کو سارا سال پانی مہیا کرنے کی غرض سے برطانوی ہند کی حکومت نے آبپاشی کے لیے نہروں کا ایک وسیع سلسلہ تعمیر کیا تھا۔ سرحدوں کی تقسیم سے دریائے سندھ کے اس نہری نظام پر اثر پڑا۔ پاکستان میں سیراب کرنے والی نہروں کے زیادہ ہیڈ درکس بھارت میں رہ گئے۔ جس سے بھارت باآسانی پاکستان کو پانی کی سپلائی بند کر سکتا تھا۔ سرحدی کمیشن نے دونوں حکومتوں کی اس یقین دہانی کو مان لیا کہ اس نظام کو متبادل نظام کے وجود میں آنے تک نہ چھیڑا جائے گا۔ لیکن ہندوستان نے اپنے وعدے کا پاس نہ کیا اور 1948ء میں دیپالپور اور سنٹرل دوآبہ کی نہروں کا پانی بند کر دیا۔ لاکھوں کسان بھوک اور افلاس کا شکار ہونے لگے۔ دونوں اطراف سے ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگائے جانے لگے۔ 1951ء میں عالمی بنک نے مسئلے کے حل کی تلاش میں مدد دینے کی ٹھانی۔ مذاکرات 1960ء تک ہوتے رہے جب کہ 1960ء میں پاکستان کے صدر اور ہندوستان کے وزیر اعظم نے سندھ کے پانیوں کے معاہدہ پر دستخط کیے۔ جسے سندھ طاس معاہدہ نام دیا گیا، معاہدہ کی رو سے۔

1۔ پنجاب کے تین مشرقی دریاؤں کا پانی بھارت کو ملے گا اور وہ اگلے دس سال پاکستان کو پانی کی سپلائی جاری رکھے گا۔ جب تک کہ پاکستان متبادل انتظام نہیں کر لیتا۔

2۔ پاکستان کو مغرب کے تین دریاؤں کا پانی ملا۔ لیکن کشمیر میں بھارت ان دریاؤں کا کچھ پانی استعمال کرے گا۔ تاکہ وہ بجلی اور آبپاشی کے وسائل کو ترقی دے۔

3۔10 سال کا عبوری وقفہ تین سال مزید بڑھایا جا سکے گا۔

4۔ اس عبوری وقفے میں پاکستان میں نہروں کا سلسلہ تعمیر کیا جائے گا تاکہ اس کا مشرقی دریاؤں پر انحصار ختم ہو جائے۔

5۔ انڈس ترقیاتی فنڈ قائم کیا گیا جس میں بھارت 174 ملین دے گا۔ دوسری امداد کینیڈا، جرمنی، برطانیہ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا دیں گے۔

کشمیر کا تنازعہ

جو مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان جھگڑوں کی جڑ ہے اور جس نے تعلقات کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کشمیر ہے۔

1۔ پاکستان کے شمال میں واقعہ ریاست جموں اور کشمیر کی زیادہ تر آبادی مسلمان تھی، لیکن اس کا راجہ ہندو تھا۔ بیرونی دنیا سے اس ریاست کا رابطہ پاکستان سے گزرنے والے راستوں کے ذریعے سے ہی تھا۔ صدیوں سے اس ریاست کا تہذیبی، معاشی اور معاشرتی تعلق پاکستان کے علاقوں سے ہے۔ سیالکوٹ اور راولپنڈی کی منڈیوں سے روزمرہ استعمال کی چیزیں کشمیر جاتی تھیں۔

2۔ کشمیر میں اس وقت فسادات شروع ہوئے جب وہاں کے راجہ نے مسلم آبادی کو نظر انداز کر کے بھارت سے الحاق کر لیا۔ ریاست کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور مہاراجہ کی فوجوں کے خلاف صف آراء ہوئے۔ ابتدا پونچھ میں ہوئی۔ جلد ہی فسادات پھیل گئے۔ اکالی سکھوں اور جن سنگھی ہندوؤں نے راجہ کی فوجوں کی حمایت کی۔ اس کا بنیادی مقصد ریاست کی آبادی میں ہندوؤں کی تعداد بڑھانا اور مسلمانوں کو نکالنا تھا۔ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔

3۔ اس وقت کشمیر کے مسلمانوں نے اپنے بھائی بندوں کو اپیل کی کہ وہ انھیں ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم سے نجات دلائیں۔ سینکڑوں قبائلیوں نے اس اپیل پر لبیک کہی اور کشمیر میں داخل ہو کر لڑنا شروع کر دیا۔

4۔ بھارت کی حکومت نے موقع غنیمت جانتے ہی راجہ کو مجبور کیا کہ وہ بھارت سے الحاق کا اعلان کر دے اور وہی ہوا۔ اکتوبر 1947ء میں راجہ نے بھارت سے الحاق کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کو تسلیم کرتے ہوئے راجہ کو لکھا کہ اس ریاست کا مستقبل لوگوں کی مرضی سے طے ہوگا۔ لیکن پاکستان نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بھارتی فوجیں کشمیر میں داخل ہوگئیں۔ پاکستان نے بھی فوجوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا تاکہ ملک کا دفاع ہو سکے۔ اس سے کشمیر کی پہلی جنگ شروع ہوگئی۔

5۔ جنوری 1948ء میں بھارت کی حکومت مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں لے گئی۔ ہندوستان نے پاکستان پر الزام لگایا کہ اس نے قبائلیوں کو حملے پر اکسایا تھا۔ پاکستان نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ بھارت نے دھوکے اور چالبازی سے ریاست کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ 20 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل نے قرارداد کے ذریعے کشمیر کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جس نے 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء میں دو قراردادیں منظور کیں جسے دونوں ملکوں نے تسلیم کیا۔ ان قراردادوں میں خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل تھیں:

1۔ فائر بندی۔

2۔ ریاست سے تمام فوجوں کا انخلاء۔

3۔ آزاد اور غیر جانبدار رائے شماری۔

کشمیر سے متعلق کمیشن نے فائر بندی تو کرا دی لیکن باقی معاملات طے کرنے میں ناکام رہا۔ بہت سے حل پیش کیے گئے، لیکن بھارت نے ہمیشہ حیلوں اور بہانوں سے سب کو ناکام کیا۔ اگست 1950ء میں سلامتی کونسل نے کمیشن کو ختم کر دیا اور اپنے نمائندہ کے ذریعے مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی۔ سر اوون ڈکسن، فرینک گراہم۔ گونر جارنگ نے بڑی کوشش کی۔ لیکن بھارت نے ایک نہ مانی اور مسئلہ جوں کا توں رہا۔ اس کے علاوہ دولت مشترکہ نے بھی اپنے طور پر کوشش کی۔ کئی مذاکرات ہوئے مگر ہمیشہ ناکامی رہی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کا موقف ہمیشہ ایک رہا۔ لیکن بھارت نے اپنے موقف میں کئی بار تبدیلی کی۔ جنگ بندی ہوتے ہی بھارت نے کشمیر کی اصل حالت کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ جب 1954ء میں پاکستان نے مغرب کے ساتھ دفاعی معاہدوں میں شمولیت اختیار کی تو بھارت نے اپنا موقف بدلا۔ اب ایک نیا عنصر داخل ہو گیا۔ اس لیے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

6۔1956ء میں کشمیر میں ڈرافٹ آئین کے ذریعے اسے بھارت کا لازمی جزو قرار دیا گیا جسے بعد میں اسمبلی نے منظوری دی۔ پھر بھارت نے اس آئینی مسودے کو رائے شماری سے تعبیر دینی شروع کر دی۔ 1962ء کی بھارت چین جنگ کے بعد کشمیر کو بھارت کے سیکولرازم کا نشان ٹھہرایا گیا۔ 1963ء میں کشمیر میں حضرت بل مسجد سے موئے مبارک چوری ہونے کے بعد فسادات شروع ہو گئے۔ 1965ء کی جنگ تک کشمیر میں مختلف جگہوں پر مختلف نوعیت کے فسادات ہوتے رہے۔ 1965ء کی جنگ بھی مسئلے کو حل نہ کر سکی۔ 1971ء کی جنگ میں بھی اس مسئلے نے اہم کردار ادا کیا۔ شملہ معاہدہ میں اسے دوطرفہ بنیادوں پر حل کرنے کے لیے دونوں ملکوں نے اتفاق کیا۔ اس کے بعد اب تک کچھ نہیں ہوا۔ پاکستان رائے شماری کا مطالبہ کرتا ہے تو بھارت اسے اپنے ملک کا حصہ تصور کرتا ہے۔ بہرحال اس مسئلے کی وجہ سے دونوں ملک تین بار جنگ کر چکے ہیں۔

مشرقی پاکستان کا بحران

مارچ 1969ء میں یحییٰ خان مارشل لاء کے ذریعے برسر اقتدار آئے۔ دسمبر 1970 میں اس نے ملک میں پہلی بار جنرل الیکشن کروائے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے 2 نشستوں کے علاوہ تمام نشستیں حاصل کیں۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ صدر یحییٰ نے چونکہ نئی قومی اسمبلی کو ایک نیا آئین بنانے کا کام سونپا تھا۔ اس لیے اس نے تمام رہنماؤں اور پارٹیوں کو رضامند کرنا شروع کر دیا۔ لیکن مجیب الرحمٰن کی مخالفت نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اس نے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ جس سے مشرقی پاکستان میں فسادات اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 21 مارچ 1971 کو فوج نے مداخلت کی۔ بہت سے ہندو مہاجرین بھارت چلے گئے۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

بھارت نے رضا کاروں اور مہاجرین کو ٹریننگ مہیا کی۔ 4 دسمبر 1971 تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر بھارت نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ شروع کر دیا۔ جس سے دونوں ملکوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان ملک سے علیحدہ ہو گیا۔

مئی 1998ء میں پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے بعد دفاعی اور خارجہ تعلقات میں یکسر تبدیلی آ گئی۔ پورا مغرب پاکستان کے خلاف ہو گیا۔ امریکا' برطانیہ' جاپان' روس اور فرانس نے ہر قسم کے عسکری و اقتصادی تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بعدازاں نائن الیون کے بعد جب ''ٹریڈ سنٹر'' کے انہدام پر امریکا کو نام نہاد دہشت گردی کے خلاف پاکستان کے تعاون کی ضرورت پیش آئی تو اقتصادی امداد کے دروازے پھر کھل گئے' لیکن دل میں ''کروسیڈ'' کی گرہ پڑی رہی۔ مارچ 2005ء کے پہلے ہفتے میں امریکا کے صدر جارج ڈبلیو بش نے این پی ٹی کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ ایٹمی معاہدے پر دستخط کیے' افغانستان کے صدر حامد کرزئی کو ترغیب دی کہ وہ پاکستان کے اندر بدامنی پیدا کرے' اور واپس واشنگٹن جا کر اعلان کیا کہ ایران امریکا کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ہم اپنے دشمن پر پیشگی حملے کی (عراق اور افغانستان والی) پالیسی پر بدستور قائم ہیں گویا افغانستان' ایران' عراق' اُردن' شام' ترکی' مصر اور سعودی عرب کو اپنے قبضۂ اثر میں لانے کے بعد واحد کانٹا امریکا کے دل میں کھٹکتا ہے' اُس کا حل امریکا نے بھارت کو بڑی سے بڑی ایٹمی طاقت بنانا ہے تاکہ وہ اسرائیل کی مدد سے اسلامی ملکوں کو پنپنے نہ دے۔ جنرل پرویز مشرف نے نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکا کو جو غیر مشروط حمایت دی تھی' اب اُن کی خارجہ پالیسی اور دفاعی حکمتِ عملی بُری طرح ناکام ہو چکی ہے۔

بقیہ: خود احتسابی: زندہ قوموں کا شعار

سے زائد مسلمان جو اس وقت کرۂ ارض پر بستے ہیں' ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے چلی تھی۔ شریعت کا نفاذ اس کا مشن تھا' تاکہ زمین پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی شریعت کی بالادستی ہو۔ وہ واحد حکومت تھی جس کا رخ اللہ کی طرف تھا۔ ہم نے اس کے خاتمے' اور اسلام کے عظیم مجاہدین کو ذبح کرنے میں امریکہ کا ساتھ دیا' اور ڈھٹائی کی انتہا یہ ہے کہ اس پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں' حالانکہ اسلامی حکومت کے خلاف امریکہ کی حمایت اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی جسارت تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی فاسق کو تقویت دینے کے لئے اس کے ساتھ چلتا ہے' اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے' اور اس کا عرش کپکپا اٹھتا ہے۔'' اِس یوٹرن کے بعد نظریۂ پاکستان سے منحرف ہو گئے۔ بعدازاں جہاد کشمیر کے مؤقف سے پسپائی اختیار کی۔ وہ جہاد جس کو شروع شروع میں جنرل پرویز مشرف نے بہت سپورٹ کیا تھا' اور قابل تحسین مؤقف اپنایا تھا کہ یہ جہاد آزادی ہے۔ حریت پسند اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لیکن جب امریکہ بہادر کی طرف سے کہا گیا کہ یہ دہشت گردی ہے' تو ہم نے بھی کہہ دیا اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' اور جہادی تنظیموں پر پابندی لگا دی۔

اور اب امریکی ہدایت پر مدارس کے خلاف یلغار کی جا رہی ہے۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں ہزاروں طلبہ و طالبات کے خلاف بہیمانہ کارروائی اِس کا بدترین مظہر ہے' جس میں نفاذ اسلام' بے حیائی اور عریانی کے خاتمے اور گرائی گئی مساجد کی دوبارہ تعمیر کے جائز مطالبات کو طاقت سے دبا دیا گیا اور بدترین ریاستی طاقت استعمال کر کے معصوم طلبہ و طالبات کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان رسوا کن اقدامات کے باوجود امریکہ کی جانب سے "Do more" کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ ہمیں قبائلی علاقوں میں آپریشن کے احکام دیئے جا رہے ہیں' اور ساتھ ساتھ یہ دھمکی بھی کہ اِن علاقوں میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف آپریشن کا حق ہم محفوظ رکھتے ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو امریکی چنگل سے باہر نکالیں۔ خارجی طور پر صاف کہہ دیا جائے کہ ہمارے نزدیک اللہ اور رسول ﷺ کا حکم مقدم ہے۔ ہم مزید دباؤ برداشت نہیں کریں گے۔ ورنہ اگر ہم نے ماضی کی طرح تورا بورا بننے کے اندیشہ سے ''بڑی طاقت'' کی اطاعت گزاری اور اللہ کی بغاوت کا شیوہ اپنائے رکھا' تو یاد رکھیے' بادشاہ حقیقی کے پاس کسی خطۂ زمین کو تورا بورا بنانے کے بے شمار طریقے ہیں۔ وہ آن واحد میں پورے ملک کو تورا بورا بنا سکتا ہے۔

نہ جا اُس کے تحمل پہ کہ بے ڈھب ہے گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیرگیری سے کہ سخت ہے انتقام اُس کا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خود احتسابی اور توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی کاوشیں

کیسٹ کلب اسکیم

قرآن وحدیث کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ پر ایمان افروز تبصرے کے ساتھ خطابِ جمعہ کا کیسٹ ہر ہفتہ آپ کے گھر پہنچانے کی اسکیم

سالانہ ممبرشپ فیس :-/800 روپے

آسان عربی گرامر ویڈیو کیسٹس / DVDs

گھر بیٹھے عربی گرامر کے قواعد سیکھیے مکمل عربی گرامر کی تدریس

28 ویڈیو کیسٹس / 17 DVDs

میں دستیاب ہے

اہم موضوعات پر لیکچرز

(آڈیو کیسٹس/CDs دستیاب ہیں)

- دین کے تقاضے (ڈاکٹر اسرار احمد)*
- اللہ کا مسلمانوں سے واحد مطالبہ (ڈاکٹر اسرار احمد)*
- فلسفۂ قربانی (ڈاکٹر اسرار احمد)
- لال مسجد کی صورتحال: ایک لمحۂ فکریہ (ڈاکٹر اسرار احمد)
- رمضان کے بعد زندگی کیسے گزاریں (انجینئر نوید احمد)
- ذرا سوچیے (شجاع الدین شیخ)

* DVD میں بھی دستیاب ہے

سود

حرمت۔خباثتیں۔اشکالات

ایک مختصر لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں سود سے متعلق تمام ضروری و بنیادی معلومات اور اعتراضات کے مدلل جوابات شامل کیے گئے ہیں۔انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

منتخب نصاب حصہ اوّل تا ششم

نکات برائے درس وتدریس

دینِ اسلام اور اس کے تقاضوں کے فہم کے لئے منتخب نصابِ قرآنی کی درس و تدریس انتہائی مفید ہے۔

نکات کی صورت میں آیات کا لفظی ترجمہ، تمہیدی وتفسیری تفاصیل موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی دیگر آیات واحادیث کے حوالہ جات

چہرے کا پردہ

علماء ومشائخ، مفکرین، اور ادباء کے مستند مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ

قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی پردے کے احکامات، ان احکامات کی حکمت، چہرے کے پردے کے لئے دلائل، اُمت کا متواتر عمل اور اس حوالے سے اشکالات واعتراضات کے جوابات کتابی صورت میں۔

اہم دینی موضوعات

نکات برائے درس وتدریس

کتابی صورت میں

- اسلام مذہب ہے یا دین؟
- دینِ اسلام پر عمل کیسے کریں؟
- جہاد فی سبیل اللہ
- نبی اکرم ﷺ نے دین کیسے غالب کیا؟
- اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اساس

ایک سالہ قرآن فہمی کورس

دنیا اور آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے دینی وجدید علوم کا سیکھنا ضروری ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کو قواعدِ تجوید، عربی گرامر، ترجمہ وتفسیرِ قرآن وحدیث اور دینی وتحریکی لٹریچر کی تعلیم کا اہتمام باصلاحیت اساتذہ کے زیرِ نگرانی

آغاز ہر سال رمضان المبارک کے بعد

قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟

دینی فرائض کے بیان پر مبنی

نگرانِ انجمن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

کی معرکۃ الآراء کتاب

''مطالباتِ دین''

کا آسان انداز میں خلاصہ

پاکستان کی جوہری توانائی

امریکا اور اُس کے حلیفوں، بھارت اور اسرائیل کے دل سے ایک اسلامی ملک کے ایٹم بم بردار ہونے کا غم وغصہ وقفے وقفے سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں تعینات امریکی کمانڈر ابوزید نے 16 مئی 2007ء کو ایک بیان میں کہا ہے کہ آئندہ وقتوں میں امریکا کے لیے سب سے بڑی مصیبت پاکستان اور سعودی عرب بنیں گے۔

پاکستان کی جوہری توانائی اور وسائل و ذرائع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے 1955ء میں ''پاکستان اٹامک انرجی کونسل'' قائم کی گئی جسے 1956ء میں کمیشن کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ کمیشن وزارتِ سائنس و ٹیکنالوجی کے تحت کام کر رہا ہے۔ کمیشن کے ذمے ایٹمی توانائی کا پُرامن استعمال' تابکار معدنیات کا سروے' تابکار مادوں کی بہم رسانی' خریداری اور تیاری کا کام ہے۔ کمیشن نے دسمبر 1965ء میں اسلام آباد میں پاکستان کا پہلا ایٹمی ری ایکٹر نصب کیا اور اس طرح پاکستان ایٹمی دور میں داخل ہوا۔ 1970ء میں راولپنڈی کے قریب بلور میں ''پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی'' (پنسٹیک) قائم کر کے جوہری سائنس دانوں کی تربیت کا انتظام بھی کیا گیا۔ زراعت کے شعبے میں تین زرعی ایٹمی تحقیقی مراکز پشاور' فیصل آباد اور ٹنڈو جام میں قائم ہیں' جہاں جدید اقسام کی گندم اور دیگر فصلوں کے تخم پر تحقیق کر کے اُن کی افزائش کی جاتی ہے۔ ایسی گھاس دریافت کی گئی ہے جو کھاری پانی اور شور زدہ زمین میں لگائی جا سکتی ہے۔ چولستان میں کھاری پانی والے علاقوں میں گھاس لگانے کے کامیاب تجربے کیے گئے ہیں۔

7 رفروری 2000ء کو ''پاکستان ریگولیٹری اتھارٹی'' (PNRA) قائم کی گئی۔ یہ اتھارٹی ملک کے تمام ایسے اداروں کے تحفظ' ان کے طریقِ کار اور کاموں کی آزادانہ طور پر جانچ پڑتال کرتی ہے۔

ایٹمی بجلی کی ٹیکنالوجی بجلی پیدا کرنے کا ایک اور بڑا ذریعہ ہے۔ ایٹمی بجلی انتہائی قابلِ اعتماد اور باکفایت ہونے کے ساتھ ساتھ ملک میں توانائی کے ماحول کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ ایٹمی پاور پلانٹ (بجلی گھر) نہ صرف ماحول کو آلودہ ہونے سے بچاتا ہے' بلکہ بجلی کی مسلسل فراہمی کا بھی ذریعہ ہے۔ چنانچہ پاکستان میں دو ایٹمی پاور پلانٹ قائم کیے گئے۔ نومبر 1972ء میں کراچی میں ایٹمی بجلی گھر ''کینوپ'' قائم کیا گیا ہے۔ اس کی پیداواری استعداد 137 میگاواٹ ہے۔ دوسرا ایٹمی بجلی گھر چین کے تعاون سے چشمہ (ضلع میانوالی) کے مقام پر 29 مارچ 2001ء سے کام کر رہا ہے۔ اس کی پیداواری استعداد 325 میگاواٹ ہے۔

تابکار معدنیات کا تجزیہ کرنے کے لیے لاہور میں ''اٹامک انرجی منرلز سنٹر'' کام کر رہا ہے۔ ایٹمی توانائی کمیشن کے زیرِ اہتمام فیصل آباد میں بائیو ٹیکنالوجی اور جینیٹک انجینئرنگ کا نیشنل انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ طب وصحت کے شعبے میں کراچی' جام شورو' لاڑکانہ' لاہور' ملتان' اسلام آباد' پشاور اور کوئٹہ میں اٹامک انرجی میڈیکل سنٹر قائم کیے گئے ہیں، جہاں تابکاری کے ذریعے اور کمپیوٹر والے گیما شعاعی کیمروں کی مدد سے بعض پیچیدہ امراض مثلاً سرطان وغیرہ کی تشخیص اور علاج کیا جاتا ہے۔ ان طبی مراکز سے سالانہ تقریباً دو لاکھ مریض استفادہ کرتے ہیں۔

> **1974ء کو بھارت نے پوکھران کے مقام پر زیرِ زمین اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا۔ عوامی ردِعمل کے نتیجے میں اُس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ ہم اپنے دفاع سے غافل نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنی خارجہ پالیسی کو تبدیل کیے بغیر ایٹم بم ضرور بنائیں گے**

پاکستان کے تحفظ اور دفاع کے نقطۂ نظر سے ایک اور اہم ادارہ کہوٹہ ''ایٹمی ریسرچ لیبارٹریز'' ہے' جو وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 1975ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے مشورے سے قائم کیا تھا۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب کی بے لوث خدمات کے پیشِ نظر اس لیبارٹری کا نام بدل کر ''ڈاکٹر اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز'' رکھ دیا گیا۔ ان کی ذاتی مساعی اور دن رات کی مخلصانہ محنت کے نتیجے میں پاکستان دنیائے اسلام کا پہلا (اور اب تک واحد) ایٹم بم بردار ملک بن گیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ 18 رمئی 1974ء کو بھارت نے پوکھران (راجستھان) کے مقام پر زیرِ زمین اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا۔ یہ 10 تا 15 کلوٹن طاقت کا تھا۔ عوامی ردِعمل کے نتیجے میں اُس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ ہم اپنے دفاع سے غافل نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنی خارجہ پالیسی کو تبدیل کیے بغیر ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ اس ضمن میں انہوں نے 23 مئی کو عالمی رہنماؤں کو پیغامات ارسال کیے۔ 15 رجون کو قومی اسمبلی کے ارکان نے قرارداد منظور کر کے بھٹو صاحب سے مطالبہ کیا کہ پاکستان کو بھی ایٹم بم بنانا چاہیے۔

بھارت کے ایٹمی دھماکے کے پیشِ نظر پاکستان نے وسط دسمبر 1976ء میں فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کے خلاف یورپی ممالک اور امریکہ کے ابلاغِ عامہ کے ذرائع نے خوب پروپیگنڈا کیا۔ امریکہ' روس اور بھارت نے فرانس پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان کو ایٹمی پلانٹ فراہم نہ کرے۔

17 رجولائی 1986ء کو وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو کے دورۂ امریکہ کے موقع پر ''پاک امریکہ حساس ٹیکنالوجی'' کا معاہدہ ہوا' جس کے تحت پاکستان کو حساس ٹیکنالوجی خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔ معاہدے میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ امریکہ سے خریدی جانے والی ٹیکنالوجی کو پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا۔

15 ستمبر 1986ء کو پاکستان اور چین کے درمیان بیجنگ میں ایک معاہدے پر پاکستان کی جانب سے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان اور چین کی جانب سے وزیر اعظم ژاؤ یانگ نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کے تحت طے پایا کہ ایٹمی تعاون میں استعمال ہونے والا کوئی بھی سامان اور آلات وغیرہ پیشگی منظوری کے بغیر کسی تیسرے ملک کو منتقل نہ ہوگا۔ نیز یہ کہ ایسے سامان اور آلات وغیرہ پر ''بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی'' کے قواعد وضوابط کا اطلاق ہوگا۔

ایک عرصے سے بھارت اور پاکستان دونوں ممالک میں یہ تشویش پائی جاتی تھی کہ ایٹمی تنصیبات کو باہمی تحفظ نہیں دیا جاسکا۔ دونوں ملکوں کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ ایک ملک دوسرے ملک کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ ہی نہ کر دے۔ چنانچہ 1988ء میں جب بھارتی وزیر اعظم چوتھی سارک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تو 31 دسمبر کو ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا۔

اس معاہدے کے بعد اور بالخصوص بھارت کی جارحانہ اسلحہ سازی اور عسکری تیاریوں کے پیش نظر پاکستان نے اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے ہر قسم کے اسلحے کی تیاری تیز کر دی۔ چنانچہ 14 فروری 1989ء کو زمین سے زمین پر مار کرنے والا میزائل ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ کے حوالے کیا۔ کندھے پر رکھ کر چلائے جانے والے اس میزائل کا نام صحابیٔ رسول ﷺ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے نیزے کے نام پر ''عنزہ'' رکھا گیا۔ حضرت زبیرؓ نے یہ نیزہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور جنگ خیبر میں استعمال کیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی یہ نیزہ متعدد غزوات میں استعمال کیا تھا۔ عنزہ 50 میٹر سے 5 ہزار میٹر بلندی تک مار کرسکتا ہے۔ لیزر رینج فائنڈر 50 بھی تیار کیا گیا، جو 15 ہزار میٹر تک دشمن کے طیاروں کا سراغ لگا سکتا ہے۔

جولائی 1996ء میں پاکستان اور فرانس کے مابین ایک معاہدہ طے پایا، جس کے تحت فرانس نے پاک بحریہ کو 133 ملین ڈالر کے عوض 18 عدد 39 ایس ایم میزائل فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ میزائل آبدوز سے فائر کیے جاتے ہیں۔ معاہدے کے مطابق ایک میزائل کی قیمت 5.6 ملین ڈالر یعنی 2 کروڑ 24 لاکھ روپے مقرر کی گئی۔

بھارت ایٹمی میزائلوں کے میدان میں کافی پیش رفت کر چکا تھا۔ وہ آئے روز کسی نہ کسی میزائل کا تجربہ کرتا تھا، جس سے اس خطے میں طاقت کا توازن کافی حد تک بگڑ چکا تھا۔ اس کو درست کرنے کے لیے پاکستان نے

برطانوی تھنک ٹینک انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار سٹریٹیجک سٹڈیز کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

پاکستان، بھارت، شمالی کوریا، لیبیا، ایران، ارجنٹائن، برازیل، مصر، جنوبی افریقہ، شام اور اسرائیل نے غیر قانونی ذرائع سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کی

6 اپریل 1998ء کو اپنے تیار کردہ زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائل کا کامیاب تجربہ کیا جو 700 کلوگرام وزن لے جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ غوری میزائل نئی دہلی سے مدراس تک تمام بھارتی شہروں تک مار کرسکتا ہے اور بھارتی میزائلوں اگنی، پرتھوی اور آکاش کے توڑ کے لیے بنایا گیا ہے۔ ڈیڑھ ہزار کلومیٹر تک پرواز کے لیے اسے 13 ٹن ایندھن درکار ہوتا ہے۔ اس کے دھماکا خیز مواد کا وزن ایک ٹن ہے۔

11 اور 13 مئی 1998ء کو جب بھارت نے پوکھران (راجستھان) میں پانچ ایٹمی دھماکے کیے تو وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم کی صلاحیت ہے نہ مطلوبہ ساز وسامان۔ اُدھر دنیا بھر سے پاکستان پر دباؤ ڈالا گیا کہ ایٹمی دھماکہ نہ کرے اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنے کی اپیل کی۔ امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے ایک ہی رات میں وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کو پانچ بار فون کر کے دباؤ ڈالا کہ وہ ایٹمی دھماکا نہ کرنے کے عوض اربوں ڈالر کی امداد حاصل کرے۔

وزیر اعظم پاکستان نے چین کو بھی اعتماد میں لیا اور اسلامی ممالک کے سربراہوں سے بھی مشورہ کیا۔ عرب ممالک نے بھی پاکستان پر زور دیا کہ وہ وقت ضائع کیے بغیر ایٹمی دھماکہ کرے۔ چنانچہ پاکستان نے زیر زمین 28 اور 30 مئی 1998ء کو سات ایٹمی دھماکے بلوچستان میں چاغی کے مقام پر کیے اور دنیا کو حیران کر دیا۔ پاکستان ایٹمی دھماکے کرنے والا دنیائے اسلام کا پہلا اور دنیا کا ساتواں ملک بن گیا۔ تاہم امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں نے کہا کہ پاکستان اور انڈیا دونوں کو ایٹمی ممالک تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

گیارہ ستمبر 2001ء کو ٹریڈ سنٹر (نیویارک) کے انہدام کے بعد جب اُسامہ بن لادن، القاعدہ اور طالبان کے خلاف امریکا نے عالمی طاغوتی جنگ کا آغاز کیا اور پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کو بھی دھمکی دے کر اس جنگ میں شریک ہونے پر مجبور کیا تو پاکستان کی ایٹمی توانائی کو بھی ہدف بنایا گیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اُن کے ایٹم بم کے خلاف امریکا اور اُس کی اتحادی قوتیں پہلے ہی غصے اور انتقام کی آگ میں جل رہی تھیں۔ اب انہوں نے باقاعدہ الزام عائد کیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایٹمی اسلحہ یا کم از کم ایٹم بم کی ٹیکنالوجی شمالی کوریا، ایران اور لیبیا کو فروخت کی ہے۔ انہوں نے باقاعدہ فردِ جرم عائد کی کہ یہ سب کچھ غیر ریاستی بلیک مارکیٹ گروپ (ملکیتی عبدالقدیر خان) (باقی صفحہ 9 پر)

پاکستان کی خلائی تحقیق

خلائی تحقیق کرنے والے قومی ادارے ''سپارکو'' نے اقتصادی، سائنسی اور ابلاغی پروگرام کا آغاز 7 جون 1962ء کو ''رہبر اوّل'' نامی راکٹ خلا میں چھوڑ کر کیا۔ اس کے بعد کئی سو چھوٹے بڑے راکٹ چھوڑے جاتے رہے ہیں جن میں ''شاہ پر'' اور ''رہنما'' شامل ہیں۔ پاکستان کا پہلا مصنوعی سیارہ ''بدر اوّل'' تھا جو 15 جولائی 1990ء کو چین کے لانگ مارچ 2E لانچر کے ذریعے خلا میں چھوڑا گیا۔ یہ روس کے اسپوتنک اوّل سے بڑا تھا۔ اس اعتبار سے پاکستان خلا میں سیارہ چھوڑنے والا پہلا اسلامی ملک بن گیا۔ یہ سیارہ مکمل طور پر پاکستانی سائنس دانوں اور انجینئروں نے ڈیزائن کیا تھا۔ بدر اوّل کی شکل دائرہ نما تھی۔ اس کی جسامت ساڑھے تین کعب فٹ، وزن 50 کلوگرام تھا۔ اس کا جدید الیکٹرانک نظام زمینی مرکز سے معلومات حاصل کرنے، ذخیرہ کرنے اور ترسیل کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شمسی توانائی سے چلنے والا یہ سیارہ دو سو فٹ سے ایک ہزار کلومیٹر کی بلندی سے ہر 98 منٹ کے بعد زمین کے گرد اپنا چکر مکمل کرتا تھا۔ وہ جس مدار پر محوِ سفر رہا، اُس کا زمین سے کم سے کم فاصلہ 211 کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ فاصلہ 992 کلومیٹر تھا۔ یہ سیارہ 20 راگست 1990ء تک معلومات فراہم کرتا رہا۔ بعد ازاں یہ خلا کی پہنائیوں میں گم ہوگیا۔ دوسرا مصنوعی سیارہ ''بدر دوم'' 1998ء میں کامیابی سے چھوڑا گیا۔ 1998ء میں ایٹمی دھماکوں کے بعد مصنوعی سیاروں سے آگے بڑھ کر متعدد میزائل فضا میں چھوڑے گئے۔

خود احتسابی: زندہ قوموں کا شعار

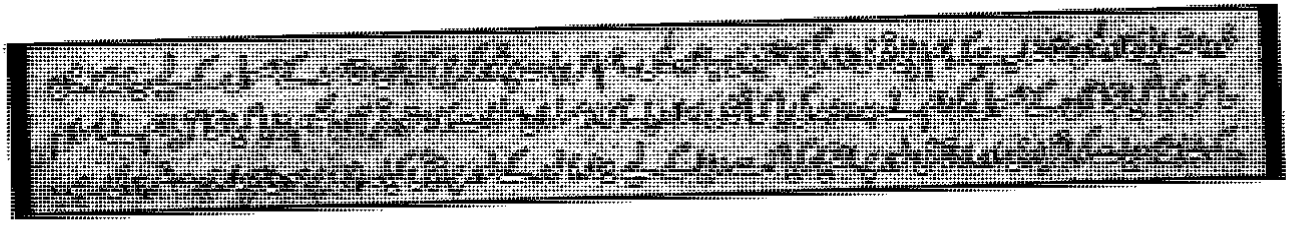

حافظ عاکف سعید
امیر تنظیم اسلامی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ.....﴾ (الانبیاء:18)

یعنی ''ہم حق کا کوڑا برساتے ہیں باطل کی پیٹھ پر تو اس کا بھیجہ باہر نکل آتا ہے اور وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے''

علامہ اقبال نے قرآن مجید کی اس آیت کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ کہتے ہیں۔

صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

وہ قوم جو ہر دور میں اپنے عمل کا احتساب کرنے کی عادی ہو' اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک شمشیر کی مانند ہے' جس کے ذریعے ربّ کائنات دنیا میں اپنی برتری اور حکمرانی کا سکہ جماتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ باطل کا قلع قمع کرنے' اُسے نیست و نابود کرنے کے لیے ایسی قوم سے کام لیتا ہے جو سچائی کی علمبردار ہو۔ ایسی قوم کا ایک اہم وصف اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے عمل کا حساب کرتی ہے' اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کرتی ہے' اپنے حالات کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھتی اور اُن کی روشنی میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرتی ہے۔

ہم ہر سال یوم آزادی مناتے ہیں۔ آزادی کی خوشی میں روایتی جوش و خروش کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کچھ پروگرام اور سیمینارز وغیرہ منعقد ہوتے ہیں۔ میڈیا پر صدر اور وزیراعظم کے پیغامات نشر کیے جاتے ہیں اور شہروں کو قومی پرچموں اور جھنڈیوں سے سجا دیا جاتا ہے' اور بس! حالانکہ یوم آزادی ہو یا مصوّر پاکستان کے حوالے سے یوم اقبال' ان کا اصل پیغام خود احتسابی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ ہماری قوم کے زندہ ہونے کی دلیل ہوگی' ورنہ ہمارا شمار زندہ قوموں میں نہیں ہوگا' چاہے ہم کتنی ہی شان و شوکت کے ساتھ یہ ایام منالیں۔

خود احتسابی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کا تنقیدی جائزہ لیں۔ ہم اس بات پر غور کریں کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا' اُن کے حصول کی ہم نے جدوجہد کی یا کہ انہیں بھلا دیا۔ پاکستان کے لیے جس منزل کا تعین کیا گیا تھا' اس کی جانب پیش رفت کی یا ہم الٹے پاؤں پھر گئے۔ ہم نے ہندوؤں سے الگ ''قومیت'' کی بنیاد پر علیحدہ ملک حاصل کیا تھا۔ نظریۂ پاکستان کی جان اسلام قرار پایا تھا۔ آزاد مسلمان سلطنت کا دستور قرآن حکیم بتایا گیا تھا' آیا ہم نے اسلام کے ضابطۂ حیات کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اختیار کیا' اسے دنیا کے لیے مینارۂ نور کے طور پر پیش کیا۔ اِس پر سوچ بچار بہت ضروری ہے۔

پاکستان کو قائم ہوئے ساٹھ برس پورے ہو چکے ہیں۔ ہمیں بار بار خدائی عذاب کے جھٹکے لگ رہے ہیں۔ ہمیں اب تو ہوش میں آ جانا چاہئے' کچھ تو غور و فکر کرنا چاہئے۔ ہمارے حکمرانوں' سیاستدانوں اور علماء کو اپنے اندر یہ اخلاقی جرأت پیدا کرنی چاہئے کہ اپنا احتساب کریں کہ آیا انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا ہے یا نہیں! عوام میں یہ احساس پیدا ہونا چاہئے' وہ اپنا محاسبہ کریں کہ ان کی زندگی اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق بسر ہو رہی ہے' یا اُس کے ضابطوں کے خلاف۔ حدیث رسولؐ ہے

((حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا))

(سنن الترمذی)

''تم اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔''

یہ حدیث ایک عمومی ہدایت ہے' جسے ہر فرد کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور قوم کو بھی! مدعا یہ ہے کہ اے لوگو! جب کل روز قیامت جب تمہارا محاسبہ ہوگا' اس سے پہلے اپنا حساب خود کرو' خود احتسابی کی عادت ڈالو۔ اس لیے کہ تم اس وقت امتحان کے کٹہرے میں ہو۔ تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اگر احساس نہیں کرو گے تو سارا نقصان تمہارا ہوگا۔ تم اپنا مستقبل تباہ کرو گے۔ اپنی عاقبت برباد کرو گے۔

آیئے دیکھیں! قیام پاکستان کے وقت مسلمان ہندوستان کن حالات سے دوچار تھے؟ اور حصولِ پاکستان کا اصل مقصد کیا تھا؟ وہ کیا محرکات اور حالات تھے جب برصغیر کی مسلمان قوم ایک جھنڈے تلے جمع ہوئی' اور ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ'' کا نعرہ لگایا۔

سورۃ الانفال کی آیت نمبر 26 کا مضمون بالکل ان حالات کی عکاسی کرتا ہے جن حالات میں پاکستان قائم ہوا تھا۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں مسلمانان ہند کے احوال کی اس آیت کے مضمون سے عجیب مشابہت ہے۔ فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝﴾

''اور یاد کرو اُس وقت کو جب تم (تعداد میں) تھوڑے تھے' ملک میں مغلوب پڑے ہوئے تھے۔ تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک لیں گے۔ پھر اُس (اللہ تعالیٰ) نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے قوت دی اور تمہیں صاف ستھری چیزوں کا رزق دیا' تاکہ شکر کرو۔''

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم تھے۔ وہ مغلوب ہو گئے تھے' اور اپنے ہی وطن میں بے بسی کا

شکار تھے، کیونکہ متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہندوستان کے قابض حکمران انگریز بھی مسلمانوں کے دشمن تھے۔ ان کی دشمنی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو، جو برصغیر پر حکومت کر رہے تھے، شکست دے کر یہاں کا اقتدار حاصل کیا تھا اور دوسری اور اصل وجۂ رقابت ان کی اسلام دشمنی تھی۔ یہود و نصاریٰ روزِ اوّل سے مسلمانوں اور ان کے دین کے دشمن ہیں۔ قرآن واضح طور پر بتا رہا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ...﴾ (المائدۃ:51)

''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنے دوست نہ بناؤ (یہ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے) یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں''۔

ہندوؤں اور انگریزوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کو دبایا جا رہا تھا۔ تعلیم، سرکاری ملازمتوں، کاروبار اور تجارت میں ترقی کے دروازے اُن پر بند تھے اور ہندو روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو اپنے قومی وجود اور اپنے تشخص کے مٹنے کا خطرہ تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ہندو انہیں اچک لے جائیں گے۔ اسلام کو اِس قدر شدید خطرہ لاحق تھا کہ برصغیر سے اُس کا نام و نشان مٹانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے شدھی اور سنگھٹن جیسی انتہا پسند تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پناہ گاہ دی۔ پاکستان کی شکل میں ایک آزاد خطۂ زمین عطا فرمایا، وہ خطہ جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔

پاکستان کا وجود میں آنا ناممکن اور محال تھا۔ انگریز اور ہندو دونوں قیامِ پاکستان کے مخالف تھے اور مسلمان انتہائی کمزور تھے۔ اس کے علاوہ ایسے بیسیوں شواہد موجود ہیں کہ پاکستان ہرگز قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود معجزانہ طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ ہمیں خطۂ زمین عطا فرمایا اور انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات عطا فرمائی، تاکہ ہم آزاد مملکت میں خلافت کا نظام قائم کریں، اسلامی اصولوں کی بنیاد پر نظامِ معیشت ترتیب دیں، اپنی Social Values کو ترقی دیں۔ اللہ نے ہمیں بے شمار وسائل سے مالا مال کیا۔

آزادی کی اس نعمت عظیمہ کی بنا پر ہم پر لازم تھا کہ اللہ کا شکر بجا لاتے۔ شکر کا تقاضا یہ تھا کہ ہماری انفرادی زندگی بھی اس بات کی گواہی دیتی کہ ہم واقعتاً سچے مسلمان ہیں۔ ہمارا طرزِ زندگی خدا کی کامل بندگی کا نمونہ ہوتا۔ ہم ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی مثال بنتے، تاکہ دنیا ایک بندہ مومن کا کردار ملاحظہ کرتی اور یہ دیکھتی کہ مومن کے نزدیک اصل اہمیت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔ اس کی منزل دنیا نہیں، آخرت ہے۔

شکر کا دوسرا تقاضا یہ تھا کہ ہم اجتماعی سطح پر دین کو قائم کرتے، اسلام کے عدلِ اجتماعی کا کامل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے۔ وطنِ عزیز کو پان اسلام ازم اور اسلام کے عالمی غلبے کی بنیاد بناتے۔ یہ نہ صرف یہ کہ رب کے شکر کا لازمی تقاضا تھا بلکہ ہمارا بنیادی دینی فریضہ بھی تھا۔ اسی لئے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی متعدد تقاریر میں

وہ قوم جو ہر دور میں اپنے عمل کا احتساب کرنے کی عادی ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک شمشیر کی مانند ہے، جس کے ذریعے ربّ کائنات دنیا میں اپنی برتری اور حکمرانی کا سکہ جماتا ہے

اسلامی حکومت کی بات کی تھی۔ دستور پاکستان کے سوال پر انہوں نے دوٹوک کہا تھا کہ ہمارا دستور قرآن ہوگا، جو چودہ سو سال پہلے ہمیں عطا کر دیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست کے لئے ان کے سامنے آئیڈیل دورِ خلافت راشدہ کا تھا۔ مگر افسوس کہ ہم نے ناشکری کی اور انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر کفرانِ نعمت کی روش اپنائے رکھی۔

افراد کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو آج بحیثیت مجموعی معصیت، نافرمانی اور دین سے دوری کا چلن عام ہے۔ اگرچہ سوسائٹی میں صاحب کردار لوگ بھی موجود ہیں، مگر ان کی شرح بہت کم ہے۔ عام مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ دو ٹکے کا فائدہ نظر آئے تو اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر اسلامی تعلیمات کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ معاشی میدان میں ہم دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے لیے قرآن کا جھوٹا حلف اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ دنیا پرستی اور مفاد پرستی کا زہر پورے معاشرے میں سرایت کر چکا ہے۔ عوام ہوں یا حکمران، سیاستدان ہوں یا علماء کا طبقہ، کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں۔ دینداری کے نام پر بھی دنیاداری ہو رہی ہے۔ اندریں حالات جب تک ہم اپنے اعمال اور کردار کی اصلاح نہیں کرتے، بلکہ ایک طبقے کو مطعون کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ساری خرابی اور سارے مسائل کی جڑ حکومت ہے، ہماری حالت تبدیل نہ ہوگی۔

ہماری ناشکری کی انتہا یہ ہے کہ وہ نظریہ جس کی بنیاد پر ہم نے پاکستان حاصل کیا، اسی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے گئے۔ ہمارے نام نہاد دانشوروں نے قائداعظم کی گیارہ ستمبر کی تاریخ کی تقریر سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ ایک سیکولر ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ کس قدر بے انصافی کی بات ہے کہ ان کی سینکڑوں تقاریر کو جن میں اسلامی ریاست کی بات کی گئی تھی، پس پشت ڈال کر ایک مشتبہ بیان پر پورے گمراہ کن موقف کی بنیاد کھڑی کی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سیکولرازم ہی ہمارا آئیڈیل تھا، تو پھر علیحدہ وطن کی تحریک چلانے اور ہندوستان کے بٹوارہ کی کیا ضرورت تھی، پھر اسی کا حصہ بن کر رہتے۔ وہاں تو جمہوریت بھی ہے، ہم تو جمہوریت بھی نہیں لا سکے۔ انہوں نے تو جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر دیا، جو ظلم کی بنیاد ہے۔ ہم وہ بھی نہیں کر سکے۔

ہم نے نظریۂ پاکستان سے عملاً انحراف تو کیا ہی تھا، پستی کی انتہا یہ ہے کہ اب نظری طور پر بھی اُسے ختم کرنے کی مذموم کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسے نصابِ تعلیم سے کھرچ دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ نظریۂ پاکستان کی زد ہندوؤں پر پڑتی ہے۔ یہ کہنا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، رواداری کے خلاف ہے۔ اسی طرح نام نہاد ''روشن خیالی'' کے نام پر اسلام کا جو تصور مغرب دے رہا ہے، اس کے خلاف مواد کو نکالا جا رہا ہے۔ نصاب میں دین اور دینی اقدار کا ''سافٹ'' امیج پیدا کیا جا رہا ہے۔ جو دین ہمیں نبی اکرم ﷺ نے دیا تھا، گویا اسے ہم مسترد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہمیں وہ 'دین' گوارا ہے جو یورپ سے آ رہا ہے۔ اگرچہ پاکستان کا تعلیمی نصاب پہلے ہی قومی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ملک میں کئی قسم کے نصاب رائج ہیں۔ ہماری ایلیٹ کلاس کو جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، اس کا نظریۂ پاکستان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ وہ تو مغرب سے درآمدہ ہے۔ اِس طرح وہ کلاس جو روزِ اوّل سے پاکستان پر حکومت کرتی چلی آ رہی ہے، وہ تو پہلے سے ہی نظریۂ پاکستان اور دین و مذہب سے بھی کاٹ دی گئی تھی۔ اب سرکاری سکولوں کے نصاب میں جو تھوڑا بہت نظریاتی پہلو تھا، اُسے بھی کھرچ دیا گیا۔ حالانکہ نصاب سے نظریۂ پاکستان کو خارج کرنے کا مطلب یہ ہے

کہ گویا ہم اپنی پھانسی کے حکم نامے پر دستخط کر رہے ہیں اور پاکستان کی بنیادوں سے دستبردار ہو رہے ہیں۔

نصابی تبدیلیوں کے علاوہ پورے معاشرہ سے ''روشن خیالی'' کے گمراہ کن نعرہ کے تحت دینی اقدار مٹائی جا رہی ہیں اور خاص طور پر سنتِ رسول ﷺ اور اسوۂ رسولؐ کے تصورات کو بالکل ہی خارج کیا جا رہا ہے۔ یہ خیال عام کیا جا رہا ہے کہ اسلام تو بس ''روشن خیالی'' اور رواداری کا نام ہے۔ اور قرآن مجید کی آیات کی غلط تاویلات کی جا رہی ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اِس گمراہی کے پس پردہ خطرناک سازش کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ (معاذ اللہ) دین مصطفیٰ ﷺ ہمیں قبول نہیں' حالانکہ اللہ کے نزدیک دین وہی معتبر ہے جس کی تعبیر کا حق صرف حضور ﷺ کو ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے۔ فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:80)

''جو رسول کی اطاعت کرے' اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی''۔

برصغیر پاک و ہند میں ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اکبر کے دین الٰہی کی کوشش بھی اس دور کی ''روشن خیالی'' تھی۔ اس کا عنوان بھی رواداری تھا۔ دین الٰہی کے پس پردہ یہی سوچ کارفرما تھی کہ مذاہب کی تفریق ختم کر کے سب کو ایک کر دیا جائے۔ آخر ہندو بھی بھگوان کو مانتے ہیں' عیسائی بھی اللہ کو مانتے ہیں' کوئی یہودی ہے تو وہ بھی اللہ کو مانتا ہے۔ بدھ مت میں بھی کوئی تصورِ خدا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ تمام مذاہب کی چیدہ چیدہ تعلیمات لے کر دین کا معجون تیار کیا جائے' جو سب مذاہب کے لئے قابل قبول ہو۔

پس یہ واضح ہے کہ ماڈریشن کے حوالے سے جو نیا تصورِ اسلام مسلّط کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں' یہ اسلام' وہ دین خالص نہیں جس کو رسول خدا ﷺ سے لے کر تشریف لائے' بلکہ یہ اصل میں ''دینِ امریکہ'' ہے۔ اور اس کو پروموٹ کرنے کا شرف آج مغل بادشاہ اکبر کی بجائے فوجی ''بادشاہ'' پرویز مشرف کو حاصل ہے۔ پھر جیسے اکبر کو اپنے باطل افکار کی تائید اور ترویج کے لیے ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے بڑے مفاد پرست' دانشور اور نام نہاد علماء و فضلاء مل گئے تھے' اسی طرح ہمارے صدر صاحب کے افکار کو بھی بہت سے متجدّدانہ سوچ رکھنے والے عقل گزیدہ دانشور اور سکالرز سند جواز ''عطا'' کر رہے ہیں۔

ہمارے ملک کے ممتاز دانشور فاروق حسن کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے دورے پر گئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو بات لکھی' وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندو وکلاء برادری سے ملاقات کے دوران ہندوؤں نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان بنا کر آپ نے کیا حاصل کیا' وہ کون سی چیز ہے جو آپ اسلام اور مذہب کے حوالے سے پاکستان میں لے آئے اور انڈیا میں موجود نہیں ہے۔ مذہبی آزادی جو پاکستان میں ہے وہ یہاں بھی ہے۔ کیا یہاں (انڈیا میں) مسجدیں نہیں ہیں' اذانیں نہیں ہوتیں' لوگ نماز نہیں پڑھتے' روزے نہیں رکھتے' زکوٰۃ نہیں دیتے۔ بتایئے' پاکستان اور انڈیا میں کون سا فرق ہوا۔ فاروق حسن صاحب کہتے ہیں کہ میں بالکل لاجواب ہو گیا۔ اِس واقعہ میں ہمارے لیے غور و فکر کا بہت سا سامان ہے۔ ہمارے ان لوگوں کو شرم آنی چاہئے جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر نہیں بنا تھا۔ یہ آزادی کی ناقدری اور کفرانِ نعمت کی انتہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم نظریۂ پاکستان کو مضبوط کرتے ہم نے اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے۔ افسوس کہ ہمیں ''اوپر'' سے جو حکم ملا ہے' اُس کی بجا آوری کے لیے ہم نظریۂ پاکستان کو اپنی ہی چھری سے ذبح کر رہے اور پاکستان کی بنیاد ہی کو کھوکھلا کر رہے ہیں

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

ہماری سیاہ کاریوں اور کفرانِ نعمت کے سبب 1971ء میں خدا کے عذاب کا ایک کوڑا ہم پر برسا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت دولخت ہوتا۔ ہمارا مشرقی بازو ہم سے جدا ہو کر بنگلہ دیش بن گیا' اور پاکستانی قوم اور فوج کو بدترین ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ سقوط ڈھاکہ خواب سے بیدار ہونے کا موقع تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہم واپس نظریۂ پاکستان کی طرف پلٹتے اور اللہ اور اس کے دین کی طرف رجوع کرتے' خود احتسابی کی نظر سے اپنا جائزہ لیتے' اصلاحِ عمل کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ لیکن ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے نہ ہی اپنی روش تبدیل کی۔ سقوط ڈھاکہ کے عظیم سانحہ اور خدائی جھٹکے کو بھی بھلا بیٹھے' بلکہ ہم نے یہ قرار دیا کہ اس طرح کے انقلابات قوموں کی زندگی میں آتے رہتے ہیں۔

ہماری اِس روش پر اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ہمیں پھر مہلت دی۔ جنگ و جدل کا دور ختم ہو گیا۔ حالات موافق ہو گئے۔ ہمیں ترقی عطا فرمائی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں ایٹمی صلاحیت سے بھی نواز دیا' جو بلاشبہ اللہ کی نصرت و تائید خصوصی کا ایک بہت بڑا مظہر تھا۔ ورنہ پاکستان کا تو شمار دنیا کے پسماندہ ترین ممالک میں ہوتا ہے' جہاں علم و تحقیق اور ریسرچ کے معیار کا یہ حال ہے کہ دنیا کے کئی ممالک میں اُسے "Accept" ہی نہیں کیا جاتا۔ گویا علمی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے حوالے سے ہم اس قابل نہیں تھے کہ ہمیں ایٹمی ٹیکنالوجی ملتی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے باوجود ہمیں ایٹمی صلاحیت مرحمت فرمائی تو یہ اس کا خصوصی فضل تھا۔ لیکن ہم نے اس کی بھی کوئی قدر نہیں کی۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ نام نہاد روشن خیالی کے عنوان سے معاشرے سے دینی اقدار مٹائی جا رہی ہیں، اور سنت و اسوۂ رسولؐ کے تصورات کو عملی زندگی سے خارج کرنے کی گھناؤنی سازش کی جا رہی ہے

اپنے اصل مقاصد اور اہداف سے پسپائی میں اب تو اور بھی تیزی آ گئی ہے۔ اسلام اور دینی اقدار سے قوم کو دور کیا جا رہا ہے۔ یہود' نصاریٰ اور ہنود یا اسرائیل' امریکہ اور بھارت تینوں کی شیطانی تثلیث' جو پاکستان کے وجود کو مٹانے کے درپے ہے' کے دباؤ کے نتیجے میں ہم حقیقی اسلام سے منہ موڑ کر روشن خیال اعتدال پسندی کے راگ الاپنے لگے ہیں۔ ہم دشمنانِ دین کو باور کرا رہے ہیں کہ اسلام کی جو تعبیر تمہیں پسند ہے' اسے اختیار کریں گے' قرآن حکیم اور سنت رسولؐ پر مبنی اسلام کی بجائے تمہارے افکار و نظریات کی کوکھ سے جنم لینے والی ''روشن خیالی'' کو اسلام کا لبادہ پہنائیں گے۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم اسلام کا سافٹ امیج پیش کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام میں اس کی گنجائش کہاں ہے۔ اگر سافٹ امیج اور روشن خیالی اسی کا نام ہے کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کر کے اغیار کے ''Certified Islam'' کو اپنا لیا جائے تو اُسے دجل و فریب اور ابلیسیت کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

تھوڑا عرصہ پہلے آنے والے زلزلہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں غور و فکر اور خود احتسابی کا ایک اور موقع دیا ہے۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ اتنا ہولناک زلزلہ کیوں آیا؟ اگر اب بھی ہم اپنا محاسبہ کر لیں' اسلام کی طرف مراجعت

کریں‘ نظریۂ پاکستان کی جانب پیش قدمی کریں تو پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے حکمران طبقہ اپنی سوچ کی اصلاح کرے۔ اپنی سابقہ کوتاہیوں پر نادم ہو کر حصول پاکستان کے اصل مقاصد کی جانب پیش قدمی کرے۔ اس کے بعد قوم کو بیدار کیا جائے‘ انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ سوچیں یہ زلزلہ کیوں آیا ہے؟ وہ اپنے گناہوں سے معافی مانگیں‘ اللہ کی اطاعت کا عہد کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ تو تھی داخلی صورتحال، اب آیئے، ایک نظر خارجہ پالیسی پر ڈالیں۔ اس وقت حالات کے تیور یہ بتا رہے ہیں کہ ابلیسی قوتیں ایک شیطانی مثلث کی شکل میں پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہیں۔ ان کا سرخیل تو امریکہ ہے‘ لیکن اُس کی ڈور ہلانے والی اصل قوت اور ماسٹر مائنڈ اسرائیل (یہود) ہے۔ کسی زمانے میں یہ بات ایک انکشاف ہوا کرتی تھی‘ اب یہ راز نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے‘ جسے ہر شخص جانتا ہے۔ اور تیسری قوت ہنود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں قوتیں مل کر پاکستان اور اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ بحالات موجودہ کوئی احمق ہی ہوگا جو یہ سمجھتا ہو کہ امریکہ کی نظرِ ''بد'' ہمارے ایٹمی پروگرام پر نہیں ہے اور وہ اس کو ختم نہیں کرنا چاہتا ہے۔ باخبر حلقے جانتے ہیں کہ امریکہ کا اصل ٹارگٹ پاکستان ہے۔ کیا امریکی ناظم الامور رابرٹ او بلیک کے بیان کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں گی؟ انہوں نے دوٹوک لفظوں میں کہا ہے کہ ہم بھارت کے ساتھ مل کر کسی‘ تیسرے ملک کے خلاف مشترکہ فوجی آپریشن کر سکتے ہیں۔ یہ تیسرا ملک کون سا ہے‘ بتانے کی ضرورت نہیں

رضا جوئی حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ ان کی خوشنودی کے لئے اپنی آزادی‘ خودمختاری اور اسلامی تشخص کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لئے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ گویا ہمارا حال یہ ہے کہ ؎

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ میرے فرش پر نہ رینگ

یہ صورتِ حال پوری قوم ‘بالخصوص‘ کالج و یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے لوگوں اور مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے وابستہ اُن افراد کے لیے لمحہ فکریہ ہے، جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ یوم آزادی مناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فی الواقع پاکستان آزاد ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم نے ساٹھ برسوں کے سفر [illegible] گنوایا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ کیسی آزادی ہے کہ ہم نہ سیاسی طور پر آزاد ہیں نہ دینی اور مذہبی طور پر۔ ہم نے غلط فہمیوں کی جو پٹیاں آنکھوں پر باندھی ہیں اب انہیں اتارنے کا وقت آ چکا ہے۔ اقبال نے ایک موقع پر ملا کے تصورِ دین پر جو پھبتی کسی تھی‘ وہ آج ان لوگوں پر صادق آتی ہے۔ ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اِن حالات میں ہم اپنے آپ کو آزاد کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ مذہب اور دین کے معاملے میں بھی ہم پر بھی اختیار نہیں کہ وہ ''اوپری'' فیصلوں پر بحث کرے۔ دراصل ہم نے اپنے مالک سے بغاوت کر رکھی ہے۔ ہم نے کبھی اللہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ ہمیشہ شیطانی قوتوں پر بھروسہ کیا۔ اپنی ساٹھ سالہ تاریخ میں امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بن کر اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار رہے‘ لیکن اللہ کی خوشنودی کے لئے ہم ایک قدم اٹھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ ؎

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں‘ خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

اگر ان حالات میں جبکہ ہمارے خلاف سازشوں کے جال بُنے جا رہے ہیں ہم امریکہ سے کسی قسم کا تعاون کرتے ہیں‘ یا اس سے خیر کی توقع رکھتے ہیں تو اِس کا [illegible] قوم میں ہمت‘ مردانگی اور غیرت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ گویا وہ جو چاہیں، ہم سے مطالبہ کریں‘ ہم اُسے پورا کرنے کے لئے آمادہ اور تیار ہیں۔ یہ ذہنی اور فکری پستی آزاد قوموں کا شعار نہیں ہے‘ خاص طور پر مسلمانوں اور مومنوں کو یہ روش زیب نہیں دیتی۔

نائن الیون کے بعد ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا‘ افغان پالیسی کے حوالے سے یوٹرن لیا‘ وہ بھی اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔ آیئے، اس کا قرآن و سنت اور سیرت کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں۔ آخر ہم مسلمان ہیں۔ مشرف صاحب بھی اس پر بہت فخر کرتے ہیں‘ کہ میں مسلمان ہوں اور سید زادہ ہوں‘ تو مسلمان کے لئے اصل رہنمائی قرآن و سنت اور سیرت رسولؐ ہے۔

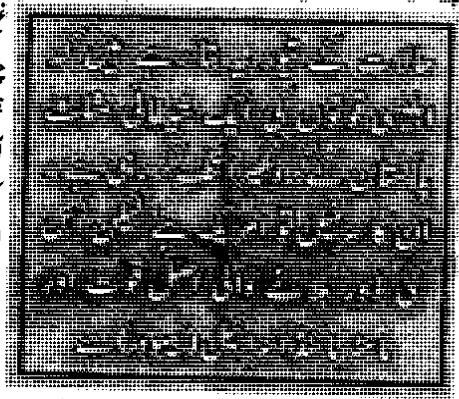

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ افغان جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ ہم مجبور تھے۔ کیونکہ امریکہ کا ٹارگٹ افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی تھا۔ امریکہ بہت بڑا اتحاد بنا کر آیا تھا۔ اس وقت ہمیں دھمکی دی گئی تھی کہ ہمارا ساتھ دو‘ ورنہ پتھر کے زمانہ میں دھکیل دیں گے۔ چنانچہ مشرف نے جو کیا ٹھیک کیا‘ ورنہ افغانستان کے ساتھ ساتھ ہمارا ملک بھی تورا بورا بن جاتا۔ کیونکہ ہمارے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ دنیا کی سپر پاور کا اپنے محدود وسائل اور جنگی اسلحہ کے ساتھ مقابلہ کرتے۔ اس رائے کے حاملین یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اسلام کے عسکری اصول یہ اجازت نہیں دیتے کہ طاقت

سقوط ڈھاکہ خواب غفلت سے بیدار ہونے کا موقع تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم واپس نظریۂ پاکستان کی طرف پلٹتے اور اللہ اور اس کے دین کی طرف رجوع کرتے‘ خود احتسابی کی نظر سے اپنا جائزہ لیتے‘ اصلاح عمل کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ لیکن ہم بیدار ہوئے نہ ہی اپنی روش تبدیل کی

ہے۔ اس سے پہلے کنڈولیزا رائس کا یہ چشم کشا بیان سامنے آیا تھا‘ جب وہ پاکستان اور بھارت کا دورہ کر کے امریکہ واپس گئی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا ''پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ امریکہ اور بھارت مل کر کریں گے''۔ یہ ہے ہماری آزادی!

ایک طرف دشمنوں کے پے در پے گھناؤنے بیانات اور سازشیں ہیں اور دوسری جانب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان قوتوں کی چاپلوسی کرنے اور ان کی

امریکہ کی مرضی ٹھونسی جا رہی ہے اور ہمارے سیاسی نظام کی پشت پر بھی امریکہ سوار ہے۔ دراصل یہ اہلِ پاکستان کو اللہ کی طرف سے سزا ہے کہ ہمیں حقیقی آزادی سے محروم کیا جا چکا ہے۔ ہمارے پاس کوئی مینڈیٹ اور اختیار نہیں ہے۔ ہمارا کوئی بھی فیصلہ جو امریکہ چاہتا ہے ''اوپر'' ہی ہو جاتا ہے۔ ہم آزاد شہریوں کو کوئی حق حاصل نہیں کہ حکومت سے پوچھ سکیں کہ قوم کے ساتھ جو واردات ہو رہی ہے، کیوں ہو رہی ہے۔ ہماری اسمبلی کو

کا اس قدر عدم توازن ہو' پھر بھی آپ دشمن کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں۔

بعض نام نہاد سکالرز امریکہ سے تعاون کے لیے صلح حدیبیہ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صلح سے پتہ چلتا ہے کہ مصلحت کے تحت کبھی دب کر بھی صلح کر لینی چاہیے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس بارے میں صلح حدیبیہ کا حوالہ دینا تو صریحاً غلط ہے کیونکہ صلح حدیبیہ جب ہو رہی تھی تب مسلمان دبے ہوئے نہیں تھے' بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اگر آپ سیرت کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ صلح کا پیغام لے کر تو کفار آئے تھے۔ چودہ سو مسلمان جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نکلے تھے' انہوں نے احرام باندھا ہوا تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی' اگرچہ نیاموں کے اندر تھی۔ انہوں نے نبیؐ کے ہاتھ پر بیعت (رضوان) کی۔ انہوں نے عہد کیا کہ ہم یہاں سے تب تک نہیں ہلیں گے جب تک کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ نہ لے لیں' چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں۔ اسی لیے اس بیعت کو بیعت علی الموت بھی کہا جاتا ہے۔ جب کفار کو اس کا علم ہوا تو انہیں اپنی موت نظر آنے لگی۔ اور وہ صلح کا پیغام لے کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اگرچہ صلح کی بعض شقیں ایسی تھیں کہ جو بظاہر ان کی Favour میں تھیں مگر نبیؐ نے اپنی فراست کی بنیاد پر انہیں تسلیم کر لیا' جس سے مسلمانوں میں ایک خلجان بھی پیدا ہوا اور ایک بے چینی بھی مگر یہ بات طے شدہ ہے اور قرآن حکیم کی سورۃ الفتح سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ صلح دب کر نہیں ہوئی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے برعکس یہاں صورتِ حال کیا تھی؟ ہم تو مغلوب ہیں' ہم صلح کیا کر رہے' ہم تو امریکہ کا ہر مطالبہ ماننے کے لئے تیار ہو گئے۔ بھلا یہ کون سی صلح ہے؟ ہمارے مغلوبانہ پالیسیوں کی صلح حدیبیہ سے کیا نسبت؟

جہاں تک طاقت کے عدم توازن کی صورت میں مقابلہ نہ کرنے والی بات کا تعلق ہے تو یقیناً یہ بات درست ہے' لیکن طاقت کے توازن کو تب دیکھا جائے گا' جب مسلمانوں نے خود کسی دشمن ملک پر حملہ کرنا ہو یا کفار کے اوپر چڑھائی کرنی ہو۔ لیکن یہاں صورت یہ نہیں تھی۔ آپ کسی ملک پر حملہ نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک طاقت آپ کو دھمکیاں دے رہی تھی' آپ نے تو کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی' خطرہ تو ان کی طرف سے تھا۔ سیرت میں اس صورت حال کی مطابقت غزوۂ احزاب سے ہے۔ اس غزوہ میں عرب کی تمام طاقتیں مجتمع ہو گئیں اور انہوں نے مدینہ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ دنیاوی حساب کتاب کے اعتبار سے مسلمانوں کا خاتمہ اور تباہی یقینی تھی۔ جیسے ہمارے ہاں طاقت کا کوئی توازن نہیں تھا' وہاں بھی یہی صورتحال تھی۔ اس وقت مدینہ میں جو لوگ لڑنے کے قابل تھے' ان کی تعداد بمشکل تین ہزار تھی۔ ان میں بھی خاصی تعداد منافقین کی تھی' جن کے بارے میں اندیشہ تھا کہ عین وقت پر آستین کے سانپ ثابت ہوں گے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کی تعداد بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک تھی۔ کثرتِ تعداد کے علاوہ' ان کا اسلحہ' ان کی جنگی تیاریاں اور جنگی وسائل بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ تھے۔

اس انتہائی مشکل صورتحال میں منافقین اور مومنین کا جو کردار اور طرزِ عمل سامنے آیا' قرآن حکیم نے اُس کو واضح کیا ہے۔ اِس حالت میں منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ اُن کی کیفیت یہ تھی جیسے موت کے وقت مرنے والے کی آنکھوں میں دہشت اور خوف ہوتا ہے۔ اُن کی زبان پر وہ الفاظ آ گئے' جو قرآن نے نقل کئے ہیں۔

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا﴾

(الاحزاب:12)

''اور (وہ وقت یاد کرو) جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں روگ ہے کہ جو وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے' سب فریب تھا''۔

منافقین کہنے لگے کہ ہم سے وعدے کئے گئے تھے کہ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی' اور اس وقت کیفیت یہ ہے کہ ہم رفع حاجت کے لیے باہر نہیں نکل سکتے۔

اِس کے برعکس مومنین صادقین نے عظمت کردار کا مظاہرہ کیا۔ سچے اہل ایمان جانتے تھے کہ اللہ نے مسلمانوں کو پیشگی انتباہ کر دیا تھا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور امتحانات آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا﴾ (الاحزاب:22)

''اور جب مومنین نے لشکر دیکھے' بولے یہ وہی ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ اور بالکل سچ کہا تھا اللہ اور اُس کے رسول نے اور اُن کے ایمان اور اطاعت میں اور اضافہ ہو گیا''۔

اس غزوے کے مشکل حالات سخت آزمائش تھے۔ اس آزمائش سے واضح ہو گیا کہ کون سچا مومن ہے جو اللہ پر توکل کرنے والا اور آزمائش کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والا ہے' اور کون ہے جو محض ایمان کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان کے لاکھ دعوے کرے' لیکن اس کا توکل اللہ پر نہ ہو' بلکہ تمام تر بھروسہ محض ظاہری اسباب پر ہو تو وہ حقیقی ایمان سے محروم ہے' خواہ وہ کتنا بڑا مسلمان بنا پھرتا ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا یہی وہ مقام ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ کو اُسوۂ حسنہ کے طور پر اجاگر فرمایا گیا کہ سچے اہلِ ایمان کے لیے رول ماڈل نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ کا طرزِ عمل ہے۔ غزوۂ احزاب میں دشمن کے بے پناہ دباؤ کے باوجود آپؐ نے اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا بلکہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے پوری پامردی کے ساتھ دشمن کی افواج کے سامنے ڈٹ جانے کا سبق امت کو سکھایا۔

غزوۂ احزاب کے آئینے میں ہم اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے کون سی روش اختیار کی' منافقین کی یا مومنین صادق کی۔ ذرا سوچیے' امریکی دھمکیوں کے بعد ہمیں بھی اپنی موت نظر آ رہی تھی' تباہی یقینی دکھائی دیتی تھی' تورا بورا ہونے کا خطرہ تھا۔ ہم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا' کہ دشمن نے جو بھی مطالبہ کیا' ہم نے اُسے مان لیا' ہم نے کہا سر آنکھوں پر۔ جنرل ٹومی فرینکس نے اپنی کتاب میں اس بات کا اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم پر الزام دیا ہے کہ جنرل مشرف کے سامنے امریکہ نے جتنے مطالبے رکھے' خیال تھا کہ ان میں سے کچھ تو مان جائیں گے اور کچھ تسلیم نہیں کریں گے لیکن انہوں نے سب کے سب مطالبے مان لئے۔

صدر محترم نے امریکی مطالبات کو ماننے میں دیر نہیں لگائی۔ طالبان کے خلاف یوٹرن لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ طالبان حکومت کوئی عام حکومت نہیں تھی۔ وہ ایسی نظریاتی حکومت تھی جو ایک ارب (باقی صفحہ 81 پر)

طالبان کی اسلامی حکومت کے خلاف امریکہ کی حمایت اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی جسارت تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی فاسق کو تقویت دینے کے لئے اس کے ساتھ چلتا ہے' اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے' اور اس کا عرش کپکپا اٹھتا ہے۔''

یہ 1947ء والا پاکستان نہیں ہے

جس جذبے نے پاکستان بنایا تھا، آج وہ عنقا ہے۔ بزدلی منافقت، خود غرضی اور ہوس کہیں پاکستان کو گنوا نہ دیں

عابد اللہ جان

باوردی صدر اس بات پر بہت خوش تھے کہ انہیں امریکی یہودی کانگریس (A.J.C) کے عشائیے میں امریکی سینیٹر ٹام لینٹوس (Tom Lantos) نے صاحب بصیرت، مذہبی اعتدال پسند شخصیت قرار دیا تھا۔ سادہ لوح جنرل اس بات سے قطعی غافل ہیں کہ یہودیوں کے عشائیے میں انہیں جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ ان کے کتنے مفاد میں ہے۔

تمام موقع شناس مسلمان امریکی سیاست میں یہودی اثر ونفوذ سے حد درجہ مرعوب ہیں اور یہودیوں کے ہاں پذیرائی حاصل کرنے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ حسین حقانی اس کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ جنرل پرویز مشرف سے مزید اقدامات کے متمنی ہیں۔ حسین حقانی صدر پرویز مشرف سے کہہ رہے تھے، A.J.C کے عشائیے میں آپ کی شرکت کرنا محض امریکی خوشنودی اور امداد حاصل کرنے کے لئے ہے یا فی الواقع آپ مثبت تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔

یوں تو پاکستان کی فوجی اور سیاسی قیادت کے مقاصد کئی باتوں میں باہم مخالف ہیں لیکن دونوں قیادتیں اسرائیل کے حوالے سے نرم گوشہ رکھنے میں متفق نظر آتی ہیں۔ دونوں قیادتیں اسرائیل کو ایک حقیقت سمجھتی ہیں، ایسی حقیقت جو نظر آنے سے زیادہ بھاری بھرکم ہے۔ دونوں اس بات کے منتظر ہیں کہ عرب ریاستیں اسرائیل کو جوں ہی تسلیم کریں گی وہ بھی دنیا سے اپنا پرامن جمہوری چہرہ منوانے کیلئے اسرائیل کو تسلیم کرلیں گے۔

حسین حقانی نے اپنے مقالے مطبوعہ دی نیشن 23 جون 2003ء میں لکھا ہے کہ پاکستان میں یہودیوں کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپیل کی کہ پرتشدد تصورات بشمول یہودیوں کے خلاف نفرت کا اب خاتمہ ہونا چاہیے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، اس بات کی مخالف لابی اگرچہ اقلیت میں ہے لیکن وہ بہت طاقت ور ہے۔ پرویز مشرف کی طرح اس مضبوط لابی کا یہ نظریہ ہے کہ قرآن حکیم کو فیصلہ کن اور آخری منشور کے طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔

کچھ عرصہ پہلے شائع ہونے والی اسرائیل کی رپورٹ 'پردے کے پیچھے' (Beyond the Veil) قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان کے اسرائیل سے سرکاری خفیہ رابطوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ یہ اگرچہ اسرائیل کی مرتب کردہ ہے اور اس پر پوری طرح بھروسا نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے مندرجات پڑھ کر آدمی بھونچکا رہ جاتا ہے کہ ذاتی مفادات انسان کو کس قدر دروغ گو بنا دیتے ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے سول اور فوجی متعدد رہنماؤں نے اسرائیل سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ ان میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان، فوجی آمر ایوب خان،

پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، اس بات کی مخالف لابی اگرچہ اقلیت میں ہے لیکن وہ بہت طاقت ور ہے۔ پرویز مشرف کی طرح اس مضبوط لابی کا یہ نظریہ ہے کہ قرآن حکیم کو فیصلہ کن اور آخری منشور کے طور پر تسلیم نہ کیا جائے

یحییٰ خان اور ضیاء الحق اور اسی طرح سول رہنما ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے کسی نہ کسی موقع پر ہمدردانہ بیانات دیئے ہیں۔ صرف ان رہنماؤں پر کیا موقوف ہے واشنگٹن، لندن، نیویارک اور اقوام متحدہ میں پاکستان کی اہم شخصیات اپنے ہم منصب اسرائیلی قائدین سے متعدد بار ملاقاتیں کر چکی ہیں۔ صرف یورپ اور مریکہ میں ہی نہیں رنگون، کھٹمنڈو، ٹوکیو، افریقہ میں لاگوس، مشرق وسطیٰ میں انقرہ اور تہران بھی ایسی ملاقاتوں سے پررونق ہوئے ہیں۔

یہ وہ رہنما ہیں جو اپنے ''کاز'' کا جس کا وہ علانیہ اظہار کرتے ہیں' عملاً اُس کا خود ہی انکار کرتے ہیں۔ عوامی بیانات اور ملک کی خارجہ حکمت عملی ایک دوسرے کی چغلی کرتی ہیں۔ یہ اپنی قوم سے منافقت اور دھوکا دہی پر مبنی خارجہ حکمت عملی ہے۔ سچائی اور انصاف کو کبھی چھپنے یا پس پردہ رہنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی' مگر پاکستان کی قیادت اپنے عوامی بیانات سے مخلص نہیں رہی ہے۔ البتہ موجودہ جرنیلی قیادت ذرا پہلوں کی نسبت بے باق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے پیش رو اگر اسلام مخالف قوتوں سے پس پردہ ڈیل کرتے رہے ہیں، میں اُسی کام کو علانیہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ عیارمی سے سودا کرتے تھے۔ میں کھلی منڈی میں پاکستان برائے فروخت کا اعلان کرتا ہوں۔

عین ممکن ہے کہ ہمارے معترضین یہ نقطہ اٹھائیں کہ آئرش قیادت اپنی مخالف برطانوی سرکار سے اگر بات چیت کرے تو اُسے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آئرش قیادت نے اپنے عوام سے غداری کی ہے' اسی طرح پاکستان کی قیادت کا اسرائیل کی حکومت سے ملاقات کرنا بھی اپنے عوام سے غداری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اِن دونوں مثالوں میں بعد المشرقین ہے۔ آئرش قیادت اپنے عوام کی آزادی کیلئے کسی فارمولے پر پہنچنے کے لئے ایسا کرتی ہے جبکہ پاکستان کے قائدین کسی پرامن حل پر پہنچنے کے لئے یہ ملاقاتیں نہیں کرتے، وہ امریکہ میں یہودی لابی کے منظور نظر بننے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

موجودہ قیادت کی اسلام مخالف قوتوں سے علانیہ ملاقاتوں کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ صلیبی جنگ کا بگل بج چکا ہے۔ مسلمانوں کے قائدین کے سامنے صرف ایک اختیار رکھا گیا ہے، وہ اپنے آپ کو اور اپنے دساتیر کو واضح طور پر تبدیل کر کے سیکولر بنالیں۔ یہی بات عراق کی قیادت کو بھی سمجھائی گئی ہے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ وہ قرآن کو قوانین کا واحد سرچشمہ قرار دینے پر اصرار چھوڑ دیں۔ نیویارک ٹائمز کے ایڈیٹر کے

لیے افغانستان کے آئین میں قرآن کا حوالہ بے حد پریشانی کا باعث بنا تھا۔ عالمی فاشسٹ قیادت موجودہ دور میں درپردہ دوستی کو اہمیت نہیں دیتی ہے۔ اب انہیں ایسے قائدین کی ضرورت ہے جو ان سے دوستی کا کھلم کھلا اظہار کرنے والے ہوں۔ عالمی قیادت کی اس ضرورت کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر باوردی صدر کا یہودیوں کے عشائیے میں پرزور استقبال ہونے کا عقدہ کھل جاتا ہے۔

پُرمسرت صدر کی سادہ لوحی ملاحظہ فرمائیں۔ جس ملک میں انہیں صاحب بصیرت مذہبی اعتدال پسند کہا جا رہا ہے وہاں کا ایک موقر اخبار ٹھیک ایک ہفتے بعد انہیں ایک دروغ گو شخصیت ثابت کر دکھاتا ہے۔

پس پردہ ملاقاتوں کے دور میں بجا طور پر پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی تابع فرمان خارجہ پالیسی کے بلاشرکت غیرے خالق قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اسرائیلی اسٹڈی 'پردے کے پیچھے' میں کہا گیا ہے کہ وہ شخص جو اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں اور عرب دُنیا میں فلسطین اور عرب مسائل کا پُرزور ترجمان تھا وہ اپنے مطالبات میں کچھ زیادہ دیانت دار نہیں نہیں کرتے، لیکن جب تک آپ اپنے خیالات دوسروں پر بزور نافذ نہیں کرتے اُس وقت تک حالات سازگار قرار دیئے جاتے ہیں۔ کوئی اپنی روایات پر خود چلنا چاہے تو اس میں وہ آزاد سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی قلم رو میں پہلے بھی یہود اور نصاریٰ رہتے تھے مگر برسراقتدار آنے کے بعد یہودی ارض فلسطین کو صرف ایک نسل کے لئے مخصوص کرنے اور اُسی نسل کی روایات کو بزور منوانے پر بضد ہیں۔

یہودیوں کی نسل پرستی سے ناآشنا باوردی صدر بس امریکہ میں اپنے استقبال میں تالیاں بجاتے ہاتھ ہی دیکھتے رہے انہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ یہودی اتنے متشدد ہیں کہ وہ اپنے مذہب میں غیر مذہب اور غیر قوم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ کتاب ''عرب اور یہود، ارض موعود میں زخم خوردہ روحیں'' کے مندجات سے بھی ناواقف ہیں۔ مصنف لکھتا ہے:

''غیر یہودی اقوام اختیارات اور شراکت اختیارات سے کلی طور پر بے دخل ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل نظریاتی طور پر یہودی ریاست ہے جسے صرف یہودی طرز زندگی کی آئینہ دار ہونا ہے جو بالآخر کامل یہودی طاقت اور خود انحصاری پر منتج ہوگی۔ اسرائیل وہاں کی عرب آبادی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس بے اعتنائی میں اضافے کے دو اور اسباب بھی ہیں ایک دفاعی اور امن و امان برقرار رکھنے کی صلاحیت کا فقدان اور دوسرا عربوں میں ناخواندگی، عسرت اور ان میں مہم جوئی کے فقدان نے بھی انہیں اسرائیل کے زیر دست کیا ہوا ہے۔ مزید برآں 1948ء میں عربوں کی شکست نے بھی انہیں کم تر حیثیت دے رکھی ہے، اس جنگ کے نتیجے میں وہاں کا آسودہ حال تعلیم یافتہ طبقہ نقل مکانی کر گیا اور جو وہاں آبادی رہ گئی ہے وہ وہمی اور پژمردہ افراد پر مشتمل ہے۔''

یہ درست ہے کہ ظفر اللہ خان کو بطور وزیر خارجہ گورنر جنرل محمد علی جناح نے ہی منتخب کیا تھا لیکن حیرت ہے کہ صیہونی ہاتھوں میں یرغمال وزیر خارجہ کے ہوتے ہوئے 1947ء میں پاکستان کے گورنر جنرل نے خبردار کرتے ہوئے کہا تھا:

''فلسطین کی تقسیم لامتناہی تنازع کو جنم دے گی۔ پوری مسلم اُمہ اس فیصلے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی اور ہم اس قسم کے اقدامات کی کسی سطح پر حمایت نہیں کر سکتے۔ اقوام متحدہ میں بھی کہا گیا کہ مقدس سرزمین کو ظلم و استبداد کے پنجوں میں جکڑا جا رہا ہے۔''

یہ بیانات اپنی جگہ لیکن یہودی لابی کے اسیر فیروز خان نے فیاضی سے یہ بیان دیا کہ اسرائیل قائم رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ 1952ء میں ظفر اللہ خان نے اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کے جسم کا ایک عضو قرار دیا۔

بالفرض ہمارے وزراء خارجہ کا موقف معروضی حالات میں درست سمجھ لیا جائے تو پھر بھی برصغیر کی تقسیم کی طرح فلسطین میں بھی فلسطینیوں کے رہنے کے حق کو تسلیم کر لینے پر اصرار کیوں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر یہ لوگ یہودی اسیر نہ سمجھے جائیں تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے اقوام متحدہ میں مظلوم فلسطینیوں کے حق میں یکسر مختلف موقف اختیار کیا، اس موقف کے برخلاف جو وہ اپنے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے عوامی بیانات پر ڈٹ جاتے اور یہودی دوستی میں شیر و شکر نہ ہوتے تو فلسطین کا پرامن حل ہو چکا ہوتا۔

جہاں تک مذکورہ بالا شخصیات کے پس منظر کا تعلق ہے اور جس نے انہیں یہ دورخی اپنانے پر مجبور کیا تو وہ کچھ یوں ہے۔ فیروز خان نون کا تعلق جاگیردار طبقے سے تھا برطانوی نوآبادیات جن ستونوں پر قائم تھی ان کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ انہوں نے برطانوی ہندوستان میں ہائی کمشنر کے طور پر فرائض انجام دیے (1936ء تا 1941ء)۔ وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل (1941ء۔ 1945ء) کے رکن کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔

آسٹریائی یہودی بیوی سے وفاداری کے لیے تو یہ گنجائش ہے کہ اہل کتاب کی باعزت عورتوں سے نکاح کرنا اسلام میں جائز ہے لیکن برطانوی نوآبادیات کے استحکام کے لیے ان کی ان تھک خدمات کو کیا کہیے گا! لندن میں ہائی کمشنری (1936ء تا 1941ء) کے دوران انہیں لارڈ مونٹی نے عرب ریاست میں یہودی ریاست کے قیام کا منصوبہ سونپا تھا۔ انہوں نے بڑی محنت سے یہودی ریاست کے قیام کا منصوبہ چرچل کو بذریعہ امیری (Amery) پیش کیا، جس کی خوبی یہ تھی کہ اس منصوبے میں برطانوی ساکھ کو مجروح ہونے سے ہوشیاری سے بچا لیا گیا تھا۔

ظفر اللہ خان کا تعلق برطانوی سامراج کے ایجاد کردہ احمدی غیر مسلم طبقے سے تھا۔ اپنے خود ساختہ فرقے کے لیے برطانوی سامراج سے مراعات لینے کے علاوہ انہوں نے 1945ء میں دولت مشترکہ کے اجلاس میں برطانوی ہند کی طرف سے نمائندگی کی، وہاں وہ یہودی ایجنسی چائم وائزمین کے سربراہ سے بھی ملے جہاں ان کے فلسطین میں چھ روزہ دورے کو حتمی شکل دی گئی تھی۔ وائزمین بعد میں اسرائیل کے صدر بنے۔ تل ابیب یونیورسٹی کی رپورٹ کے مطابق وائزمین نے یروشلم میں کہا کہ ظفر اللہ خان کو قیام کے دوران میں مکمل اتفاق میں لیا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ ظفر اللہ خان نے اپنی

لندن میں فیروز خان نون کو ان کی کمشنری کے دوران لارڈ مونٹی نے عرب ریاست میں یہودی ریاست کے قیام کا منصوبہ سونپا تھا۔ انہوں نے بڑی محنت سے یہودی ریاست کے قیام کا منصوبہ چرچل کو پیش کیا

تھا۔ 1952ء میں قاہرہ میں پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے عربوں پر واضح کیا تھا کہ وہ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ میں ایک اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیں۔

عربوں کی سرزمین پر اسرائیل کے مطالبے کسی بھی قابض طاقت کی طرح نہیں ہیں۔ اسرائیل فلسطین سے مقامی آبادی کو مکمل طور پر ملک بدر کرنے سے کم پر راضی نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ہندوستانی آبادکار امریکیوں سے کہیں کہ وہ اپنے ملک سے بے دخل ہو جائیں۔ اسرائیل کسی بھی سیاسی تصفیے کی بات پر آمادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کے اٹھاون سالہ قبضے کے دوران میں وہاں کی مقامی آبادی اپنے مقبوضہ ملک میں غلاموں کی طرح نہیں رہ سکتی بلکہ دنیا بھر میں دربدر پھرنے پر مجبور ہے۔

دیکھیے مہذب طریقہ کیا ہے۔ قدیم دور میں برطانیہ کی آبادی ہند آریائی اور نارمن باشندوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی لیکن اب کہیں سو فیصد ولیش ہیں، کہیں پچاس فیصد نارمن اور پچاس فیصد سیکسن، اور نہایت پُرامن طریقے سے رہ رہے ہیں۔ برطانیہ میں نسلی تفاخر بھی پایا جاتا ہے۔ سکاش، انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں اور سکاش سے باہر شادی بھی

رپورٹ میں لکھا کہ فلسطین کا حل ان کے تصورات سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے' تاہم اُمید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں اس مسئلے کا منصفانہ اور مساوی حل تلاش کر لیا جائے گا۔ البتہ اس بات کی انہوں نے وضاحت نہیں کی کہ ان کے ذہن میں مسئلے کی کیا پیچیدگیاں اور منصفانہ مساوی حل کی کیا صورت تھی۔

29 نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کی، اس کے ساتھ ہی اوریل ہیڈ نے جو لندن میں اسرائیلی انٹیلی جینس کے لیے بھی کام کرتے تھے' لکھا کہ اس کے بعد ظفر اللہ خان کے موقف میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ اس تبدیلی کا اظہار پہلی بار دمشق میں ہوا' جہاں ظفر اللہ نے کہا کہ تقسیم فلسطین ہی مسئلے کا واحد حل ہے حالانکہ سرکاری سطح پر وہ پہلے اسی حل کے پرزور مخالف سمجھے جاتے تھے۔ جسے اوریل ہیڈ تبدیلی کہہ رہے ہیں وہ صحیح معنی میں دور خاپن ہے۔

امریکی یہودی لابی کا دباؤ پاکستان کی قیادت پر ہر سطح پر دیکھا جاسکتا ہے۔ لیاقت علی خان سے امریکی صنعت کاروں نے پرزور مطالبہ کیا کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرلے تو امداد کی فراہمی میں ایک بڑی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں لیاقت علی خان صرف اتنا کہہ سکے کہ ہماری روح خارجہ حکمت عملی پر چلنا پڑا۔ پاکستان کے دورخے اپنے ملک میں اب تک نہیں پہچانے گئے ہیں لیکن باہر کے لوگ ان سے بخوبی آشنا ہیں۔ ایم ایس کومے (M.S.Comay) لکھتے ہیں: پاکستانی ہائی کمشنر مرزا عثمان علی بیگ شرکائے مجلس کی موجودگی میں میرے پاس آئے، مجھ سے مصافحہ کیا، ساتھ ہی ہماری مختصر فوج سے مصریوں کی درگت بننے کی داد دی، انہیں اس بات پر ملال تھا کہ برطانیہ اور فرانس کی مداخلت سے ہماری پیش قدمی رک گئی تھی ورنہ ان کا کہنا تھا، اسرائیلی فوج قاہرہ تک پہنچ جاتی۔

23 دسمبر 1956ء کی جنگ اسرائیل کے بعد، جنگ بندی کے معاہدے کے ایک ہفتہ بعد کینیڈا میں مذکورہ بالا ملاقات ہوئی تھی۔ اس پر ڈاکٹر شاہد قریشی (بیورو چیف فرنٹیئر پوسٹ لندن ایڈیشن) نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بیگ اتنی بڑی بات اپنے طور پر نہیں کرسکتا۔ اس کی پشت پر صیہونی، قادیانی چھوٹا مگر طاقتور طبقہ رہا ہوگا۔

یہودیوں کی نظریاتی ریاست اسرائیل کو پوری دُنیا کی حمایت حاصل ہے اور جنرل پرویز مشرف اسلامی دُنیا کی حمایت سے محروم ہونے پر پوری طرح مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ 12 جنوری 2002ء کو انہوں نے پوری قوم کو پیغام دیا:

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مشرف، افسران بالا، سویلین بکاؤ مال جو اپنے آپ کو اعتدال پسند کہتے ہیں سب صیہونیت کے شدید دباؤ میں مبتلا ہیں۔ وہ زمینی حقائق سے غافل اسرائیل کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہیں

برائے فروخت نہیں ہے۔ عبا عبان (Abba Eban) (14 جنوری 1953ء) کو ظفر اللہ خان نے پاکستان کے اسرائیل کو تسلیم کر لینے میں عذر پیش کیا کہ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی حکومت پر مسلم انتہاپسندوں کا شدید دباؤ ہے اور خود ان کی (ظفر اللہ خان) اعتدال پسندی کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ پاکستان میں اعتدال پسندی پچھلے سالوں میں ایک واضح مفہوم کی صورت اختیار کرگئی ہے اور جب جنرل پرویز مشرف اپنے آپ کو اعتدال پسند کہتے ہیں تو وہ اسی سیاسی سناریو میں کہتے ہیں۔ محکمہ امور خارجہ سے جو شخصیات منسلک رہی ہیں وہ امریکہ، برطانیہ یا کینیڈا کی سند یافتہ تھیں۔ قوم اور نظریہ ان کی نظر میں ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اسلام کا نعرہ اس مذاق کا سب سے بھونڈا ترین ہتھیار رہا ہے۔ حسین شہید سہروردی اور صدر سکندر مرزا بھی فیروز خان نون کے ہم خیال تھے۔ اپنے سیاسی مستقبل کا آغاز سکندر مرزا نے سرحد میں برطانوی ہند کے لئے بطور پولیٹیکل ایجنٹ فرائض کی بجاآوری سے کیا تھا۔ یہودی لابی پاکستان میں اتنی موثر رہی ہے کہ صدر ایوب خان کو بھی فیروز خان نون کی پاکستان مسلم دُنیا کا ذمہ دار نہیں ہے۔ کیمپ ڈیوڈ میں (2003ء) میں انہیں قائل کیا گیا کہ اسرائیل کو تسلیم کر لینے سے کوئی آسمان سر پر نہیں گرے گا، یہ بھی کوئی تک کی بات ہے کہ ہم یورپ سے بڑھ کر کیتھولک اور فلسطینیوں سے بڑھ کر فلسطینی بن جائیں۔

جنرل مشرف کو عرب ممالک کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بیانات تو پہنچائے گئے ہیں لیکن ان کے خیر اندیش انہیں یہ نہیں بتا پائے کہ عرب لیگ نے بیروت میں یہ قرارداد منظور کی ہے کہ اسرائیل کا تسلیم کرنا اس بات سے مشروط ہے کہ اسرائیل 1967ء کے بعد والے مقبوضات سے مکمل انخلاء کرے۔

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مشرف، افسران بالا، سویلین بکاؤ مال جو اپنے آپ کو اعتدال پسند کہتے ہیں سب صیہونیت کے شدید دباؤ میں مبتلا ہیں۔ وہ زمینی حقائق سے غافل اسرائیل کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہیں۔ ہم مشرف اور ان کے رفقاء کے سامنے چند حقائق رکھتے ہیں۔

1- اسرائیل کی اصل بنیاد نسل پرستی پر ہے اور اسی نظریے پر اسرائیل قائم رہ سکتا ہے۔ ہم یہ بات یہود دشمنی کی وجہ سے نہیں کر رہے ہیں بلکہ اسرائیلی اہل الرائے کی اکثریت، اسرائیل کے فلسطینی علاقوں پر قبضہ کرنے کی پالیسی کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مستقبل میں اسرائیل ایک یہودی ریاست یا ایک جمہوریت کے طور پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ فلسطینی علاقوں کو اسرائیل میں ضم کر کے اسرائیل میں فلسطینیوں کی کثیر آبادی اسرائیل کے مستقبل پر فیصلہ کن اثرات ڈالے گی۔

2- اسرائیل نہ صرف نسل پرستی کے نظریے پر ایمان رکھتا ہے بلکہ دہشت گردی کی وجہ سے وہ اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے۔ اسرائیلی، فلسطینی مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے دردی سے قتل کرتے ہیں۔ انہوں نے سات لاکھ افراد کو ان کے گھروں سے بے دخل کر کے ان کے مکانوں اور کھیتوں پر قبضہ کیا ہے۔ 'دیر یاسین' میں 254 فلسطینیوں کا بے دریغ قتل عام اس کی بھیانک مثال ہے۔ سابق اسرائیلی وزیراعظم مناچم بیجن کو اس بہیمانہ کارروائی پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔

3- امریکا کے بین الاقوامی ساکھ رکھنے والے اخبار 'دی وال اسٹریٹ جنرل' نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر بکھرے فلسطینیوں کو واپس اپنے وطن لوٹنے کا حق دیا جاتا ہے تو اس سے اسرائیل کی آبادی کا تناسب بری طرح متاثر ہوگا۔ اخبار کے اس خدشے میں یہ تجویز پنہاں ہے کہ ہر ممکن طریقے سے فلسطینیوں کی واپسی کو روکا جائے۔

امریکا کا ضمیر بھی ملاحظہ کریں۔ اس قسم کی تجویز جب آسٹریا کے سیاسی رہنما جارج ہیڈر Jorge Haider نے امیگریشن کے قوانین میں سختی لانے کے متعلق دی تھی تو انہیں امریکہ کے اخبارات میں نسل پرست قرار دیتے ہوئے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

4- جناب صدر! اسرائیل کو تسلیم نہ کر کے آپ کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ مغربی طاقتوں کے ایک ناجائز بچے سے زیادہ اسرائیل کی کوئی حقیقی حیثیت نہیں ہے۔

5- اسرائیل کا تسلیم کرنا ایسا ہے جیسے نازی ازم کو تسلیم کرنا۔

6- صیہونیت ایک سیاسی فلسفہ ہے جو دیگر نسلوں سے نفرت پر ایمان رکھتا ہے۔

7- امریکہ کا ایک تحقیقاتی ادارہ اس کوشش میں ہے کہ حیاتیاتی طور پر یہودیوں اور غیر یہودیوں میں نمایاں فرق کو ثابت کر سکے۔ (باقی صفحہ 41 پر)

استحکامِ پاکستان

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی نگارشات کی روشنی میں

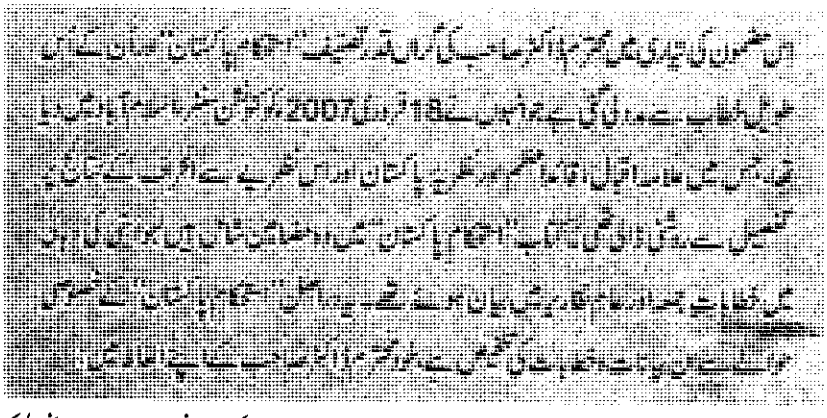

عدم استحکام کے اسباب

راقم کے تجزیے کے مطابق پاکستان کا عدمِ استحکام وہمی وخیالی نہیں، حقیقی وواقعی ہے اور اس کے دلائل اور شواہد ہمارے ماضی اور حال دونوں میں جابجا موجود ہیں۔ آیئے، ذرا اُن حقائق کا جائزہ لیں۔

1۔ سانحۂ مشرقی پاکستان:

سب سے پہلی تلخ حقیقت جو سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ وہ پاکستان جو 1947ء میں عالمِ وجود میں آیا تھا، اب کہاں ہے؟ یاد کیجئے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے پر صرف ملتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں، پورا عالمِ اسلام ہل کر رہ گیا تھا، اور جہاں پوری اُمتِ مسلمہ پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا، وہاں لاکھوں انسان دھاڑیں مار مار کر روئے تھے، یہاں تک کہ حرمین شریفین کی فضا لوگوں کی آہ وبکا اور نالہ و شیون سے گونج اٹھی تھی، اس لیے کہ اُس موقع پر صرف یہی نہیں ہوا تھا کہ مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی تو اتنا عظیم صدمہ نہ ہوتا، بلکہ اِس علیحدگی کے جلو میں اُس بدترین شکست کا کلنک ٹیکہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کی پیشانی پر لگا تھا، جسے تاریخ عالم کی عظیم ترین ہزیمتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثۂ فاجعہ پاکستان کے عدم استحکام کا منہ بولتا ثبوت ہے اور آئندہ کے لیے ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر مناسب ہے کہ اس کی یاد کبھی کبھی تازہ کرلی جائے۔

2۔ سرزمین بے آئین:

قیام پاکستان کے فوراً بعد لیاقت علی خان مرحوم کی ''بنیادی اُصولوں کی کمیٹی'' کی رپورٹ کے رد ہو جانے کے بعد دستور سازی میں جو کئی سال کا وقفہ اور خلا رہا تھا، وہ خدا خدا کر کے 1956ء میں ختم ہوا تھا، لیکن 1956ء کے دستور کو واقعتاً دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ پھر 1962ء کا دستور آیا اور صرف چند سال قائم رہ کر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد 1973ء میں مسٹر بھٹو نے واقعتاً ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ دن رات محنت کر کے اس پارلیمنٹ کا اتفاق رائے حاصل کر لیا تھا جس کی نمائندہ حیثیت غیر متنازعہ تھی، لیکن افسوس کہ اولاً خود انہوں نے اپنے بنائے ہوئے دستور میں پے بہ پے ترمیم کر کے اُس کا حلیہ بگاڑ دیا اور اُس کی غیر متنازعہ حیثیت کو بھی مجروح کر دیا۔ پھر 1973ء کے مارشل لاء نے اُسے اولاً ساڑھے آٹھ سال تک معطل رکھا اور پھر ترامیم کے ذریعے اُس کے پورے نقشے ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ (بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی اپنے اپنے اغراض و مفادات کے تحت ترامیم کر کے 1973ء کے اصل دستور کی شکل ہی مسخ کر دی ہے) تاہم اتنی بات تو ریکارڈ پر موجود ہے اور سب کو معلوم ہے کہ ملک کی متعدد سیاسی جماعتوں اور اہم سیاسی شخصیتوں نے بارہا کہا ہے کہ اگر ایک بار 1973ء کا دستور ختم ہوگیا تو پھر دوبارہ پاکستان کا دستور کبھی نہ بن سکے گا۔

3۔ کنفیڈریشن کا شوشہ:

عدم استحکام کا ایک تیسرا مظہر مسلسل بے دستو اکا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اب ملک کے متعدد اور مسلم سیاسی اہمیت کے حامل رہنما برملا کنفیڈریشن کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایک باضابطہ اتحاد ''سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ'' کے نام سے وجود میں آچکا ہے، اور یہ فرنٹ تو ملک سے باہر بنا ہے اور اس میں شریک زعماء اس وقت خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن عین باب الاسلام یعنی سندھ کے قلب میں بیٹھ کر ایک شخص اس سے بھی آگے بڑھ کر برملا کہہ رہا ہے کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کو توڑ دیا جائے۔'' اور کنفیڈریشن کے نعرے پر طنزیہ تبصرہ کرتا ہے کہ ہمیں کنفیڈریشن ضرور مطلوب ہے، لیکن پاکستان کے اندر نہیں بلکہ اس سے باہر''۔ اور اس سے بھی ایک قدم مزید آگے بڑھا کر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ ''ہم مارشل لاء کی تائید اسی لیے کرتے ہیں کہ اصل میں پاکستان اسی کے ذریعے ٹوٹے گا، اور ہم ایم آر ڈی کی تائید اس لیے نہیں کرتے کہ وہ جمہوریت کی علم بردار ہے اور جمہوریت

پاکستان کے بقا کا ذریعہ بن جائے گی۔''

4۔ بھارت کا استحکام:

غور طلب بات ہے کہ بھارت بھی ہمارے ہی ساتھ آزاد ہوا تھا، لیکن اُس نے جھٹ پٹ دستور بنایا اور اُس کی گاڑی ایمرجنسی کے ایک مختصر سے وقفے کے سوا کبھی اُس دستور کی پٹڑی سے نہیں اتری، حالانکہ وہ اگر ہم سے دس گنا بڑا ہے تو اُس کے مسائل ہم سے پچاس گنا زیادہ پیچیدہ اور گھمبیر ہیں۔ چنانچہ نسلی ولسانی اور تہذیبی وثقافتی تقسیم تو وہاں پاکستان کے مقابلے میں کم از کم دس گنا زیادہ ہے ہی، اس پر مستزاد ہے وہ مذہبی تقسیم جس نے وہاں کے مسائل کو مزید کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ دستوری سطح پر بھارت کی اِس ''پختہ زناری'' کے ساتھ ساتھ ایک نظر ڈالیے اُس کی صنعتی اور عسکری ترقی پر، جس نے اُسے اس علاقے کی چھوٹی سُپر پاور کا درجہ دے دیا ہے۔ الغرض، بھارت کا استحکام بھی پاکستان کے عدمِ استحکام کے ضمن میں ایک تقویتی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

5۔ اصل سبب:

پاکستان کے عدمِ استحکام کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے عالمِ وجود میں آیا تھا، لیکن افسوس کہ اس میں بسنے والوں نے اس کے وجود میں آنے کے فوراً بعد اُس نظریے ہی کو فراموش کر دیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا حصول برصغیر ملتِ اسلامیہ کے قافلۂ ملی کی اصلی اور آخری منزل نہیں، بلکہ صرف پہلا ''پڑاؤ'' تھا، لیکن افسوس کہ اس بدنصیب قافلے کے رہنماؤں کی اکثریت نے خود ہی پہلے پڑاؤ پر پہنچ کر اصل منزل کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ جب خود رہنما ہی اُس پڑاؤ کو اصل منزل قرار دے کر محوِ استراحت ہو گئے تو عوام کا تو کہنا ہی کیا۔

اس اصل اور اساسی سبب کے نتیجے میں جب ذہنی و فکری انتشار، اخلاقی وعملی اختلال اور سیاسی و انتظامی بحران پیدا ہوا تو اولاً کچھ ہوشیار اور چالاک سرکاری ملازمین نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور جب اس کے نتیجے میں انتشار واختلال مزید بڑھ گیا تو آخر کار ملک کے منظم ترین ادارے یعنی فوج نے عوام کی سیاسی اعتبار سے نابالغ اور سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو بدقماش اور آوارہ قرار دے کر ملک وملت کی سرپرستی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سے بھی صورتِ حال میں کوئی بہتری پیدا ہو سکتی تھی نہ ہوئی، لیکن اس کی کوکھ سے مزید پیچیدگیوں اور خرابیوں نے جنم لیا، جن میں سب سے بڑی اور خوفناک پیچیدگی یہ ہے کہ چونکہ پاکستان کی مسلح افواج کی ایک عظیم اکثریت ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے، لہٰذا دوسرے علاقے کے لوگوں میں یہ احساس کچھ از خود اُبھرا اور کچھ ملک وملت کے دشمنوں نے ابھارا کہ ایک علاقے کے لوگ پورے پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ چنانچہ اولاً یہ احساس پوری شدت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوا اور اُس کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا، بعد ازاں یہی احساس مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں خصوصاً سندھ اور بلوچستان میں پیدا ہوا۔ اگر خدانخواستہ اِن ثانوی اثرات و نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جلد از جلد پاکستان میں ایک زوردار تحریک ایسی نہ اُبھری جو ایک ولولۂ تازہ اور عزمِ نو کے ساتھ دوبارہ سرگرمِ سفر کر دے تو اندیشہ ہے کہ کہیں بدخواہوں کی پیشگوئیاں صحیح ثابت نہ ہو جائیں اور دشمنوں کے گھروں میں واقعتاً گھی کے چراغ نہ جلنے لگیں۔ تو آیئے غور کریں کہ پاکستان کے استحکام کی بنیاد کون سی چیز بن سکتی ہے۔

غیر حاضر زمینداری کا نظام دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ دورِ بنواُمیہ میں جو جاگیریں دی گئی تھیں، اسلام کے مجدّدِ اوّل عمر بن عبدالعزیزؒ نے اُن کے سارے وثائق اور دستاویزات منگوا کر انہیں قینچی کے ساتھ کتر کر پھینک دیا تھا اور سب زمینداریاں ختم کر دی تھیں۔ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ دونوں کے نزدیک مزارعت حرامِ مطلق ہے

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بنیاد

ہمارے غور وفکر کا اصل مرکز ومحور یہ سوال ہو گا کہ پاکستان کے استحکام کے لیے حقیقتاً اور واقعتاً ٹھوس بنیاد کون سی ہے، جسے مضبوط کرنے سے پاکستان مستحکم ہو جائے اور اپنے وجود اور سالمیت کے خلاف جملہ داخلی اور خارجی حملوں کے مقابلے میں اپنا موثر دفاع کر سکے۔ یہ سوال ظاہر ہے کہ صرف دینی اور مذہبی نقطۂ نگاہ ہی سے اہم نہیں ہے، بلکہ خالص مادی اور دنیوی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے.....

تو آیئے، سب سے پہلے اِس بات پر غور کریں کہ بالعموم ملکوں کو کن کن جہتوں سے تقویت ملتی ہے اور کن کن عوامل کی بنا پر استحکام حاصل ہوتا ہے اور اِن میں سے کون کون سے عوامل ہمیں پاکستان کے استحکام کے لیے دستیاب ہیں، جنہیں مزید تقویت دے کر ہم پاکستان کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

1۔ تاریخی عامل:

اوّلین عامل کو ''تاریخی عامل'' کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ اگر کوئی ملک عرصۂ دراز سے ایک ہی نام اور ایک ہی سے حدود اربعہ کے ساتھ قائم رہتا ہو تو اُس نام اور اُن حدود کو ایک گونہ تاریخی تقدس حاصل ہو جاتا ہے اور یہ اُس کی تقویت کا موجب اور اُس کے استحکام کا سبب بن جاتا ہے، اور اگر کبھی اس پر بحیثیت مجموعی یا اُس کے کسی علاقے پر جزوی طور پر کوئی دوسرا ملک قبضہ کر لیتا ہے، تب بھی نہ اُس کا نام بدلتا ہے نہ دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ علاقہ اب اُس ملک کا حصہ نہیں رہا، بلکہ قابض ملک کا جز بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر جب سے دنیا کی تاریخ انسان کے علم میں ہے، اُسی وقت سے چین نامی ملک بھی دنیا میں موجود ہے اور اُس کا نام بھی ہمیشہ سے یہی چلا آ رہا ہے اور اُس کی حدود بھی ہمیشہ تقریباً یہی رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تاریخی عامل اور یہ تاریخی تقدس پاکستان کو حاصل نہیں ہے، اور اس نام اور ان حدود کے ساتھ تاریخِ انسانی میں کبھی کوئی ملک موجود نہیں رہا، بلکہ پاکستان کا تو لفظ آج سے پچاس سال قبل تک دنیا کی کسی لُغت میں موجود ہی نہیں تھا..... حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیے ''تاریخی تقدس'' کی قسم کا کوئی عامل موجود نہیں ہے۔ اِس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا وہ قول دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی، جو کچھ عرصہ پہلے پاکستان کے بزرگ صحافی میاں محمد شفیع نے ایک روزنامے کے کالموں میں نقل کیا تھا، یعنی یہ کہ ''پاکستان کے معاملے کو ہندوستان پر قیاس نہ کیا جائے۔ ہندوستان ایک ملک ہے، اس کے حالات کتنے بھی خراب ہو جائیں۔ بہرحال یہ موجود رہے گا، جبکہ پاکستان ایک ''تجربہ'' ہے جو اگر ناکام ہو گیا تو پاکستان کا نام ونشان مٹ جائے گا''۔ میرے نزدیک اگر یہ روایت دُرست ہے تو مولانا مرحوم نے

ملک کی متعدد سیاسی جماعتوں اور اہم سیاسی شخصیتوں نے بار ہا کہا ہے کہ اگر ایک بار 1973ء کا دستور ختم ہو گیا تو پھر دوبارہ پاکستان کا دستور کبھی نہ بن سکے گا

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جس فرق کی نشان دہی کی ہے، وہ اِسی تاریخی عامل پر مبنی ہے۔

2۔ جغرافیائی عامل:

کسی ملک کو تقویت دینے والا دوسرا عامل جغرافیائی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی سرحدیں فطری جغرافیائی حدود کی صورت میں ہوں تو اس سے بھی ملک کو ایک گونہ حفاظت حاصل ہوتی ہے، جو اُس کے استحکام کی موجب اور اُس کے دفاع میں ممد و معاون ہوتی ہے...... موجودہ پاکستان کا حال یہ ہے کہ اسے طبعی اور فطری سرحدوں کا تحفظ کسی درجے میں حاصل ہے بھی تو وہ شمال، جنوب اور مغرب میں ہے، یعنی شمال میں کوہ ہمالیہ اور کوہ قراقرم، جنوب میں سمندر اور مغرب میں کوہ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ۔ جہاں تک اِس کی طویل مشرقی سرحد کا تعلق ہے، جدھر سے اسے سب سے زیادہ تحفظ کی ضرورت ہے، اُدھر کسی فطری و طبعی سرحد کا نشان تک موجود نہیں۔ چنانچہ پنجاب کا میدان اِس طرح کاٹا گیا ہے، جیسے کیک کاٹا جاتا ہے اور اگر خاردار تاروں کی کوئی باڑ موجود نہ ہو تو معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ کہاں ایک ملک ختم ہوگیا اور دوسرا شروع ہو گیا۔ رہا سابق ریاست بہاول پور اور پھر سندھ کے ریگزار اور صحرا کا تعلق تو اُس کے ٹیلے تو خود ہی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ کیا نشان بنیں گے اور کیا حفاظت کریں گے۔ الغرض، جغرافیہ بھی ہمارا پُشت پناہ نہیں ہے، بلکہ ہمارے خلاف ہے۔

3۔ انسانی جذبہ:

ملکوں کو مستحکم کرنے والے تیسرے عامل کو ''انسانی جذبہ'' کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر کسی ملک یا خطۂ ارضی کے رہنے والے انسانوں میں کوئی حقیقی اور واقعی جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ تاریخ کو بھی شکست دے سکتا ہے اور جغرافیے سے بھی لڑ سکتا ہے، اس لیے انسان واقعتاً اشرف المخلوقات ہے اور قدرت نے اس میں بے پناہ قوتیں اور توانائیاں ودیعت کر رکھی ہیں۔ اگر ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو انسانی جذبے کی دو ہی قسمیں نظر آئیں گی۔ ایک قوم پرستانہ جذبہ اور دوسرا مذہبی جذبہ۔ ان میں سے بھی اگرچہ تاریخِ انسانی کے عظیم ترین معجزے تو مذہبی جذبے ہی کے تحت رونما ہوئے ہیں، تاہم کچھ اس بنا پر کہ موجودہ دنیا میں یہ جذبہ بالعموم کمزور ہی نہیں، معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ یہاں ہم پہلے قوم پرستانہ جذبے اور اُس کی اقسام کا جائزہ لیتے ہیں:

(ا)۔ نسلی قوم پرستی:

قوم پرستی (نیشنلزم) کی اقسام کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے یہ حیران کن حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام تر علمی و سائنسی ترقی اور ذہنی و فکری ترفع کے باوجود نسل پرستانہ قومیت کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور اور موثر ہے۔ عہدِ حاضر میں اِس کی دو نمایاں ترین مثالیں جرمن نیشنلزم اور یہودی نسل پرستی کی صورت میں موجود ہیں...... یہ بات جو دنیا میں بالعموم کہی جاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے دو ملک مذہب کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل۔ تو یہ درحقیقت اسرائیل کی نسل پرستی کو چھپانے کا نہایت شاطرانہ انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص مذہب کی بنیاد پر دنیا میں صرف ایک ہی ملک قائم ہُوا ہے اور وہ ہے پاکستان۔ اسرائیل کی اساس مذہب پر نہیں، نسل پرستی پر ہے اور ''صیہونیت'' اصلاً ایک دینی اور مذہبی تحریک نہیں، بلکہ نسل پرستانہ تحریک ہے اور اسرائیل خالص نسل پرستانہ ملک ہے۔

> **پاکستان کا حصول ملتِ اسلامیہ برصغیر کے قافلۂ ملی کی اصلی اور آخری منزل نہیں، بلکہ صرف پہلا ''پڑاؤ'' تھا۔ اُن کی اصل منزل ایک حقیقی اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ افسوس کہ اس بدنصیب قافلے کے رہنماؤں کی اکثریت نے خود ہی پہلے پڑاؤ پر پہنچ کر اصل منزل کو فراموش کر دیا**

بے شک نظری طور پر نسل پرستی کی بنیاد پر بھی ایک نہایت طاقتور جذبہ وجود میں آ سکتا ہے، لیکن (الحمدللہ کہ) پاکستان میں نسلی قومیت کے لیے کوئی اساس موجود نہیں ہے، اس لیے کہ برصغیر پاک و ہند نسلی اعتبار سے غالباً پوری دنیا میں سب سے بڑی کھچڑی (بلکہ حلیم!) کی حیثیت رکھتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اُسی کا ایک خلاصہ اِس وقت پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دراوڑی لوگ بھی موجود ہیں۔ (جیسے بلوچستان کے براہوی قبائل) اور آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اسی طرح منگول بھی ہیں اور سامی النسل بھی۔ بلوچ بھی ہیں اور افغان بھی، حتیٰ کہ شمالی علاقہ جات میں شین بھی ہیں اور بلتی بھی۔ الغرض، یہاں کسی ایک نسل کے لوگ ایسی غالب اکثریت میں موجود نہیں ہیں کہ نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر ملک کے استحکام کی توقع کی جا سکے۔

(ب) لسانی قوم پرستی:

نسلی قوم پرستی کے بعد موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور قومی جذبہ لسانی قوم پرستی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کی بھی دو مثالیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک عرب نیشنلزم اور دوسرے بنگلہ نیشنلزم۔ عرب نیشنلزم جو ماضی قریب میں عالمِ عرب میں ایک زبردست قوّت کی حیثیت سے موجود رہا ہے، اصلاً ایک لسانی نیشنلزم ہے، اس لیے کہ اس کی اساس نہ مذہب پر ہے نہ نسل پر، بلکہ صرف اور صرف زبان پر ہے۔ چنانچہ اس کے حلقہ بگوش اور علم بردار صرف مسلمان ہی نہیں رہے ہیں بلکہ دانشوروں کی سطح پر اس میں زیادہ بھاری پلڑا عیسائیوں کا رہا ہے، حتیٰ کہ یہودی بھی اس میں شریک رہے ہیں۔

اسی طرح پاکستان کے عدمِ استحکام اور دولخت ہونے میں جہاں منفی طور پر اولاً بے مقصدیت اور بے یقینی کے خلاء، اور بعدازاں مارشل لاء کے ردِعمل کو دخل حاصل ہے، وہاں مثبت طور پر جو ہتھیار سب سے زیادہ کارگر اور جو وار سب سے بڑھ کر کاری ثابت ہُوا، وہ بنگلہ نیشنلزم کا تھا جس کی اساس بنگلہ زبان پر قائم کی گئی تھی...... پاکستان کی زندگی کے پہلے پچیس برسوں کے دوران جہاں ایک بے یقینی اور بے مقصدیت کا خلاء مہیب سے مہیب تر ہوتا چلا گیا اور قومی و ملّی سطح پر ضعف بڑھتا چلا گیا، وہاں مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان، بنگلہ ادب، بنگلہ تہذیب اور بنگلہ ثقافت کے حوالے سے بنگلہ نیشنلزم قدم جماتا چلا گیا اور بالآخر اس کے منطقی نتیجے کے طور پر بنگلہ دیش وجود میں آ گیا۔

زبان کا اشتراک لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور اُن میں یگانگت پیدا کرنے میں نسلی اشتراک سے بھی زیادہ موثر اور سریع الاثر ہے، اس لیے کہ نسلی اشتراک کا تعلق اصلاً ماضی اور اُس کی روایات سے ہوتا ہے، جبکہ لسانی اشتراک فی الفور محسوس اور مشہود ہوتا ہے اور اپنی مادری زبان میں انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جس بے تکلفی سے اور جس بھرپور انداز میں کر سکتا ہے، کسی دوسری زبان کو خواہ وہ کتنا بھی سیکھ لے اور اُس میں کتنی بھی مہارت حاصل کرے، اُس میں جذبات کے اظہار کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں لسانی اشتراک اجتماعیات انسانیہ میں ''عصبیت'' پیدا کرنے میں بہت دخیل اور موثر ہے...... اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ پاکستان میں وہ واحد زبان جو اِس کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، صرف اور صرف اُردو ہے، تاہم اِس کا

عمل دخل اتنا بہر حال نہیں ہے کہ اُسے ایک لسانی قومیت کی بنیاد بنایا جا سکے، اور بنگلہ زبان کا مسئلہ ختم ہو جانے کے بعد موجودہ پاکستان میں کم از کم ایک زبان ایسی موجود ہے جو کسی بھی طور سے اردو کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ہماری مراد سندھی زبان سے ہے جس کی اساس پر سندھی نیشنلزم، ہو بہو بنگلہ نیشنلزم کے خطوط پر پروان چڑھ رہا ہے۔ الغرض ہمارے پاس آل پاکستان اساس پر کسی لسانی قومیت سے پیدا شدہ جذبۂ عمل تو درکنار، قومی زبان کے مسئلے کا حل بھی موجود نہیں ہے۔

(ج) وطنی قومیت:

وطن کی اساس پر قومیت کی تشکیل کا تصور زیادہ پرانا نہیں ہے اور اسے عہد جدید کی پیداوار قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ تاہم اِس وقت عالمی سطح پر کم از کم نظری اور دستوری وقانونی اعتبار سے سب سے زیادہ چرچا اور سب سے بڑھ کر رواج اِسی کا ہے۔ منطقی اعتبار سے یہ بات بڑی وزنی نظر آتی ہے کہ اگر کسی ملک کے رہنے والوں میں اپنے وطن سے قلبی محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ اُن کے احساسات وجذبات میں یک رنگی وہم آہنگی اور فکر وعمل میں اتحاد اور یک جہتی کی بنیاد بن جائے گا، اور اس کے زیر اثر رنگ ونسل، عقیدہ و مذہب اور زبان وثقافت کا فرق وامتیاز، جو ملکوں اور قوموں کی کمزوری کا باعث بنتا ہے، اگر بالکل ختم نہیں ہوگا تو کم از کم غیر اہم ضرور ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر میں قومیت کے تعین کے ضمن میں وطن ہی کو تقریباً متفقہ طور پر اساس تسلیم کر لیا گیا ہے..... پاکستان میں کسی قوم پرستانہ جذبے کی پیدائش اور نشوونما کے لیے نہ اشتراکِ نسل کی بنیاد موجود ہے نہ اشتراکِ زبان کی۔ بالفعل ''وطنی قومیت'' صرف ملکی دستور میں شہریت کی اساس اور پاسپورٹوں پر قومیت کے اندراج کے طور پر کام آتی ہے اور اس نے کسی موثر قوم پرستی کی صورت کہیں بھی اختیار نہ کی۔ اس کی تین وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: دوقومی نظریہ:

پاکستان دوقومی نظریے کی اساس پر وجود میں آیا تھا، جو وطنی قومیت کے نظریے کی کامل نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی ملک قائم تو ہو کسی نظریے کی کامل نفی کی اساس پر اور پھر اُس کے استحکام کے لیے وہی نظریہ جڑ بنیاد کا کام دے سکے۔ وطنی قومیت کا نظریہ قیامِ پاکستان کی نفی ہے اور اس کے فروغ سے پاکستان کی جڑیں مزید کھوکھلی تو ہو سکتی ہیں، مضبوط نہیں ہو سکتیں۔

دوسری وجہ: مسلمانوں کی طبعی ساخت:

دوسری نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ باعمل ہو، خواہ بے عمل، بہر حال اُس کے مزاج کی ایک مستقل ساخت ہے، اور اُس کی طبیعت کی ایک خاص افتاد ہے، جس میں زمین کی پرستش اور وطن کے تقدس کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گویا اُس کی شخصیت کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے، اُس میں حُبِ وطن کا مادہ تو ہو سکتا ہے، ''وطن پرستی'' کا امکان نہیں۔ پروفیسر مرزا محمد منور اِس حقیقت کو اِن خوبصورت الفاظ سے تعبیر کیا کرتے تھے کہ ہندو کلچر زمین میں گڑا ہوا اور زمین سے بندھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں زمین ''دھرتی ماتا'' کی حیثیت رکھتی ہے اور ''بھارت کی جے'' کے نعرے سے اُن کے جذبات میں اُبھار اور احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے، جبکہ مسلمان کے دل میں زمین کے مقدس یا دیوتا ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے بلکہ اس کا مزاج ''آفاقی'' ہے اور اُس کے جذبات میں گرمی اور احساسات میں ہلچل ''اللہ اکبر'' کے نعرے سے ہوتی ہے..... اِس معاملے میں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو زیادہ ہی خصوصیت حاصل ہے اور ان کا مزاج کچھ زیادہ ہی آفاقی ہے۔ اس کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہاں کوئی دوسری نسلی یا لسانی عصبیت ایسی موجود نہیں تھی جو انہیں ایک دوسرے سے باندھ سکتی، لہٰذا اپنی شیرازہ بندی کے لیے اُنہیں مذہب کی قوتِ ماسکہ پر دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی انحصار کرنا پڑا اور چونکہ اسلام ایک علاقائی مذہب نہیں، بلکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے، لہٰذا اُن میں ''آفاقیت'' دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سرایت کر گئی۔

تیسری وجہ: تقسیم در تقسیم کا اندیشہ:

اگر زمینی تعلق ہی کو قومی جذبے کی بنیاد بنانے پر زور دیا جائے تو اِس سے اتحاد نہیں، انتشار وجود میں آئے گا، اس لیے کہ یہ نظریہ ایک ایسے حیوان کے مانند ہے جو اپنے دشمن کو خود اپنے ہی دودھ سے پالتا ہے۔ چنانچہ ''وطنی قومیت'' ہی کے بطن سے ''علاقائی قومیتیں'' جنم لیتی ہیں اور اُسی کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پروان چڑھتی ہیں۔ اس ضمن میں بھارت کا معاملہ اگرچہ پاکستان سے قدرے مختلف ہے کہ لفظ بھارت بھی کئی ہزار سال پرانا ہے اور ''مہابھارت'' تصور بھی نہایت قدیم ہے، جبکہ ''پاکستان'' کا تو نام ہی حادثِ محض ہے، اس کے باوجود ''وطنی قومیت'' کے نظریے میں تقسیم در تقسیم کے جو بیج بالقوہ موجود ہوتے ہیں، اُس کا نقشہ بھارت میں بھی نظر آ رہا ہے اور علاقائی قومیتیں اور مقامی عصبیتیں نسلی اور لسانی عوامل سے مزید تقویت پا کر نہایت تیزی اور تندی کے ساتھ سر اُٹھا رہی ہیں اور بھارتی قیادت کو اپنی ملکی وحدت وسالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ومسلسل اور شدید وجاں گسل محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کا معاملہ بے حد نازک اور کمزور ہے، اس لیے کہ پاکستان کا تو تصور بھی پچاس سال سے زیادہ کی تاریخ نہیں رکھتا، اور کم از کم اِس نام کے ساتھ کسی سیاسی وحدت اور اُس کی عظمت وسطوت کی کوئی تاریخ موجود نہیں، لہٰذا اگر اس کی اساس پر وطنی قومیت کا راگ الاپا گیا تو اصل تقویت سندھی، بلوچی، پختون اور پنجابی قومیتوں کو حاصل ہوگی، اس لیے کہ اگر فی الواقع زمینی رشتہ ہی مقدس ہے تو ایک سندھی کے لیے سندھ کے وطن ہونے کا تصور زیادہ قریبی بھی ہے اور قدیمی بھی۔ پھر اِس کو تقویت دینے کے لیے خاص طور پر لسانی عامل موجود ہے جو نہایت قوت کا حامل ہے اور ظاہر ہے کہ پاکستان کا لفظ بھی نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں، اور اس کی حدود بھی ہرگز نہ کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں نہ اُن پر مبنی۔ تو پھر اگر وطن ہی کو 'پوجنا' ہے تو سرزمینِ سندھ کو کیوں نہ پُوجا جائے۔

خالص مذہب کی بنیاد پر دنیا میں صرف ایک ہی ملک قائم ہُوا ہے اور وہ ہے پاکستان۔ اسرائیل کی اساس مذہب پر نہیں، نسل پرستی پر ہے اور ''صیہونیت'' اصلاً ایک دینی اور مذہبی تحریک نہیں، بلکہ نسل پرستانہ تحریک ہے اور اسرائیل خالص نسل پرستانہ ملک ہے

خلاصۂ کلام

اِس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیے نہ ''تاریخی تقدس'' کا عامل موجود ہے، نہ ہی جغرافیائی عوامل اس کے پشت پناہ ہیں۔ پھر کوئی نسلی، لسانی یا وطنی قومیت کا جذبہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو استحکام کے لیے پختہ اساس اور سنگین بنیاد کا کام دے سکے۔ لہٰذا اِس کے استحکام کا کل دارومدار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ وہی ہے جس نے اِسے جنم دیا ہے، یعنی مذہبی جذبہ۔ گویا پاکستان کا معاملہ بالکل ع ''کافر نتوانی شد،

ناچار مسلماں شو‘‘ والا ہے کہ اگر اسے اپنی بقا مطلوب ہے اور یہ کسی دوسری طاقت کا طفیلی یا زیردست بن کر نہیں، بلکہ باوقار اور باعزت اور حقیقتاً آزاد اور خودمختار ہو کر باقی رہنا چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی اور چارۂ کار سرے سے موجود ہی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ یہ اسلام کا دامن تھامے اور اُسی کا سہارا لے۔

نظریۂ پاکستان سے ہمارا انحراف

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد تحریک پاکستان کے زمانے میں نعرہ لگایا جاتا رہا کہ ’’پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ، مگر قیامِ پاکستان کے بعد اسلام کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ اسلام کا سوشل جسٹس کا نظام، اجتماعی، اخوت و بھائی چارہ، مساوات اور آزادی، یہ سب کہاں ہیں؟ پاکستان کی سیاست اور حکومت پر سیکولرازم کا رنگ چھایا ہوا ہے، اور اب تو روشن خیالی کے نام سے نئے ابعاد کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور بات آگے سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ہماری معیشت سُود پر مبنی ہے، حالانکہ اسلام کی رُو سے سُود سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کسی گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چیلنج نہیں آیا، لیکن سود کے گناہ پر اللہ کی طرف سے چیلنج آیا ہے کہ اگر باز نہیں آتے تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ (البقرہ 279) سود کی شناعت اور شدت کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ: ’’سُود کے گناہ کے ستر حصے ہیں، اور سب سے ہلکا گناہ اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔‘‘ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ سود تو اُم الخبائث ہے اور اس کے بطن سے تو خبائث ہی وجود میں آئیں گے، جبکہ قرضِ حسنہ ایک نعمت ہے اور اس کے اندر لذت ہے جسے آج کوئی واقف نہیں۔ قائداعظم نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب آپ کو اسلام کا نظامِ معیشت تیار کرنا ہے۔ مغربی نظامِ معیشت نے انسان کو کوئی خیر اور بھلائی عطا نہیں کی۔

بینکنگ کے نظام کی جو تلخ ترین حقیقت ہے، اُس تک علامہ اقبال کی نگاہِ تیز پہنچ گئی تھی اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ جب تک بینکنگ کا یہ نظام ملیامیٹ نہیں ہو جاتا، تب تک کہاں کی دانش، کہاں کی تہذیب اور کہاں کا دین؟

اسی طرح یہاں پر غیر حاضر زمینداری کا نظام قائم ہے۔ یہ دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ دورِ بنو اُمیہ میں جو جاگیریں دی گئی تھیں، اسلام کے مجدد اوّل عمر بن عبدالعزیزؒ نے اُن کے سارے وثائق اور دستاویزات منگوا کر انہیں قینچی

مسلمان کے دل میں زمین کے مقدس یا دیوتا ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے بلکہ اس کا مزاج ’’آفاقی‘‘ ہے اور اُس کے جذبات میں گرمی اور احساسات میں ہلچل ’’اللہ اکبر‘‘ کے نعرے سے ہوتی ہے

کے ساتھ کتر کر پھینک دیا تھا اور سب زمینداریاں ختم کر دی تھیں۔ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ دونوں کے نزدیک مزارعت حرامِ مطلق ہے۔ اس موضوع پر ہم نے مولانا محمد طاسین صاحب کی کتاب ’’مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام‘‘ شائع کی تھی، جس میں یہ حدیث کم از کم دس طرق سے نقل کی گئی ہے کہ جس کے پاس زمین ہے، وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے، لیکن اُس کی پیداوار میں سے وہ ایک دانہ بھی لینے کا روادار نہیں ہوگا۔ یہ مزارعت تو ظالمانہ نظام ہے۔ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے پاکستان میں نظر دوڑا کر دیکھیے کہ کہاں ہے وہ سوشل جسٹس؟ کہاں ہے خلافتِ راشدہ کے سنہری دور کا عکس؟ کہاں ہے کفالتِ عامہ کا وہ نظام کہ بچہ پیدا ہو تو اُس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا؟ جاگیردار اور زمیندار ہاری کے خون پسینے کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ اُن کے اپنے بچے انگلستان اور امریکا میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جبکہ ہاری کے بچے کو نہ دوا ملتی ہے اور نہ تعلیم کی کوئی سہولت میسر ہے۔

مغرب کے تعلیمی نظام کے ذریعے جو تہذیبی یلغار آئی تھی، وہ ابھی تک تو صرف اونچے طبقات مثلاً سول اور ملٹری بیوروکریسی تک محدود تھی کہ اُن کی نشست و برخاست اور وضع قطع وغیرہ مغربی تھی، مگر اب یہ یلغار وسیع پیمانے پر آ رہی ہے، بلکہ اب تو ہمارے اوپر دوطرفہ یلغار ہو رہی ہے۔ ایک یلغار تو تہذیب کے اعتبار سے مغرب کی طرف سے آ رہی ہے اور اب کھل کر مسلمانوں کی تہذیب کو برباد کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

نظریۂ پاکستان سے انحراف کے نتائج

یہ صورتِ حال درحقیقت اللہ سے کیے ہوئے وعدے سے عظیم انحراف کا نتیجہ ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ اے پروردگار! اگر تُو ہمیں آزادی کی نعمت عطا کر دے تو ہم تیرے دین کا بول بالا کر دیں گے۔ ہمارے قائد نے دس برس تک اسلام کی قوالی گائی، اسلام کے راگ الاپے، لیکن ہم نے ان کے رخصت ہونے کے بعد اس وعدے سے انحراف کیا اور اس انحراف کا نتیجہ ’’نفاق‘‘ کی صورت میں نکلا ہے۔ میں نے نفاق کا لفظ سورۃ التوبہ کی تین آیات 75 تا 77 کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ اِن آیات میں مدینہ کے منافقین کی ایک خاص قسم کا ذکر ہو رہا ہے۔ نفاق وہ چیز ہے جس کے بارے میں سورۃ النساء 145 میں کہا گیا ہے: ’’یقیناً منافق تو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔‘‘

اب میں تین قسم کے نفاق کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ پہلا نفاق ’’نفاقِ باہمی‘‘ ہے۔ ہم ایک قوم ہوتے تھے، لیکن اب قومیتوں میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اب تو عصبیتیں ہی عصبیتیں ہیں۔ صوبائی عصبیتیں ہیں۔ علاقائی عصبیتیں ہیں۔ لسانی عصبیتیں ہیں۔ پھر مذہبی اختلافات ہیں۔ 1971ء میں ملک خداداد پاکستان دولخت ہوا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کی عظیم ترین ہزیمت تھی۔ اندرا گاندھی نے اس موقع پر کہا تھا کہ ’’ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔‘‘ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ ’’ہم نے دوقومی نظریے کو خلیج بنگال کے اندر غرق کر دیا ہے۔‘‘

دوسرا نفاق ’’عملی نفاق‘‘ ہے کہ ہمارے اخلاق کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں وارد حدیث نبوی ﷺ ہے کہ: ’’منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بولے، جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔‘‘ دوسری حدیث میں ایک چوتھی نشانی بھی ہے کہ ’’اگر جھگڑا ہو جائے تو فوراً آپے سے باہر ہو جائے۔‘‘ اب اِن چار علامات کے حوالے سے اپنے معاشرے کا جائزہ لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو جتنا بڑا ہے، اتنا ہی جھوٹا ہے۔ جو جتنا بڑا ہے، اُتنا ہی وعدہ خلاف اور اُتنا ہی بڑا خائن ہے۔ یہاں اربوں اور

پاکستان کے استحکام کے لئے نہ تو ’تاریخی تقدس‘ اور جغرافیائی عوامل موجود ہیں اور نہ ہی کوئی نسلی، لسانی یا وطنی قومیت کا جذبہ اس کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اِس کے استحکام کا کل دارومدار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ وہی ہے، جس نے اِسے جنم دیا یعنی مذہبی جذبہ

کھربوں کے غبن ہوئے ہیں۔ ہمارے اعلیٰ افسروں نے ڈاکو بن کر اِس ملک کو لُوٹا ہے۔ لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ دو آدمی ذرا سا جھگڑا کریں تو فوراً چاقو یا پستول نکل آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کی قدر و قیمت مکھی کی جان سے زیادہ نہیں ہے۔

تیسرا اور سب سے بڑا نفاق ہمارے ہاں دستور کا نفاق ہے۔ کسی ملک میں اہم ترین دستاویز اُس کا دستور ہوتا ہے۔ میں معذرت کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ پاکستان کا دستور منافقت کا پلندا ہے۔ منافق وہی ہوتا ہے نا جو ظاہر میں مسلمان ہو اور باطن میں کافر! اور پاکستان کے دستور کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ''قرار داد مقاصد'' کو ٹھوکر مار کر رد کر دیا گیا کہ اِس آرٹیکل کا دوسرے آرٹیکلز کے اوپر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور بات ختم ہو گئی۔ دفعہ 227 کے بڑے خوبصورت الفاظ ہیں: ''کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن و سنت سے متصادم ہو۔'' لیکن اسے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ اِس کونسل پر کروڑوں روپیہ صَرف ہُوا اور ان لوگوں نے بڑی محنت سے اچھی سے اچھی رپورٹیں تیار کیں، لیکن وہ رپورٹیں مختلف وزارتوں کے دفاتر میں جا کر dump ہو گئیں۔ کوئی وزارتِ مالیات کی الماریوں میں ہیں، کوئی وزارتِ داخلہ کی الماریوں میں ہیں اور آج تک کسی ایک پر بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

ضیاء الحق صاحب نے ''فیڈرل شریعت کورٹ'' بنا کر ایک کارنامہ انجام دیا۔ اصولی اعتبار سے اسلام کے نفاذ کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ ایک اعلیٰ عدالت ہو جسے یہ اختیار ہو کہ اگر وہ کسی شے کو قرآن و سنت کے خلاف پائے تو وہ فتویٰ دے دے کہ یہ خلافِ اسلام ہے، لیکن اِس فیڈرل شریعت کورٹ کو دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں ڈال دی گئیں کہ:

1۔ دستورِ پاکستان اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہے۔ گویا ہم دستور کے معاملے میں اسلام کی کوئی رہنمائی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

2۔ عدلیہ کے طریق کار سے متعلق قوانین، ضابطۂ دیوانی اور ضابطۂ فوجداری اِس کے دائرۂ کار سے خارج ہیں:

3۔ دس سال تک مالی معاملات اِس کے دائرۂ کار سے خارج ہوں گے۔

4۔ عائلی قوانین بھی اس کے دائرۂ اختیار سے خارج کر دیئے گئے۔

دس سال کی مدت گزرنے کے بعد وفاقی شرعی عدالت نے بڑا معرکۃ الآرا فیصلہ کیا کہ بینک انٹرسٹ کو سُود قرار دے دیا، لیکن حکومت کی طرف سے ایک اپیل دائر کروا دی گئی۔ پھر مہلت لی گئی۔ پھر جسٹس تقی عثمانی صاحب کو وہاں سے نکال باہر کیا گیا جو لوہے کا چنا تھا اور دو نئے جج لائے گئے، اور کہا جاتا ہے کہ اُن سے پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ انہوں نے یہی کہنا ہے کہ بینک انٹرسٹ ابھی تک سود ثابت نہیں ہوا، لہٰذا شریعت کورٹ از سرِ نو اس پر غور کرے۔

ملک کا انجام:

اِن سب کا حل کیا ہے؟ اس کا حل ہے ''توبہ''۔ سب سے پہلے انفرادی اور اجتماعی توبہ۔ سب سے پہلے ہمیں دُعا کرنی چاہیے، اور دُعا سب سے پہلے صدر پرویز مشرف صاحب کے لیے۔ وہ ہمیں پسند ہوں یا نہ ہوں، لیکن اس وقت اِس ملک کی تقدیر اُن کے ہاتھ میں ہے۔ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ انہیں جدھر چاہے، پھیر دے۔ تو دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ صدر پرویز مشرف کے دل کو بدل دے۔ اصل بات جو اُن کے سامنے نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ پاکستان کی جڑ اور بنیاد اسلام کے سوا کوئی نہیں، اور اس کی بقا اور اِس کا استحکام سوائے اسلام کے کسی اور شے سے ممکن نہیں۔

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتاب کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع!

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے، مزید برآں 44 آڈیو کیسٹس کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا گیا ہے۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (III,II,I)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں۔

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-5869501